

شعاع

نومبر 2022

ماہنامہ شعاع

MONTHLY SHUAA Regd. No. MC - 52 NOVEMBER 2022

قیمت - 120/- روپے

digest novels lovers group

پہلی شعاع، رضیجیل 8

حمد، الطاف سکھتروی 9

نعت، راسی فدائی 9

بچی کی باتیں، ادارہ 10



سسرال گیندرا چول، شاندار جلد 103



آزمائش، کاجو ریجان 56

آرمان رہ گئے، حیران دین 62

جوشکایت تھی، جوہر بزم 96

پھر لوں ہوا، نلدا ہنجر 120

شارقہ کی مصیبت، زرقا سکندر 161



غزل، ندا فاضلی 208

لظلم، خالد معین 208

غزل، عبدالحمید عدم 209

غزل، اعتبار ساجد 209

صائمہ قریشی کے ملاقات، شاہین رشید 21

جب تجھ سے نانا، آف۔م۔ق 15

دستک، شاہد رشید 219

شعاع کے ساتھ، ادارہ 216



والعصر، امت العزیز شہزاد 33



عسر لیسرا، حسنہ بخسین 165

ہم اور بلیبلین، فرناز کھنک 66

سارا منظر بدل جائے گا، صدف عمر 122

انتباہ: ہمارے شعاع و اجود کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی اعجاز سے شائع کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی کی وی پیسٹل ہمارے نام و نامی لکھیل دور سلسلہ اور قلم کے طور پر کسی بھی اصل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعاع کا نمبر کا شمار ملے ماضی میں۔
ایک دور تھا جب ذرائع ابلاغ محدود تھے۔ لوگوں تک حقائق پہنچ ہی نہیں پاتے تھے۔ جو آدمی بادھوی
غیر میں پہنچتا، ان سے ہی وہ غلط یا صحیح نتیجہ اخذ کر لیتے۔
آج کے دور کا الیہ ہے۔ ابلاغ کے بے شمار ذرائع آپ کے ہر امن تک ہر خاص و عام کی رسائی
ہے۔ ٹی وی، کیبل، انٹرنیٹ، موبائل، اخبارات، ایک کلک کی فوری پر معلومات کا ایک خزانہ
آپ کی دسترس میں۔ ذرا ذرا سی بات پر سبڈ یا ایک طوفان کھڑا کر دیتا ہے۔ ہر شخص کو اظہارِ رائے کی
آزادی حاصل ہے۔ جب تک حقیقت سامنے آتی ہے، جھوٹ اپنے قدم جما چکا ہوتا ہے۔ اب آپ
اکہ تردیدیں کریں، کون منتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سچ آج بھی عام لوگوں کی پہنچ سے نڈھ ہے۔ ان تک حقائق پہنچ ہی نہیں پاتے۔
میڈیا نے ایک سیلاب کی شکل کر لی ہے جس نے لوگوں سے سوچ و فکر کی صلاحیت ہی چھین لی ہے۔
سوچ اور فکر سے عاری ذہن جھوٹ اور سچ کے درمیان تفریق کر کے بھٹے ماری ہے۔

اپنی دلے رکھنا اور اس کا اظہار کرنا سوچ اور فکر کی آزادی جمہوری معاشرہ میں بنیادی حقوق میں
شامل ہے۔ انسان کی سوچ کو زنجیریں نہیں ڈالی جاسکتیں لیکن سچائی اور حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں
کرنا چاہیے۔ سب سے سچے کلمے کوئی رائے قائم کر لینا اور پھر اس پر سارا مہا نانا نہیں ہے۔ اپنے موقف کے
حق میں آپ کے پاس دلی ضرورت ہونا چاہیے۔ وہ فیصلے جو قوم اور ملک کی تقدیر پر اثر انداز ہوں، وہ
صرف ذاتی پسند ناپسند کی بنیاد پر نہیں ہونے چاہئیں۔ اپنی بات کہیں، لیکن دوسروں کا موقف بھی سمجھنے
دل سے نہیں۔ اشتعال، بدگلائی اور بدزبانی ہماری تہذیب کا حصہ نہیں۔ کسی بھی بات کو جلتے اور پرکھے
بغیر کنگے بڑھانے سے گریز کریں۔

اسکس شمارے میں،

- ۱۔ ہم اور بلیس۔ فرزانہ کھل کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ۲۔ عسیر لیرا۔ حسنہ حسین کا مکمل ناول،
- ۳۔ مارا منظر میل جائے گا۔ صدق عمر کا مکمل ناول،
- ۴۔ شاملہ العباد کا ناولٹ۔ سمرال گنڈا پھول،
- ۵۔ قرۃ العین سکندر، اجروہ دیکھان، عیسر اوشین، جویریہ مریم، ازارا، پنچرا اور زندہ قاسکندہ کے افسانے،
- ۶۔ امت العزیز شہزاد کا ناول۔ والعصر،
- ۷۔ لی وی فنکارہ مائے قریشی سے ملاقات،
- ۸۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ۹۔ جب تجھ سے ناپا جوڑا ہے۔
- ۱۰۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔



بے مثل و بے بدل ہے ایک ایک کام تیرا
یکتا ہے ذات تیری، واحد ہے نام تیرا

فرشِ زمیں پہ تُو ہے، عرشِ علیٰ پہ تُو ہے
یہ بھی مقام تیرا وہ بھی مقام تیرا

خود شید و ماہِ انجم کئے رواں دواں ہیں
فہم بشر سے بالا ہے انصرام تیرا

گلشن میں چہچہوں میں حمد و ثناء ہے تیری
گلتے ہیں گن پرندے ہر صبح شام تیرا

انسان خود غرض ہے طامع ہے کم نظر ہے
بڑتی ہے جب مصیبت لیتا ہے نام تیرا

کفایت میں بھی ملا ہے اس کو سکون قلبی
الطاف ہو گیا ہے دل سے غلام تیرا

الطاف سکھتے دی

زندگی کا سفر ہو گیا معتبر
آپ کے عشق کا سلسلہ معتبر

کیوں نہ ہو معتبر منزلِ راہِ حق
مل گیا ہم کو اک رہنما معتبر

آپ کے شہر میں جو پھر رہنما ٹپ
بادشاہوں سے ہے وہ گدا معتبر

جو مدرسے کے اوپر برس آئی ہے
ہو گئی ہے وہ تازہ گدا معتبر

آپ کے شہر میں رات پہاڑ کی
آپ کے شہر کا راستہ معتبر

خود شید اقبال جید

لغات



حکمران کی اطاعت

حضرت امین عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جس نے (حکمران کے جائز کاموں میں) اطاعت سے ہاتھ اٹھا لیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا“ (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ”جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ جماعت کو چھوڑے ہوئے تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“ فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث میں بھی مسلمان حکمران کی اطاعت کو لازم اور اس کی بیعت و اطاعت سے گریز و انحراف کو کفر و ضلال سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اسے

جاہلیت کی موت اس لیے فرمایا کہ اسلام سے قبل ایک امیر کی اطاعت کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ اس میں وہ اپنی عار اور ذلت محسوس کرتے تھے۔ اسلام نے اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے انہیں نظم و ضبط کا پابند بنایا اور اطاعت امیر کی تاکید کی۔

تاہم اس میں جس امیر کی بیعت اور اطاعت کو ضروری اور اس سے خروج و بغاوت کو جاہلیت قرار دیا گیا ہے، اس سے صاحب امر و اختیار امیر، یعنی حکمران اور بادشاہ وقت مراد ہے۔

مسلمانوں کی محدود جماعتوں کے بے اختیار امیر مراد نہیں ہیں کیونکہ ان کی اطاعت سے ملکی استحکام وابستہ ہے نہ ان کی عدم اطاعت سے نظم و مملکت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی بیعت و اطاعت سے انکار یا انحراف اتنا بڑا جرم نہیں کہ اسے کفر و ضلال قرار دیا جاسکے، جب کہ حدیث میں اسے کفر و ضلال ہی کہا گیا ہے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امیر سے مراد مسلمانوں کا با اختیار حاکم ہے نہ کہ کسی معاملات کے امیر اور جماعت سے مراد

مسلمانوں کی جماعت ہے نہ کہ مسلمانوں کا کوئی ایک گروہ یا دھڑا۔

2۔ اپنے اپنے گروہ کے امیر یا صدر کی اطاعت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی گروہ میں نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا، گو اس نظم جماعت سے خروج کفر نہیں، جیسا کہ جماعت المسلمین اور اس کے امیر سے خروج کفر ہے۔ نیز بعض لوگ کسی نہ کسی ہجو و مرشد کی بیعت کرنا ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔

ضروری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”تم پر سننا اور ماننا ضروری ہے، اپنی عقل کی حالت میں بھی اور خوش حالی میں بھی، اپنی خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی اور حکمرانوں کے تم پر دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں بھی۔“ (مسلم)
فوائد و مسائل:

1۔ حکمرانوں کی اطاعت چونکہ ملت کے مجموعی مفاد کے لیے ضروری ہے، اس لیے تاکید کی گئی کہ تم اپنے ذاتی مفادات اور حالات و جذبات مت دیکھو بلکہ ان سے ہالا ہو کر سوسائٹی کے مفادات کے پیش نظر ہر صورت میں حکمرانوں کی اطاعت کرو۔ سوائے بافرمانی کے کاموں کے کہ ان میں اطاعت کرنا جائز نہیں۔

2۔ اس حدیث میں معاشرتی استحکام کا خیال رکھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور خود غرضی، جو امن و امان اور استحکام کو ختم کر دیتی ہے، سے باز رہنے کا حکم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، پس ہم نے ایک منزل پر قیام کیا۔ ہم میں سے بعض اپنے خیمے درست کر رہے تھے، بعض تیرا اندازی وغیرہ میں مقابلہ کر رہے تھے اور

بعض اپنے موسیقیوں میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متادی نے آواز لگائی کہ نماز تیار ہے۔

ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”مجھ سے پہلے جو نبی بھی ہوا، اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی امت کی رہنمائی ایسے کاموں کی طرف کرے جنہیں وہ ان کے لیے بہتر جانتا اور انہیں ان کاموں سے ڈرائے جنہیں وہ ان کے لیے برا جانتا ہو۔ اور تمہاری یہ امت جو ہے اس کی عافیت اس کے ابتدائی حصے میں رکھ دی گئی ہے اور اس کے آخری حصے میں آزمائش اور ایسے معاملات پیش آئیں یا جنہیں تم برا سمجھو گے اور ایسے فتنے ظہور پذیر ہوں گے کہ ایک، دوسرے کو ہلکا کر دے گا (یعنی ایک سے بڑھ کر ایک فتنہ رونما ہو گا اور بعد میں آنے والے فتنے کے مقابلے میں پہلا فتنہ بالکل ہلکا لگے گا)۔ ایک فتنہ سامنے آئے گا تو مومن کہے گا یہی میری ہلاکت کا باعث ہو گا۔ پھر وہ دوزر ہو جائے گا اور کوئی اور فتنہ ظہور پذیر ہو گا تو مومن کہے گا یہی وہ فتنہ ہے جس سے بڑا ہے۔

پس جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ جہنم کی آگ سے دور ہو اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو اسے موت اس حالت میں آتی چاہیے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اپنے ساتھ کیے جانے کو پسند کرے۔ اور جو شخص کسی امام کی بیعت کرے اور اسے اپنا ہاتھ اور اپنے دل کا پھل دے دے (یعنی دل میں اس کی بیعت کے پورا کرنے کا عزم رکھے) تو اسے چاہیے کہ مقدور بھر اس کی اطاعت کرے، پھر اگر دوسرا کوئی اسے اپنا تابع بنانے کے لیے اس سے جھگڑا کرے تو دوسرے کی گردن مار دو (اسے قتل کر دو)۔“ (مسلم)
فوائد و مسائل:

1۔ اس میں ابتدائی حصے سے مراد صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا عہد ہے جسے دوسری حدیث میں خیر القرون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ عہد، مابعد کے تمام

عہدوں سے زیادہ خیر و عافیت اور برکت و سعادت کا عہد ہے۔ اس کے بعد کیے بعد دیگرے فتنوں کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوں گے۔ اس پیش گوئی کی صداقت آج ہر شخص پر روز روشن کی طرح واضح ہے۔

2- فتنوں کے ظہور کی خبر سے مقصد، امت کو متنبہ کرنا ہے تاکہ وہ ان سے اپنا دامن بچا کر رکھے، اسی لیے اس سے بچنے کا طریقہ بھی بتلادیا اور وہ ہے ایمان باللہ اور ایمان کے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہنا اور لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ اور حسن اخلاق کا اہتمام کرنا۔

3- اس میں اقتدار پسندوں کی کثرت کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے اور اس کا حل یہ بتلایا ہے کہ پہلے حاکم کی اطاعت کرو اور اس کے ساتھ مل کر دوسرے مدعی خلافت کی گردن اڑا دو کیونکہ اس طرح ہی ملت اسلامیہ کی وحدت قائم رہ سکتی ہے اور وہ انتشار و تفریق سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔

برے حاکم

حضرت ابو جہدہ داکل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سلمہ بن یزید بھی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔
”اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس کی بابت ارشاد فرمائیے کہ اگر ہم پر ایسے (برے) حاکم مسلط ہو جائیں کہ وہ ہم سے تو اپنا حق مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے۔“
آپ نے اس سے اعراض فرمایا۔

انہوں نے پھر آپ سے یہی سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”تم ان کی بات سنو اور مانو، ان کے ذمے وہ بوجھ ہے جو انہیں اٹھوایا گیا (یعنی عدل و انصاف) اور تمہارے ذمے وہ بوجھ ہے جو تمہیں اٹھوایا گیا (یعنی اطاعت)۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل:

1- مطلب یہ ہے کہ حاکم اور رعایا دونوں کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔ جو بھی اس میں کوتاہی کرے گا، اس کا بوجھ اس پر ہوگا اور اس کا خیال وہ اسے قیامت کے روز بھگتنا ہوگا۔ لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اگر حاکم اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو رعایا بھی سمع و طاعت سے انکار کر دے۔ اس لیے کہ کوتاہی کا علاج کوتاہی سے ممکن نہیں۔ اس طرح مزید فساد ہوگا۔

2- بنا بریں ملک کے مفاد عامہ کے لیے حکمرانوں کے ظلم کو برداشت کرنا، ان کے خلاف خروج و بغاوت کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ تاہم قانون جس حد تک تنقید کرنے اور اصلاح کی آواز بلند کرنے کی اجازت دے، اس حد تک ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا، خروج و بغاوت سے مختلف چیز ہے اور اس کا اہتمام کرنا اپنی اپنی طاقت کے مطابق ضروری ہے۔

خود غرض حکمرانی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”میرے بعد خود غرض حکمرانی ہوگی (یعنی سارے مفادات خود ہی سمیٹ لینے کی ہوس۔ یاد دہرے معنی میں انہوں کو ترجیح دینا) اور دیگر امور جنہیں تم برا سمجھو گے۔“

صحابہ کرام نے عرض کیا۔
”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس شخص کی بابت کیا حکم فرماتے ہیں جو ہم میں سے یہ مانہ پالے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اپنا وہ حق ادا کرنا جو تمہارے ذمے ہے اور جو تمہارے حقوق (حکمرانوں کے ذمے) ہیں، ان کا سوال تم اللہ سے کرنا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں جہاں ایک طرف عوام کو حکمرانوں کے ظلم و ستم، ان کی اقربا نوازی یا خودی تمام قوی و مسائل کو اپنے لیے مختص کر لینے کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا

”جس نے بادشاہ کی بے توقیری کی، اللہ بھی اسے ذلیل کرے گا۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)
فوائد و مسائل:

1۔ بادشاہ کی بے توقیری اور اہانت سے مراد، ان کی حکم عدولی اور عدم اطاعت ہے۔ اس سے حکمرانوں کا وقار اور ان کی حکمت و جلال متاثر ہوتا ہے جبکہ امن و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کا رعب و دبدبہ قائم رہے تاکہ جرائم پیشہ اور قانون شکن عناصر کو اپنی مذموم کاروائیوں کی جسارت نہ ہو۔ بہر حال ملکی مفاد اور مصلحت عامہ کی وجہ سے مسلمانوں کو یہی تاکید کی گئی ہے کہ جب تک حکمرانوں سے کفر صریح کا ارتکاب نہ ہو اور جب تک وہ نماز اور دیگر شعار دین کو قائم رکھیں، اس وقت تک ان کی اطاعت کرو، چاہے وہ عدل و انصاف کے قیام اور عوام کے دیگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے ہی ہوں۔

2۔ اسلام میں حزب اختلاف کا رول بھی مختلف ہے۔ ایسی حزب اختلاف جس کا کام ہی ہر وقت حکومت پر تنقید اور اس کے خلاف لوگوں کو خروج و بغاوت پر آمادہ کرنا ہے تاکہ وہ حکومت ناکام اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جائے اور پھر وہ خود اس کی جگہ اقتدار پر فائز ہو جائے۔ اسلام میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کا یہ تصور نہیں ہے۔ سب ایک ہی امت ہیں اور ایک ہی کشتی کے سوار ہیں جن کے مفادات اور مقاصد بھی ایک ہیں اور حکمرانوں کی کوتاہیوں کے باوجود عوام کو ان کے خلاف خروج و بغاوت پر آمادہ کرنا جرم ہے۔

3۔ ان کی کوتاہیوں کو برداشت کرنے کی تاکید میں بھی یہی حکمت ہے تاکہ ایک حکمران کو حکومت کرنے کا زیادہ سے زیادہ وقت ملے کہ اسی میں عوام کا بھی مفاد ہے اور ملک کا استحکام بھی۔

عہدہ و منصب کا۔ ہال کرنے کی ممانعت

لینے کی متین ہے، وہاں دوسری طرف بالواسطہ حکمرانوں کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ مذکورہ طور طریقے اختیار کرنے سے بچیں ورنہ وہ عند اللہ مجرم ہوں گے۔

حاکم کی اطاعت فرض ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے حاکم کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے حاکم کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: امیر یا حاکم سے مراد اپنے وقت کا مسلم حکمران، کسی صوبے کا گورنر و وزیر اعلیٰ اور کسی علاقے کا افسر مجاز ہے۔ ان کی اطاعت، جب تک اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو، ضروری ہے اور ان کی نافرمانی سخت گناہ۔ کیونکہ حکم ملت بہت ہی ضروری ہے اور وہ اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔

مصلحت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جو اپنے حاکم کا کوئی کام ناپسندیدہ دیکھے تو اسے چاہے کہ صبر کرے، اس لیے کہ وہ بالشت برابر بھی حاکم کی اطاعت سے نکلا تو اس کی موت، جاہلیت کی موت ہوگی۔“ (بخاری و مسلم)
فائدہ: اس میں بھی حکمرانوں کی اطاعت میں سرکشی کرنے سے روکا گیا ہے۔

بادشاہ کی بے توقیری

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”یہ آخرت کا گھر ہم ان ہی لوگوں کے لیے کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا کی جاتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور اچھا انجام پر ہیزگاروں کے لیے ہے۔“ (التقصص - 83)

فائدہ:

طلب امارت کا مطلب ہے کہ اس کا طالب دنیا میں بڑا کی کو پسند کرتا ہے اور بڑا کی پسندوں کا رویہ ہی زمین میں فساد کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ عہدہ و منصب کی خواہش اور اس کے لیے سعی و کوشش کا انجام بالعموم برائی ہوتا ہے۔ حسن انجام اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی مناصب سے کنارہ کش رہے۔

منصب کا سوال کرنا

حضرت ابو سعید عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے عبدالرحمن بن سمرہ! تو خود حکومت کے کسی منصب کا سوال نہ کرنا، اس لیے کہ یہ منصب اگر تجھے بغیر سوال کے مل گیا تو اس پر (اللہ کی طرف سے) تیری مدد ہوگی اور اگر یہ تجھے سوال کرنے سے ملے گا تو یہ تیرے سپرد کر دیا جائے گا (اللہ کی مدد شامل حال نہیں ہوگی)۔ اور جب تو کسی بات پر قسم کھالے، پھر تو کسی اور میں اس سے زیادہ بہتری دیکھے تو وہ کام اختیار کر جس میں بہتری ہو اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ امارت سے مراد خلافت (حکومت) یا اس کا کوئی بھی منصب ہے۔ اس کی آرزو اور اس کے لیے کوشش کرنا ناپسندیدہ ہے، اس لیے کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل امر ہے۔ البتہ جسے بغیر مانگے یہ منصب مل

جائے وہ اسے قبول کر لے کیونکہ بن مانگے یہ اسی کو ملے گا جس میں اس کی خاص استعداد و صلاحیت ہو گی۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی مدد ہوگی اور اسے خیر و کی توفیق ارزانی ہوگی جبکہ خود خواہش کر کے حاصل کرنے والا اللہ کی طرف سے خیر کی توفیق سے محروم رہے گا۔

2۔ کسی کام کی بابت قسم کھالی ہے، جب کہ اس میں کسی دوسرے کام کے مقابلے میں خیر اور نفع زیادہ ہے تو ایسے موقع پر قسم توڑ کے اس کا کفارہ ادا کر دیا جائے اور جس میں بہتری ہے، اس کام کو کر لیا جائے۔

3۔ کفارہ قسم ایک گردن آزاد کرنا، یا دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس مہیا کرنا ہے۔ جو ان کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ زمین و نون کے روزے رکھے۔

ندامت کا باعث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم یقیناً حکومت اور امارت کی حرص کرو گے (لیکن یاد رکھو!) یہ قیامت والے دن ندامت (کا باعث) ہوگی۔“ (بخاری)

فائدہ:

1۔ اس میں بھی امارت کی عظیم ذمہ داریوں کے حوالے سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو بغیر اہلیت کے اس کی خواہش کریں گے اور پھر اس میں کوتاہیوں کی وجہ سے عند اللہ مجرم قرار پائیں گے۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی ذمہ داریوں سے دور ہی رہے۔ اور اگر اہلیت کی بنیاد پر اسے یہ منصب ملے تو وہ اس کے تقاضے بھی پوری دیانت داری سے ادا کرے تاکہ روز قیامت کی ندامت سے وہ محفوظ رہے۔

☆☆

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے

الف۔ م۔ ق بلوچستان

شوق تھا۔ خوب ساری پینٹنگ کی جوا بھی بھی محفوظ ہے۔

س۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج: اگر دیکھا جائے تو بڑوں کی مرضی سے سب کچھ ہوا اور پردہ میری بھی پسند شامل تھی۔ کبھی بات وغیرہ نہیں کی پر اچھا لگتا تھا خواہش تھی کہ یہی زندگی میں شامل ہوا اور رب نے بن کے پورا کر دیا۔

س۔ ذہن میں جیون سانگی کے حوالے سے کوئی تصویر تھا نیز وہ کیا خوبیاں تھیں، جو آپ اپنے جیون سانگی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج: ذہن میں جو تصور تھا وہ ایک نیک، نمازی، خوش اخلاق، سبھی ہوئی عادت کا مالک ہو۔ اپنے رشتوں میں توازن رکھنے والا ہو، کلین اور کیرٹنگ ہو۔ انصاف پسند ہو۔ مجھے سمجھنے والا ہو اور دھیما دھیما بولنے والا ہو، مطلب نرم گفتار اور تھوڑی بہت کی بیشی کے ساتھ شکر ہے رب کا کہ ایک بہترین ہم سفر ملا۔

س: ممکن تھا عرصہ ری؟ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات؟

ج: ممکن تھی چھ ماہ ری، میں اس سے پردہ کرتی تھی۔ جس پردہ ہر بار امی سے لڑائی کر کے جانے کہ کزن ہے پھر بھی پردہ کرتی ہے۔ مجھے کسی نے بھی پردے کے لیے نہیں کہا۔ میں نے اپنے دل سے پردہ کیا کیونکہ پہلے تو صرف کزن تھا اب تو منگیتر تھا اب اس نگاہ سے دیکھتا مجھے میں نے، اس لیے شادی تک مکمل پردہ کیا۔

س: شادی سے پہلے سسرال کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

سلسلہ اپنے نام کی طرح بہت منفرد اور زبردست ہے۔ شادی ایک ایسا بندھن ہے جو جڑتے ہی ایک لڑکی کی شناخت بدل دیتا ہے۔ بہت سے نئے رشتے جڑتے ہیں۔ بیوی، بہو، بھابھی، چاچی مابی اور یہ رشتے نبھانے بھی پڑتے ہیں۔ نکاح دو انسانوں کے بیچ ایک خوب صورت لیکن انتہائی نازک رشتہ ہے۔ جسے نبھانے اور خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے لڑکی کو ہی صبر و برداشت کے ساتھ بہت سی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج: شادی 24 فروری 2018 بروز جمعہ کو ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج: شادی سے پہلے میں زعمہ تھی اور زعمہ دل بھی تھی۔ سب سے بڑا مشغلہ ڈائجسٹ پڑھنا بلکہ گھول کر پینا۔ دوستوں کو لمبے لمبے خط لکھنا۔ گفٹ بھیجنا۔ امی ابو کی خدمت، گھر کے کام کاج، بھائیوں کے ساتھ کرکٹ، لوڈو اور بیڈمنٹن کھیلنا۔ بہن کے ساتھ کپیس لگانا۔ بھائیوں کے بچوں کی سالگرہ سلیمہ میٹ کرنا۔ ساتھ میں پارٹیاں اور ہلا گلا کرنا غرض جس سے دل خوش ہو پردہ کام کیا۔

شادی سے پہلے زندگی اچھی گزری۔ بھائیوں اور بہن کی لاڈلی تھی۔ ماں تو ویسے ہی بہت پیار کرتی ہے اور بھابیوں سے بھی اچھی دوستی رہی۔ کھانا پکانے کا شوق تھا جو خوب پورا کیا۔ اسکول اور کالج کا وقت تو بہت انجوائے کیا، لی اے ڈگری کالج سے کیا۔ اس کے علاوہ سلائی، کڑھائی اور مصوری کا بہت

ج: شادی سے پہلے اچھے خیالات تھے۔ اپنے تھے سرال والے تو سب کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ حقیقت پسند بھی اس لیے۔ پہلے ہی ذہن میں تھا کہ سرال میکہ ہرگز نہیں ہو سکتا، اس لیے جتنی کم توقعات ہوں گی اتنی ہی آسانی ہوگی ایڈجسٹ کرنے میں اور یہ بھی دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر کچھ اور نیچے ہو گیا پھر بھی سرال والوں کے بارے میں، اپنے شوہر اور میکے والوں سے کچھ بھی نہیں، کہوں گی ان کا دل برا نہیں کروں گی۔

میری تو عادت ہے کوئی کچھ بھی کہے جواب نہیں دیتی اور خود ہی رو دھو کر دل صاف کر لیتی ہوں۔ رہتا بھی تو ان ہی کے ساتھ ہے پھر کیوں کسی کا کسی کے رشتوں سے دل برا کروں، الحمد للہ اپنی اس سوچ پر اب بھی قائم ہوں بہت کچھ دیکھا، بہت برداشت کیا لیکن اب تک کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ ہمیشہ سب کے سامنے اپنے گھر والوں کی تعریف ہی کی۔ آئندہ بھی یہی ارادہ ہے۔

س: شادی سے پہلے آپ کو تعلیم چھوڑنی پڑی یا کوئی اور قربانی دینا پڑی؟

ج: تعلیم تو مکمل تھی، بی اے کیا تھا ایم اے کا شوق تھا پر اجازت نہیں تھی اور بانی ساری قربانیاں شادی کے لیے نہیں بلکہ شادی کے بعد دیں۔ سب سے بڑی قربانی، میری عبادت میں کمی آئی۔ وہ جو پہلے مغرب اور عشاء کے بعد سورۃ یسین اور سورۃ ملک اور سورۃ فاتحہ پڑھتی تھی وہ بھی چھوٹ گئی۔ فجر کے بعد تلاوت اور اشراق پھر چاشت اور ادا بین سب گھر کے کاموں کی نذر ہو گئی۔ صرف فرض عبادت ہی ہے جو مشکل سے ادا کرتی ہوں۔

گھر کی ساری ذمہ داری میرے اوپر ہے۔ پانچ مرد، ساس اور چھوٹا بچہ کے کپڑے دھونا استری کرنا، کھانا پکانا، بڑی سی حویلی کو جھاڑو لگانا ہاتھ روم صاف کرنا اس کے علاوہ ہر چھوٹا بڑا کام، سب کی الگ الگ فرمائشیں پوری کرنا، ساتھ ساتھ مہمان، جماعتوں کی ساٹھ، ستر روٹیاں پکانا سالن اور دیگر

لوازمات اور ہر کام کا ایک وقت مقرر تو پھر ایسے میں صرف فرض ہی ادا ہو سکتا ہے۔ وہ بھی یہ مشکل اور اس کے علاوہ نیند کی قربانی دینی پڑی۔ یہاں تو صبح صبح اٹھ جاتی ہوں میری ساس نے چائے کی ذمہ داری بھی شادی کے چوتھے دن ہی لگا دی، پھر رات کو دیر ہو جاتی سونے میں پھر دوپہر میں بھی ٹائم نہیں ملتا تھا اب تو پھر بچے ہی سونے نہیں دیتے۔

س: رسموں کے لین دین پر جھگڑا؟

ج: شکر ہے رب تعالیٰ کا شادی سادگی اور بخیر و خوبی سے منٹ گئی زیادہ شور شرابا نہیں کیا تھا۔ امی بیمار تھیں سو بس صرف قریبی رشتے داروں کو ہی بلایا تھا۔ چونکہ ایک خاندان تھا تو کچھ ادھر سے شامل تھے اور کچھ ادھر سے، جھگڑا اس لیے بھی نہیں ہوا کہ امی نے منع کیا تھا کہ کسی بھی کی بیٹی کے لیے ہاز پر نہیں کرنی۔ خرچ بہت کم دیا تھا اور ویسے میں اپنی طرف کی بچی ہوئی روٹی اور دن کا بچا کچا سالن دیا۔ جو کے بہت کم مقدار میں تھا۔ ہمارے گھر والوں نے خاموشی سے سب برداشت کیا اور میرا دل بہن سوٹ بھی عام سا تھا بلکہ بری کے تمام کپڑے عام سے تھے حالانکہ ماشاء اللہ بہت پیسے والے ہیں۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج: ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔

س: کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: اف یہ سوال دل کاٹنے کے لیے کافی ہے۔ شادی کے تیسرے دن امی والوں نے سب کی دعوت کی اور چوتھے روز ہی کام سنبھالا۔ اس وقت گھر میں میری بڑی نند، اس کی بڑی بیٹی اور باقی پانچ بچے۔ میری چھوٹی نند اس کے سات بچے، میری جھینائی اس کے پانچ بچے۔ میری ساس، تین دیور، شوہر اور سر موجود تھے۔

اتنی عورتوں کے ہونے کے باوجود ذہنی دلہن کو صبح کی چائے کی ذمہ داری دے دی۔ عجیب محسوس ہوتا تھا باورچی خانہ بھی نہیں تھا باہر سردی میں چائے بناتی تھی، اتنی بڑی کھانسی کہ اٹھائے اٹھتی نہیں تھی۔ وہ بھی

صبح سویرے تھوڑی سی دیر شامت لے آتی۔ اس کے علاوہ ایچ یا تھوڑا دم بھی نہیں تھا۔ ہاتھ روم کے باہر لائن لگی ہوئی تھی اس لیے مجھے سب سے پہلے اٹھنا پڑتا۔ میں اتنے سالوں کے بعد اب بھی سو جاتی ہوں تو بہت غصہ آتا ہے کہ میری ساس نے میرے اتنے پیارے دن برباد کر دیے۔ اب بھی چائے اور باقی کام میں ہی کرتی ہوں پر وہ پہلے دن اب بھی نہیں آئیں گے۔

اس کے علاوہ میری ساس اب تک ایسی ہی ہیں کمرے میں گئے ادھر، وہ شروع کہ باہر آ کے میرے سامنے بیٹھو، یہ کیا میں یہاں ہوں اور تم کمرے میں جاتی ہوں۔

اب کون سمجھائے اپنے بھی بہت سے کام ہیں بچوں کی چیزیں، کپڑے جگہ پر رکھتے ہوتے ہیں کمرہ صاف کرنا ہوتا ہے، کپڑے استری پہلے میں کمرے میں کرتی تھی پھر ساس کے تنگ کرنے پر اب باہر برآمدے میں کرتی ہوں۔ ورنہ ساس پھر ابا سے بولتیں۔ اس لیے مجبوراً ہر کام برآمدے میں کرنا پڑتا ساس کے سامنے اگر جمعہ کے دن شوہر گھر میں ہوتا چھٹی ہوتی ہے تا جمعہ کو، تو اس کے پاس تھوڑا سا بیٹہ جاتی تو ساس کو چین نہ آتا بار بار بلاتی کہ میرے پاس آ کر بیٹھو۔ میں اور میری جیٹھانی اگر ساتھ بیٹھتے بھی تو بیٹھنے نہ دیتی کہ ادھر میرے سامنے بات کرو جو بھی کرتی ہے اور یہ سب وہ مسکرا کر اور طریقے سیکھتے یہ کہتی تاکہ برا بھی نہ لگے۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے بہن کے گھر جانا ہوا دوست کے گھر، ایک گلی میں ہی گھر ہیں، وہ بھی ساس کے بغیر نہیں جاسکتے۔ ڈاکٹر کے پاس بچوں کو لے جانا ہوا خود لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا ہو ساس صاحبہ ساتھ ساتھ، اگر منع کرو تو بچوں کی طرح منہ پھلائیں گی اور بات نہیں کرتیں پھر۔

س: شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟
ج: شادی کے بعد زندگی یکسر بدل گئی، میں وہ

جو ایک انسان تھی۔ جیتا جاگتا وجود تھی۔ وہ مشین میں ڈھل گئی۔ میری زندگی کام اور ہر وقت کام بن گئی۔ سب کے لیے میری زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ ساسیں اپنی بہوؤں کو میری مثالیں دیتی ہیں۔ پر میں خود کو سب سے بہت پیچھے محسوس کرتی ہوں۔ شادی سے پہلے میری ڈرائنگ زبردست تھی ہر وقت خود کو صاف ستھرا رکھتی کپڑوں اور اپنے بالوں کی بہت کیئر کرتی۔ پر شادی کے بعد فرصت ہی نہیں تھی کسی چیز کی، کپڑے، بغیر استری کے جیسے جیسے پہن لیے۔ بال دھوئے تو کبھی کاٹا تم نہیں گول مول جوڑا بیٹا لیا جس کی وجہ سے بال بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اسکن رف ہو گئی اور بہت جلد ہی اپنی عمر سے بڑی دکھنے لگی۔

مثبت تبدیلی پہلے کم گو لیے دے والی فطرت تھی اب سب سے آرام سے جنس بول سکتی ہوں۔ خوش اخلاق تو پہلے بھی تھی۔ پر سب جان پہچان والوں کے ساتھ اب بہت اچھی طرح پیش آتی ہوں۔ پہلے نماز تھوڑی دیر سے پڑھتی تھی پر اب ساس کے ساتھ اچھی عادت پڑ گئی ہے اذان ہوتے ہی ہر کام چھوڑ کر پہلے نماز ادا کرتی ہوں۔ کانفیڈنس لیول اچھا ہو گیا ہے۔
س: بیکے اور سسرال کے ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟

ج: ذائقوں کا تو اتنا فرق محسوس نہیں ہوا۔ ادھر بھی مجھے خود ہی سب کچھ بنانا پڑا اور شکر ہے رب کا کوکنگ اچھی تھی مسئلہ نہیں ہوا، نکتہ چینی ہر چیز پر ہوتی رہی پھر بھی جو کچھ بھی پکایا سب نے ڈٹ کر کھایا اور دیور فرمائشیں کر کر کے چیزیں بنواتے ہیں۔ کھانا کھانے میں فرق ضرور ہے۔ جتنا تو وافر مقدار میں ہے پر ملتا تھوڑا تھوڑا ہے ساس صاحبہ ہر کسی کو اپنی محبت کے درجات کے حساب سے دیتی ہیں جس میں میرا درجہ آخری ہے۔ اس لیے ہمیشہ بچا کچھا حصے میں آیا۔
س: چائے کے لیے میری ساس نے شروع شروع میں بہت ترسایا۔ میں شروع سے ہی چائے کی بہت رسیا ہوں۔ میرا چائے کا بڑا سا گب تھا گھر میں۔ ٹائم کے علاوہ بھی وقت بے وقت چائے جیتی رہتی تھی اور

سردیوں میں تو اور بھی زیادہ طلب ہوتی تھی۔ یہاں تو ٹائمز کی چائے بھی آخر میں پہنچی ہوئی وہ بھی آدھا کپ ملتی بھی وہ بھی نہ ملتی۔ نئی نئی تھی تو خود سے دو بارہ بنانے کی ہمت نہ ہوئی اور جب بھی گوشت کا سالن بناتی میرے لیے ہوئی نہ نکلتی۔ بنانے والی میں کھانے والے سب، اگر بھی محتات کر کے دے بھی دیتیں تو چھپچھڑے والی چھوٹی سی اوپر سے کہیں تمہارے لیے ڈھونڈ کر اچھی ہوئی رکھی ہے، میں تو تمہیں اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ دیتی ہوں۔

ظاہر ہے ایسی پھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہی دے سکتی ہیں۔ اتنا بھی نہ سوچتیں کہ یہ خود بتا رہی ہے اس کے ہاتھ سے گزر رہی ہے یہ چیز اسے نہیں پتا ہوگا کہ یہ کتنی اچھی ہے۔ آگے سے یہ بھی سنا دیتیں کہ فلاں کھانے کے لیے جھگڑا کرتی ہے فلاں نے ایسا کہا ویسے کہا۔ ہمیں تو ملے ملے شکر کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

تو پھر بندہ ایسے میں کیا کہے دکھ تو ہوتا تھا کہ میری یہ حیثیت ہے گھر میں۔ لیکن بس پھر یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ شاید اللہ نے میرے لیے اس گھر میں اتنا ہی رزق لکھا ہے۔ جو نصیب میں ہے وہی ملتا ہے نہ زیادہ نہ کم۔

اس کی کو میرے شوہر نے پورا کیا۔ جو چیز دل کرے لا دیتا ہے۔ اب تو اتنا عرصہ گزر گیا ہے اب تو میں خود دودھ منگوا کر چائے بناتی ہوں اور ساس کو بھی پلائی ہوں۔ اس سب کے باوجود بھی میں ہر چیز چاہے میرا شوہر لائے، خود منگواؤں یا میکے سے آئے۔ میں پہلے اپنی ساس کو جا کر دیتی ہوں کہ اگر میں بھی ایسے کروں جیسے وہ کرتی ہیں تو پھر ان میں اور مجھ میں کیا فرق رہے گا۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف / تنقید ہوئی؟

ج: سسرال میں تنقید تو بلا وجہ اور بلا مقصد بھی کی جاتی ہے۔ پر تعریف کروانے کے لیے خود کو مٹانا پڑتا ہے اور شکر ہے رب تعالیٰ کا کہ اس نے بہت صبر و برداشت عطا کی ہر قدم پر ساتھ دیا۔ میری ساس

سب سے میری تعریف کرتی ہیں کہ میری بہو نے بہت اچھے سے گھر سنبھالا۔ ہمارے پاؤں تک دھلوائی ہے جو تے صاف کر کے پاؤں میں دیتی ہے۔ جو بھی پڑوس والے آتے جاتے ہیں سب تعریف کرتے ہیں کہ ایک اکیلی ہے۔ گھر کو، بچوں کو صاف رکھا ہوا ہے خود بھی صاف ستھری رہتی ہے اور گھر کا بھی سارا کام کرتی ہے۔ غرض اس طرح کی بہت سی باتیں سننے کو ملتی رہتی ہیں۔

س: سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئی؟

ج: اللہ کا شکر ہے کہ سسرال والے اتنے اچھے نہیں تو پرے بھی نہیں اور اچھائی برائی تو ہر جگہ ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔ اگر ساس میں کچھ باتیں بری ہیں تو اچھی بھی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی بات ہو تو میرا ساتھ دیتی ہیں۔ شوہر کے کان نہیں بھرتیں اور میں جو بھی خدمت کرتی ہوں تو مانگی بھی ہیں اور باہر تعریف بھی کرتی ہیں اور پھر میں نے تو اچھائی اور برائی دونوں کو قبول کر لیا ہے اور جتنی کم توقعات اتنے ہی کم دکھ۔

س: پہلے بچے کی پیدائش؟

ج: بہت مشکل وقت۔ اتنا کہ اب بھی یاد آتا ہے تو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے شادی کے بعد جلدی پر ٹیکہ دیا ہوگئی اور کچھ مشکلات ہوئیں۔ پانچویں مہینے مسئلہ بڑھ گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے بیڈریسٹ کا کہا اور یہاں جیٹھانی کے ہاں بچہ ہو گیا۔ اس کی خدمت، بچے کی خدمت۔ اپنے گھر کے سارے کام اور چوتھے دن جیٹھانی کا بچہ بھی فوت ہو گیا اور میرے سسر اور چھوٹے دپور کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پھر جو مصروفیات تھیں۔ وہ لکھنے سے قاصر ہوں کہاں کا آرام۔ کہاں کا بیڈریسٹ پھر تو رات کو بھی یہ مشکل آرام ملتا تکلیف اتنی کہ ساری ساری رات بیٹھ کر روتی اور سورۃ یسین پڑھتی۔

بس اللہ کی مہربانی سے وقت گزرا اور بڑی مشکلات کے بعد جیٹھا پیدا ہوا۔ پہلا بچہ وہ بھی اتنا بیمار کوئی تجربہ نہ تھا۔ سارا دن روتا، کام اتنا کہ دودھ بھی

سچ سے بچے کو نہ دے پانی۔ رو رو کر بچے کا حلق سوکھ جاتا۔ رات کو بھی ساری رات روتا۔ میری آنکھیں سوچ جاتیں نیند کے لیے۔ گھر بھرا ہوا۔ میری دونوں نندیں فیملیوں کے ساتھ سردیاں یہاں گزارتی ہیں۔ جیٹھانیاں بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔ ان سب کا کام مجھے کئے کرنا پڑتا۔ کوئی مدد نہیں اور اب کہتی ہیں کہ ہم تو ماں کے گھر سارا کام کرتے تھے۔

انہوں نے کہہ دے کو اپنا کیا نظر نہیں آتا دوسروں پر ترس آتا ہے اور جو سامنے ہو، اس پر رحم نہیں آتا۔ سب باتیں بتا نہیں سکتی۔ دل بھر بھر آ رہا ہے۔ پر کیا کریں کسی سے بھی کوئی شکایت نہیں کی بس ادھر ہی دل لٹکا کر رہی ہوں۔ اپنی پیاری بہنوں کے ساتھ دکھ شیر کر رہی ہوں۔ جب جب بچے بیمار ہوئے بھی تو اسی طرح مشکل وقت گزارنا پڑا۔ اپنی بیماری پر بھی کوئی چھوٹ نہیں، سارا کام ہر حال میں کرنا پڑتا تھا۔ اگر ساس کو بتاتی کہ مجھے تکلیف ہے تو سامنے سے کہتیں، کیا کریں ہمارا کون سے کرنے والا تم تو ہمارے ہاتھ کی ڈوگی ہو، تم نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔

س: شوہر سے تعلقات؟

ج: شوہر بہت اچھے ہیں بہت کیرنگ۔ پر بولتے کم ہیں۔ غصہ زیادہ کرتے ہیں۔ اب تو پھر بھی تعلقات اچھے ہیں، کچھ میرے دل کی سنتے ہیں کچھ اپنی سناتے ہیں۔ پہلے شادی ہوئی تو دوسرے مہینے بعد ہی گرمی آگئی۔ مجھے جھینڈ میں ایئر کولر ملا تھا۔ سب میرے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔ باقی سارے کمروں کو تالا لگا کر ساس سارا دن اوزرات کو بھی میرے چنگ پر سوئی ہفتے گزار جاتے اتنا موقع نہ ملتا کہ بندہ کوئی بات ہی کر لے۔ پھر دن میں دیور بھی سب آکر میرے کمرے میں سوتے۔

تین سال تک ایسے ہی چلتا رہا۔ سردی آئی کہ کمرے میں گیس کا چولہا جلتا تو سب وہاں سوتے اس بات پر کہ سردیاں تو بندہ اپنے کمرے میں گزارے۔ شوہر سے بڑی لڑائی ہوئی پر ہر بار جیت ان کی ہی

ہوئی سوا سی طرح زندگی گزر رہی ہے۔

اکتوبر، نومبر اور مارچ تین مہینے اسے کمرے میں رہتی ہوں۔ وہ بھی دن میں ساس بیٹھنے نہیں دیتی تھی کہ میرے ساتھ بیٹھو۔ شروع میں سال ڈیڑھ سال تک جیب خرچ نہیں دیا شوہر نے، پر اب دے دیتا ہے۔ پہلے کپڑوں وغیرہ پر بہت تنگ کرتا تھا کہ جھینڈا تھا ہے۔ دے ہی پہنو۔ اب لے کر دیتا ہے۔ شاید اب وہ خود بھی دیکھتا ہے کہ بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ کیسے اچھے ہیں تو اب اس کا رویہ بھی بہت اچھا ہے۔ شکر ہے رب کا کہ بہترین ہم سفر دیا ہے اب کئی بیٹی تو ہر انسان میں ہے۔ مجھے ہر حال میں ان سے محبت ہے۔

س: آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ؟

ج: دل سے جوائنٹ فیملی پسند ہے تھوڑی بہت مشکلات ہوتی ہیں تو بہت سارا سکھ بھی ہوتا ہے۔ جوائنٹ فیملی اس طرح ٹھیک ہے اگر بڑے انصاف والے ہوں۔ ہر کسی کی تھوڑی بہت پرائیویسی بھی ہونی چاہیے اور بے جا پابندیاں نہ ہوں۔ بہویں بھی تو کسی کی بیٹیاں ہیں، خریدا ہوا مال تو نہیں، پیار محبت ہو، کوئی کسی پر بوجھ نہ بنے۔ ایک دوسرے کا احساس ہونا چاہیے تھوڑی بہت برداشت کے ساتھ اچھی گزر جاتی ہے۔ شکر ہے اب بھی میں جوائنٹ فیملی میں ہوں۔ سب کا ایسے ہی خیال رہتی ہوں۔

س: آپ نے سسرال کا ماحول بہتر بنانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں؟

ج: اگر نیت صاف ہو تو پھر مدد رب کی طرف سے آتی ہے۔ میں نے سسرال کو صرف سسرال نہیں بلکہ اپنا گھر سمجھا اور بہت محنت کی۔ سدھارنے میں وقت لگا پر تبدیلی آئی۔

میری شادی ہوئی تو گھر میں ڈھیروں برتن ہونے کے باوجود ٹیڑھے میڑھے سوراخ والے کٹوروں میں کھانا کھایا جاتا۔ مٹی کے ٹوٹے کٹاروں

والے پیالوں میں چائے لی جاتی۔ میری ساس
مردنوں والے کمرے کو ٹال لگا کر رکھتی۔ (اب بھی لگاتی
ہیں) پھر کہہ کر میں نے پیشین نکلوا میں میرے
دیوروں نے بھی ساتھ دیا۔ وہ بھی اچھا لائف اسٹائل
چاہتے تھے۔

میں پلیٹیں نکال کر لاتی۔ ایک وقت کھانا کھاتے دوسرے وقت سے پہلے میری ساس انہیں پھر تالے میں رکھ دیتی۔ بہت تنگ کیا۔ پھر کیا میں نے بھی سارے گندے پرانے برتن ایک تھیلے میں ڈال کر دیور کو دے کر کہا ان کے بدلے نئی چینک لے کر آؤ۔ پھر مجبوراً پلیٹیں دینی پڑیں ساس کو۔ پیالوں کی جگہ کپ اپنے جہیز کے نکالے۔ برآمدے میں پردے لگائے۔ کمروں میں اچھی چٹائیاں منگوا کر ڈالیں۔

برآمدے کو بیٹھنے کے قابل بنایا۔ بچے پرانے
دستر خوان فارغ کیے۔ خود اپنے جہیز کے نکالے کچھ

خداوند بخت
کریم و عزیز

زرد زانوں کا سویرا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



کے ۱۵۹۷ء

١٠٠٠

ॐ नमो भगवते वासुदेवाय

واک خریق قرنی

...and the

يعتقدون منكم ما يشاءون

4. *Alfred*

۱۰۰

021-3221036

تاریخ شمس المومنین

انت الحیات کی ممان صائمہ قریشی سے ملاقات شاہین گزشتہ



”میں دو پروجیکٹ میں معروف ہوں۔ ہم نیوی کا جو آج کل آن ایئر بھی ہے ”انت الحیات“ اور دوسرا سونٹھ اسکائی کاسیریل ”نکاح“ کر رہی ہوں۔

”انت الحیات“ میں تو انتہائی منفی رول ہے اور ”نکاح“ میں ایک ایسی خاتون کا کردار ہے جو ایک آدمی سے بے حد عشق کرتی ہے۔ تفصیل نہیں بتاؤں گی، آپ دیکھیں گی تو آپ کو مزہ آئے گا۔“

”صائمہ آپ فیکو اور پوزیٹو کردار کرتی ہیں تو ان کرداروں کا عام زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور ”انت الحیات“ میں جو آپ کا کردار ہے، بہت کچھ سننے کو مل رہا ہوگا؟“

”جی بس کیا بتاؤں بہت کچھ برا بھلا سننے کو مل رہا ہے۔ بہت ہی ایکسٹریم فیکو رول ہے

صائمہ قریشی کا اپنا تعارف تو ہے ہی کہ بہترین برقرار ہیں۔ بے شمار ڈراموں میں فیکو اور پوزیٹو رول کر چکی ہیں۔ لیکن ان کا ایک تعارف تو یہ بھی ہے کہ یہ ماضی کی مشہور و معروف فنکارہ ”روزینہ“ کی صاحبزادی ہیں۔۔۔ اور یوں فی صلاحیت انہیں ورثے میں ملی ہے۔

آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل ”انت الحیات“ میں دیکھ رہے ہیں جس میں ان کی فیکو اداکاری عروج پر ہے۔

”کیسے مزاج ہیں صائمہ قریشی صاحبہ؟“

”جی الحمد للہ۔“

”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ کیا آن ایئر ہے کیا انٹر پروڈکشن ہے۔ رول کیا ہیں؟“

ی نہیں کر پاتی۔“
 ”جب تم اس طرح کے جیسے“ انت الحیات“
 رول کر رہی ہو تو میں سوچتی ہوں کہ جب بچے بڑے
 ہوں گے تو بہوں ڈھونڈنے میں مشکل تو ہوگی.....؟“

قبیلہ ”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اور سچ بتاؤں
 کہ جب خیر سے میرے بچوں کی شادیاں ہوں گی تو
 میں بہوں کے ساتھ بہت زیادہ فریڈلی ہوں گی
 اس لیے فریڈلی ہوں گی کہ جیسے آپ کو پتا ہے کہ
 میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی میں بہت
 زیادہ مختصر ہوں ان متنی کرداروں سے جو آپ
 اسکرین پر دیکھتی ہیں۔ اگر میری بہوں کے ساتھ
 میرے بیٹوں نے کوئی بدتمیزی کی تو وہ مجھ سے ”چھتر“
 کھائیں گے۔ لیکن میں یہ بھی بات بتاؤں کہ میں
 ایک سخت ماں ہوں، اپنی تربیت اور اپنے اصولوں
 کے معاملے میں۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ بہت
 سخت اور بہت روڈ رہی ہوں پڑھائی میں..... منہرز
 میں رکھ رکھاؤ میں بہوں کے ساتھ تو سوال ہی پیدا
 نہیں ہوتا کہ کوئی بات ہو۔ بہوں میری بہت خوش
 قسمت ہوں گی۔“

”آج کل کی رائیٹرز میں کون پسند ہے؟“
 ڈائریکٹر بھی؟“

”ایمان داری سے بتاؤں گی کہ مجھے تو کوئی
 رائیٹر پسند نہیں ہے۔ سب کا جو ایک روٹین کام ہے وہ
 ہی سامنے آ رہا ہے۔ اور ڈائریکٹرز میں عابدس رضا
 پسند ہیں۔ بدر محمود اچھے ہیں اور علی حسن پسند ہیں۔“
 ”کوئی ڈائریکٹر اور رائیٹر جن کو آپ منع کر دیتی
 ہوں؟“

”منع کر دینے کا تو آج کل سوال ہی پیدا نہیں
 ہوتا..... آج کل ڈائریکٹر اور رائیٹر کون دیکھتا ہے۔
 آج کل تو اسکرپٹ دیکھتے ہیں۔ پیسہ دیکھتے ہیں۔ اور
 کردار دیکھتے ہیں۔ ڈائریکٹر کوئی بھی ہو ہمیں تو ان
 چیزوں سے مطلب ہے۔ انسان کہیں کریکٹر پر

اب دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ عام زندگی پر
 کردار کا اثر ہوتا ہے کہ نہیں تو بالکل بھی کوئی اثر نہیں
 ہوتا۔ میں اپنا سین جیسے ہی کٹ کر لی ہوں، اپنی مارل
 لائف میں واپس آ جاتی ہوں۔ میں ان آرٹسٹوں میں
 سے نہیں ہوں جو سین ختم کرنے کے بعد بھی اسے سین
 میں ہی رہتا ہے۔ میں ایسا نہیں کرتی۔ ریکارڈنگ ختم
 اور..... بس ڈرامہ ہے..... کوئی حقیقت نہیں ہے۔“
 ”زیادہ تر متنی رول کرتی ہیں۔ کیوں؟“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں
 دونوں طرح کے کردار کرتی ہوں۔ بس کردار اچھا ہونا
 چاہیے۔ ابھی حال ہی میں ختم ہونے والا سیریل
 ”نیز“ میں میرا پوزیٹو رول تھا..... ایک بڑی کاسٹ
 کے ساتھ میں نے کام کیا۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے
 کہ پوزیٹو رول سے لوگوں کو ہمدردی تو بہت ہوتی ہے
 مگر ایسے کردار رجسٹرڈ نہیں ہوتے۔ رجسٹرڈ ہیٹ
 رول ہوتے ہیں۔ کیونکہ ٹیلیو کردار ایک اسپارک ہوتا
 ہے اور آڈینس کے لیے سالہ لے کر آتا ہے، انہیں
 انتظار ہوتا ہے کہ یہ کردار اب سامنے آئے گا تو دیکھو
 کیا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ٹیلیو رول کرنے کا اپنا ہی
 مزہ ہے۔ آپ اپنی عام زندگی میں جو کام نہیں کر سکتے
 وہ آپ ڈرامے میں کر لیتے ہیں۔“

”آج کل کے زیادہ تر ڈرامے سازشوں پر مبنی
 ہوتے ہیں۔ کیا یہ رائیٹرز اپنی عام زندگی میں بھی ایسی
 ہی یا ایسے ہوتے ہیں؟“

”مجھے یوں لگتا ہے کہ ہمارے جتنے بھی رائیٹرز
 ہیں، وہ اپنی زندگی اسکرپٹ میں لکھتے ہیں یعنی انہوں
 نے اپنے ارد گرد جو دیکھا ہوتا ہے، اپنی زندگی میں جو
 دیکھا ہوتا ہے۔ اس کے تجربات ان کے پاس ہوتے
 ہیں وہ اسکرپٹ میں لکھتے ہیں۔ اور آپ کو میں کیا
 بتاؤں کہ کبھی کبھی تو میں اسکرپٹ میں ایسے ایسے
 ڈائلاگ پڑھتی ہوں جو لوگ عام زندگی میں بول ہی
 نہیں سکتے۔ پھر ہم اس کو چنچ کر کے اپنی زبان میں
 بولتے ہیں۔ اتنی ٹیکو باتیں لکھ دیتے ہیں کہ میں بیان

”جہاں تک ڈراموں کے ہٹ ہونے کی بات ہے تو اس کا انحصار نام پر نہیں ہے۔ کوئی بھی کاسٹینٹ ہٹ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مقبولیت کا داروہ دار اسٹرونگ اسکرپٹ پر ہے یا کاسٹ پر ہے۔ یا اسٹوری ایسی کہ ہٹ ہو گئی ہے۔ یہ تو سب ”جوا“ ٹائپ ہے۔ اور جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے تو مجھے سوپ بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ بس اب کر لیا ہے اب اس کے بعد نہیں کروں گی۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ میری زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں اور اسی کی ویلچہ زیادہ ہوتی ہے۔“

کپرو مانز کرتا ہے تو ہمیں پیسوں پر اور کہیں اسکرپٹ میرے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ ”کریکٹر“ ہے۔
”آج کل جو نئے فنکار آ رہے ہیں ان کے ہارے میں کچھ نہیں کی؟“
”جو ہماری سسل ہے، اسے پتا ہے کہ محنت کیا ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں ہر چیز کی قدر ہے۔ آج کل کے جوڑے لڑکیاں آرہی ہیں انہیں ہر چیز ریڈی ٹی ہوئی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت ہی آسان کام ہے۔“ کمرے کے سامنے کھڑے ہوئے،



”تمہارے بچے ہیں اس فیلڈ میں؟“
”میرے دو بچے تو بڑھ رہے ہیں جبکہ بڑا بیٹا اس فیلڈ میں۔ یعنی شو بزم میں آ گیا ہے۔ اور وہ بالکل بھی میری مرضی سے نہیں آیا کیونکہ میں تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ یہ شو بزم جوائن کرے۔ لیکن کیا کریں کہ شو بزم میں آنا اس کا جنون ہے۔ اور آج کل کے بچوں کو آپ روک نہیں سکتے۔ میں نے اسے بہت اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے اور اس کے لیے میرے کچھ گولڈ تھے کہ میں

لائسنس پولیس..... اور بس اصل میں انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے..... اور کتنا حساس ہے۔ دوسری بات سینئرز کی عزت نہیں ہے بالکل بھی..... چھوٹی چھوٹی بہت ساری ایسی باتیں ہوتی ہیں جو آپ اپنے رویے سے شو کرتے ہیں کہ آپ سینئرز کی کتنی عزت کرتے ہیں، وہ چیز نہیں ہے۔“
”سوپ اور میریل کیا پسند ہیں۔ اور مقبولیت کا کیا معیار ہے؟ نام ہے کیا؟“

اسنے سی ایس ایس کرواؤں اور باہر بھیجوں۔ مگر کیا کریں کہ بیسائیں ہو سکتا۔ بس اب تو یہی دعا ہے کہ بیٹہ تاملی اسے اس فیلڈ میں کامیاب کرے۔ آمین۔“

”قلم میں کام کیا تم نے؟“

”جی جی..... میں نے قلم میں کام کیا ہے“

سب ایک ہیں“ کے نام سے سید نور نے ڈائریکٹ کی تھی اور شاید 2002ء یا 2003ء میں کی ہے جس میں ”شامل خان“ تھے صائر جی نہیں اور شان تھے..... بس ایک ہی قلم کی ہے میں نے۔“

”آئے دن سوشل تقریبات ہوتی رہتی ہیں اور ایوارڈز کی تقریبات بھی..... تو بھی نظر نہیں آتیں تم؟“

”نظر کیسے آؤں ایوارڈ کی تقریب میں، کیونکہ کبھی بلایا ہی نہیں کسی نے..... تو کیسے چلی جاؤں۔ میں سوکھا تڑکرتی ہوں مگر بغیر دعوت نامہ کے جانا اچھا نہیں لگتا۔ اپنی بھی کوئی عزت ہے۔ بس اسی لیے آپ نے مجھے تقریبات میں نہیں دیکھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ ”ٹی وی دن“ کا ایوارڈ شو ہوا تھا، اس میں مجھے ایوارڈ ملا تھا۔ اور میرا نہیں خیال کہ ایوارڈ ملنا کامیابی کی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ٹاؤنر

زرد موسم راحت جنیں 1000/-

صاب دل رتبے دو غیلہ عزیز 400/-

محبت من محرم میراجید 400/-

گل کسار فرح بخاری 400/-

بذریعہ ایک متلو انے سے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

جہانت ہے اور میرے نزدیک تو باطن کی پسند اولین ہے اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہاں لیورٹ ازم بہت ہے۔ تو مجھے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ اگر آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں تو میرے خیال سے یہی سب سے بڑا ایوارڈ ہوتا ہے کسی بھی فنکار کے لیے۔“

”اور اپنی بھی زندگی کے بارے میں بتاؤ۔“

گھر پلو امور اور بچن سے کتنا لگاؤ ہے؟“

”جہاں تک کھانے کی بات ہے تو میں بہت دلی عورت ہوں، بہت سادہ رکھ رکھاؤ ہے۔ گھر کا کھانا جو بھی مل جائے کھا لیتی ہوں۔ گھر کی دال روٹی بھی آرام سے کھا لیتی ہوں۔ اور پھر آپ کو پتا ہے کہ ہمارا پروڈیوسن ایسا ہے کہ میں زیادہ تر ڈائیٹ پہ ہوتی ہوں۔ لیکن جب گھر پر ہوتی ہوں تو کچھ نہ کچھ بنا لیتی ہوں۔ شوٹ سے گھر جا رہی ہوں تو گھر جا کر پکانے کی اہمیت نہیں ہوتی تو پھر بازار سے ہی منگوا لیتی ہوں کہ مجبوری ہوتی ہے۔ اب بھی جب اتوار کو گھر پہ ہوتی ہوں تو کڑا ہی بنا لیتی ہوں۔ ساتھ میں روٹی چپاتی بنا لیتی ہوں۔ عام دنوں میں ڈائیٹ پر ہوتی ہوں۔ گھر کے سارے کام مجھے آتے ہیں بہت سکھز اور گھر پلو ہوں۔ بس کام ایسا ہے کہ گھر کے کاموں کو زیادہ نام نہیں دے پاتی۔“

”کھیلوں سے لگاؤ ہے؟ کون سا کھیل پسند ہے؟“

”کھیلوں سے بہت دلچسپی ہے۔ کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل ہے ایشیا کپ بھی دیکھا اگر چھٹی ہو تو کوئی میچ مس نہیں کرتی۔ شوٹ پر ہوں تو..... پھر جانتی ہی ہیں۔ گزشتہ دنوں پاک انگلینڈ سیریز ہوئی تھی تو ایک آدھ میچ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہاں پاک بھارت میچ ہو تو اسے نہیں چھوڑ لی..... ضرور دیکھتی ہوں۔“

☆☆



خط بھجوانے کے لیے پتا۔

ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

Email: shuaa@khawateendigest.com

سونیار بانی محلہ قاضیاں بالا سے شریک محفل ہیں لکھا ہے
کیا تھا اگر میرا افسانہ "فیصلہ" بھی لگا دیتے۔ خیر کیا
پتا میری ڈاک دیر سے ملی ہو۔ اترو پو میں مجھے کم ہی دلچسپی
ہوتی ہے۔ ہاں "جب تم سے ناتا جوڑا۔" ضرور پڑھتی
ہوں۔ اور میری دعا ہے کہ م۔ الف کے گھر کے حالات
ٹھیک ہو جائیں۔ مکمل ناول جیبہ شیراز کا "تم ملے" پرانی
کہانی تھی۔ مگر نئے لفظوں کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ شکر ہے
کہ سامع نے پھوپھو کی باتیں سن لیں (اب بھی جوائنٹ
فیملی سسٹم مجھے خوابوں میں لے جاتا ہے) مگر پھر آٹھ مکمل
جانی ہے اور اشار کلس والا اپنا جوائنٹ فیملی سسٹم یاد آتا
ہے۔ ۱۱۱۔

فرزانہ کا "ہم اور بلبلین" دوسرا حصہ پڑھ کر تبصرہ
کروں گی۔

ناولٹ، صرف ایک، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ شانزید
جمال کا تیرے اقرار کا موسم، اچھی کہانی تھی۔ بے شک
ایک لڑکی کے لیے عزت نفس ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتی
ہے۔

ولید میں اپنا ولید نظر آیا مجھے، افسانے، فیصلہ، نام
دیکھ کر دل دھڑکا، مگر وہ تحسین گل کا فیصلہ اٹھا اور تحسین گل کی
حنانے بہت اچھا فیصلہ کیا مگر یہ اتفاق بھی میرے ساتھ
کیوں نہ ہوا کہ کوئی میرے بارے میں کچھ کہہ رہا ہو۔ اور
میں سن لوں (لوگ کہتے رہے ہیں ناں) محبت یا عادت،
ارے ہاجرہ جی ایسے مرد بھی پائے جاتے ہیں۔ جو عادت
کا بھی اقرار نہیں کرتے۔

میں ایک ساس ہوں، یہ ظلم کر ڈالنا میرا جی آپ
نے۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ارے میں نے

لکھنا شروع کیا تھا اور آپ نے لکھ کر پوسٹ کر ڈالا
میرے خیالوں کو لے اڑیں آپ تو۔ زارا کے لائٹ نے
اس پاک ذات پہ یقین بڑھا دیا۔ بے شک وہ ہر لمحے
ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہمارے اندر ہوتا ہے۔ "سبق" قرۃ
العین جی نے اچھا سبق دیا ایسا سبق زندگی بھی اک بار
ضرور دیتی ہے، میں جب بیمار ہوئی تو اک دن صبا
(بھابھی) نے کہا کہ سو بہتی تمہاری اس نند نے تمہاری
خیریت تک نہ پوچھی جبکہ عام حالات میں روز بات ہوتی
تھی۔

کیا نظمیں اور غزلیں میں میری اپنی شاعری جگہ بنا
سکتی ہے؟

خط آپ کے، سب کے خطا جواب تھے مگر تنسیم کٹر
جی یقین کریں کچھ لڑکیوں کے لیے 120 روپے میں بھی
شمارہ لینا مشکل ہے۔

ج: پیاری سونیا! آپ کا افسانہ اکتوبر کے خواتین
ڈائجسٹ کے شمارے میں شامل تھا۔ شاید اکتوبر کا خواتین
ابھی آپ تک نہیں پہنچا۔ تبصرہ بہت خوب ہے۔ باتیں
سننے کا اتفاق ہمارے ساتھ بھی کبھی نہیں ہوا شاید ہم لوگ
اپنے خیالوں میں گم رہتے ہیں۔ جو دوسروں کی باتیں سن

ماہنامہ شعاع نومبر 2022 25

افسانوں اور ڈراموں میں ہی ہوتا ہے، اسی طرح ڈائری لکھنے کی عادت جو سارے راز آشکار کر دیتی ہے۔ یہ اتفاق بھی افسانوں میں ہی ہوتا ہے۔ ہمیں بھی احساس ہے کہ ہماری کچھ قارئین کے لیے 120 روپے قیمت بھی زیادہ ہے۔ دعا کریں کہ حالات سادگار ہو جائیں تو ہم پہلا کام قیمت کم کرنے کا ہی کریں گے۔

فرحانہ مہناز نے اسلام آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں
 سب سے پہلے پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں
 پڑھیں بہت ہی خوب صورت اور پیارا سلسلہ ہے۔ اس
 کے بعد ”تجھ سے نانا جوڑا“ میں بہمن ص۔ الف نے بغیر
 لگی لپٹی کے اپنے حالات بیان کیے اچھا لگا لیکن کچھ بے
 ربط اور محسوسانہ بچکانہ انداز تھا۔ فضیلہ ایک خوب صورت
 اداکارہ ہیں (میں بہت چھوٹی سی تھی جب ان کے ڈرامے
 دیکھتی) لیکن باتیں خوب صورت نہیں لکھیں مجھے، باقی
 بیٹیں مجھ سے متفق ہوں یہ ضروری نہیں۔ ”دسک دسک“
 کا میں جواب ہی نہیں دیتی۔ مطلب اس صفحہ کو فوراً پلٹ
 دیتی ہوں۔ اس کے بعد ترتیب سے خط آپ کے پڑھے،
 جناب تسنیم عیٰ علیٰ مجلس مشورہ قیمت بدھانے کا نہیں دینا
 چاہیے بلکہ کم کرنے کا ہوتا تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

صدق ناصر کا خط بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ”واحصر“ بہت ہی مجملک ہے لیکن پھر بھی اچھی لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ امت البعریز کو صحت کاملہ عطا کرے اور کہانی بھی کچھ لمبی لکھیں ہمارے لیے۔ ”محبت یا عادت“ انسانہ پڑھ کر خاموشی۔ کوئی رائے نہیں۔ دانش جین کا اردو ترجمہ سنجی بس سمجھ میں آیا ”ذرا سی بات“ ہاں کچھ سادہ ایسی ہوتی ہیں نئی بات کوئی نہیں تھی اس میں۔ ”تیرے اقرار کا موسم“ ہلکا پھلکا سا ناول اچھا تھا حالانکہ کہانی میں معمول تھے۔ فیصلہ بلوئی تاکی امی پر بھی انسان بن گیا (ہا ہا) تم لے ناول سے ملتا جلتا ناول تھا۔ جیب شیراز کو پہلی بار پڑھا تو رعایت بنتی ہے۔ ”میں ایک ساس ہوں“ حمیرا نے بہت خوب لکھا۔ ”تور القلوب“ ایک بات تو بتائیں پیاری رائیٹرز اچھا اتنا اچھا ناول لکھتے ہوئے اینڈ کرتی ہیں تو آخری قسط میں

جان کیوں چھڑا لیتی ہیں آپ باقی کیا لکھوں! ”ہم اور
 بلیلیں“ مای مای کوک دی میں، میں آپ کو یاد ہو گا اس
 کہانی پر بھی پہلے والے صفحہ پر یہی تصویر آرٹسٹ کی لگتی تھی
 فون کے پاس یہ بڑی تب مجھے بالکل اپنے جیسی لگتی۔ ہا ہا ہا
 فردانہ کمرل کا یہ ناول بھی ان کے باقی ناول سے
 جدا ہے۔ سنی ہاں جی سنے بیچ میں آج کل یہی کچھ ہو رہا
 ہے۔ کھانا کسی پہ کیوں بھی کبھی میں بھی شعر بھیجتی ہوں لیکن
 لگتا نہیں۔ عائشہ قیوم آپ نے شعاع کے ساتھ میں اپنا
 تعارف کچھ ادھورا سا لکھا۔ کیوں؟ آخر میں ہاتل اور
 قاتل کے بارے میں پڑھا، اچھا لگا۔

ج: پیاری مہنازا آپ کی یادداشت کی داد دیتے ہیں کہ اتنی پرانی تصویر آپ کو یاد ہے۔ آپ شعر ضرور سمجھوائیں ضرور شائع کریں گے۔ آپ کی تعریف اور تحقید بہت اچھی لگی۔ بہت خوشی ہوئی کہ ہماری قارئین باشعور اور ذہین ہیں۔ اپنی ایک رائے رکھتی ہیں اور بہت اچھے انداز میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ بہت شکریہ صدف ناصر کو جو انوالہ سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں مکتل پرانا مگر پیارا لگا۔ ”پہلی شعاع“ نے بہت دل ہما کیا۔ محترم عابد صاحب کی مغفرت اور درجات کی

دعا۔

حمہ اور نعت نے بہت سرور دیا۔ ”پیارے نبی کی باتیں“ پڑھ کر عظم میں اضافہ کیا۔ ”جب تجھ سے ناتا“ ادھورا سا محسوس ہوا۔ جوابات غیر مکمل سے گئے۔ ”فضیلہ قیصر“ کو دیکھ کر بے اختیار بچپن کی اپنی باتیں یاد کر کے ہنسی نکل گئی۔ کیونکہ جب چھوٹے تھے تب صرف اعترویہ پڑھنے کی اجازت تھی تو ہر دوسرے ماہ ”فضیلہ قاضی“ کا اعترویہ دیکھ کر غصہ آ جاتا تھا اور ہم کہتے تھے فضیلہ قاضی شاہین رشید کی دوست ہیں تب ہی اتنا اعترویہ آتا ہے۔ (۱۱۱)۔

"خط آپ کے" بلاشبہ جی اور پر خلوص محبتوں سے
گندھا ہوا بہترین سلسلہ۔ شکر ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کی
طرح شعاع کے تبرے بھی بھرپور ہو گئے ہیں۔ نسیم کوثر
نے درست فرمایا کہ شعاع کی قیمت 150 کروڑ کیونکہ
اب ڈائجسٹ کے صفحات پر روشنائی بھی اتنی ہلکی ہو گئی ہے

کہ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ "واصر" بے حد گھریلی، پر سکون سی تحریر۔ مگر "فیروزہ" کا کردار بہت مختصر سا رہ گیا۔ "نور القلوب" ہلکا خرافات پر مبنی۔ چھ اقساط سے زیادہ پڑھ ہی نہیں پائی۔ "مسریرا" فہرست میں نام موجود ہے مگر تحریر عماردا "زندگی تجھے گزاریں گے + ملا + دانہ پانی واصر جیسی دلچسپ اور زبردست تحریریں شروع کریں۔

"ہم اور بلبلیں" فردانہ کمرل کو داپسی مہارک امر تحریر (بہت محضرت) متاثر نہیں کر پائی۔ شاید کافی عرصہ بعد فردانہ نے لکھا بھی! بہر حال دوسری قسط پر بات چھوڑتے ہیں۔

"تم ملے" حبیب شیراز کی اچھی تحریر۔ اپنے گہری اہمیت بتاتی ہوئی تحریر۔ پلاٹ پر اتنا مگر گرفت مضبوط۔ ناولٹ "تیرے اقرار کا موسم" شاز یہ جمال طارق نے زبردست لکھا۔ مگر شاز یہ جمال اور حبیب شیرازی کی تحریروں کے پلاٹ انتہائی حد تک یکساں رہے۔ امریکہ اور لندن سے رشتہ داروں کا آنا، خود سر ہم دین کا رشتہ لینا اور پھر اصلیت پر اتر آنا۔ بہت حیرت ہوئی۔

افسانے کی من پسند دنیا میں قدم رکھا تو قرۃ العین غم ہاشمی "سیتی" لے کر آئیں۔ آٹھ صفحات پر مشتمل افسانہ تو نہیں ہوتا بہر حال اچھا سیتی رہا۔ ہر عورت ہی سرہل پر یکے کو ترجیح دیتی ہے مگر مشکل وقت میں پھر سرال ہی کام آیا۔

"میں ایک ساس ہوں" تحریر کے آغاز پر ہی بے اختیار چہرے رہے۔ حمیرا شفیق نے "نانا جوڑا" کا مدخل زبردست پیش کیا۔ مزا آ یا پڑھ کر اور دل پریشان بھی ہوا ساس کی الجھن کہ ہر جگہ ناکلی ہو فطال ہے نہ ہر جگہ سرہل ہی ہے۔

"فیصلہ" حمیرا گل کی فیصلہ کن تحریر۔ بہت ہی کمال کا افسانہ ہے۔ واقعی صبر اور اطراف والوں کو انعام بھی دیا ہی ملتا ہے۔ سیکھنے کا مقام ہے۔

"دراں ہمارا" لاٹ کے ساتھ حاضر ہوئی ہیں۔ مگر سوری تحریر بالکل سمجھ سے بالاتر۔ اللہ پر توکل کی تو سمجھا آئی مگر باقی سب باہم رہا۔ حتیٰ کہ تحریر کا عنوان کیونکر مطابقت

رکھتا ہے؟ "محبت یا عادت" ہاجرہ رحمان لے کر آئی ہیں۔ پڑھ کر مرد کی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ تحریروں کو الوداع کہہ کر "تکلیفیں خزاں ہیں" کا جائزہ لیا۔ خمار بارہ بنگوی، نوشی گیلانی کا انتخاب شاندار ہے جناب۔ "باتوں سے خوشبو" یہ سلسلہ پڑھ کر خود کو سنوایا اور نیکیاں کرنے کا موقع ملتا ہے۔

ج: پیاری صدف اناؤل کے سلسلے میں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ کوشش کریں گے کہ اگلا ناول آپ کی پسند کے مطابق ہو۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ ہمیشہ ہی بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں آپ۔

انک شئی سے سرت تنویر شریک محفل ہیں، لکھا ہے اس دفعہ تبصرہ کا شمار مینے کے اینڈ میں ملا جب لیتے کے لیے گئی تو یہی پتا چلتا تھا کہ سیلاب کی وجہ سے شمارہ اب تک نہیں پہنچ پایا اسی وجہ سے خط لکھنے میں دیر ہو گئی۔ عمارت باری تعالیٰ اور نعمت شریف کے بعد میں ہمیشہ سبکی شعلہ پڑھتی ہوں، آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہم شب کوں کر سیلاب زدگان کی مدد کرنی چاہیے۔ دستک میں راجا ماجد کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ خزانہ رشید ہوا۔ نسیم عرش کے بارے میں بھی بہت اچھا لگا۔ افسانہ لکھیں دفعہ بہت ہی زبردست تھے خاص کر انا۔ بھوتہ۔ ہری مرچیں۔ اور حساب برابر۔ بھوتہ میں بہت اچھا سیتی ملا۔

ج: پیاری سرت! آپ کا خط تاخیر سے ملا اس لیے اکتوبر کے شمارے میں شامل نہ کر سکے۔ اس شمارے میں علی شامل ہے۔ شعاع آپ کو پسند آئی ہے بہت شکریہ فیڈرل بی ایریا کراچی سے تشکر کوڑ لکھتی ہیں اس بار شعاع ہمیں 5 تاریخ کو ملا اور اپنی تقریب

خوب صوبی سے دل میں اتر گیا۔ افسانوں میں حمیرا شفیق نے میں ایک ساس ہوں بہت زبردست اور دلچسپ لکھا۔ سو فیصد حقیقت سے قریب اسٹوری نے مزہ دو ہالا کر دیا۔ شاز یہ الطاف کا ذرا سی بات بھی خوب رہی خاص کر اوہ گھوڑی والی بات نے حیران کر دیا کیا اس زمانے میں اتنے فرسودہ خیالات کی سوچ قائم ہے۔ ناولٹ میں حبیب شیراز کا من موہنا دلکش سا ناول تم ملے بے حد اچھا لگا۔ دلچسپ اور پیاری سی اسٹوری سے سہا ہوا ناول اے ون

رہا۔ اور اسی طرح ایک اور بیٹ ناول تیرے اقرار کا موسم بے حد شان دار لگا شاز یہ جمال طارق کو مبارک باد۔ اور ہاں حسین گل کا مختصر مگر بہترین افسانہ فیصلہ بھی لائق تعریف رہا۔

تاریخ کے جھروکوں کو امت بصورت بہت اچھا مرتب کر رہی ہیں۔ ہمیں یہ سلسلہ پسند آتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس ہار بھی باتوں سے خوشبو آئے دل میں گھر کر گیا جیسے آخرت کے خوف کی فضیلت۔ اللہ سے شرم، چھینک میں الحمد للہ اور حدید سائنس۔ روزی دینے والا۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ کتنا اچھا تحریر کیا ہے اتنی اچھی باتیں ہمارے لیے کسی بیش بہا خزانے سے کم نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ضرور آپ سب کو جزائے خیر دے گا۔ ان شاء اللہ

سب سے دلکش منفرد پیارا سلسلہ تو خط آپ کے ہے۔ تمام قارئین ہمیں اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔

ج: پیاری نسیم! آپ ہم سب کو، ہماری قارئین کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔ یہ بہت قیمتی بلکہ قیمتی ترین تحفہ ہے ہمارے لیے۔ ہمارا یقین ہے کہ دل سے نکلی اور بے لوث دعائیں اللہ پاک ضرور قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آمین

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔ بہت شکریہ

زرینہ خانم لغاری نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے "تمہ سے ماما جوڑا" اف کوئی بہن تو سبھی ہو کسی کے سسرالی انسانیت کے دائرے میں ہوں۔ ویسے یہ بھی ہے جو ہمیں سکھ کی زندگی گزار رہی ہیں انہیں کیا ضرورت ہے اپنے حالات لکھیں۔ یہ تو دمگی نہیں ہیں جو دل کے پھپھوٹے پھوڑتی ہیں۔ غزالہ رشید سے ملاقات ہوئی۔ کچھ سمجھ نہیں آئی ایک سوال تھا شادی ہوئی پیار محبت ہوا پھر رشتہ ٹوٹ گیا کیوں؟ لیکن پوری روداد میں انہوں نے اپنے میاں کے ساتھ خوش گوار وقت کا تبصرہ کیا۔ سا لگ رہا مٹائی پھر یہ کیسے ہوا جب رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

واپس متاثر نہیں کر رہی۔ نور القلوب کی آخری قسط آنے والی ہے خوش اور لاریب کے تعلق کو خوش گوار بنا دیں۔ سرسرا آپ نے حماد اور ہارون کو مار کر بہت قلم

کیا۔ اعظم شیرازی کا سارا اظہار ختم ہو گیا۔ جس بچے کو بار بار دھکارا گیا تھا قدرت نے اسے اعظم شیرازی کی جائیداد کا وارث بنا دیا یہ دنیا سنی ظالم ہے گئے ماموں نے اگلوتے بھانجے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چنید لاشاری کو عرق نہیں پھانسی لٹنی چاہیے، دو بے گناہوں کو قتل کیا تھا۔ حساب ہمارے نے اسے پر مجبور کر دیا ایسے کو تیسالٹنا چاہیے۔ ہری مرچیں ایک سفید پوش گھرانے کی کہانی ہے، مامیں تمام بچوں کو سالن دے کر اکثر ہانڈی کا بچا کچا کھائی ہیں باتوں سے خوشبو ایک خوب صورت سلسلہ ہے، طرد حکمرانی سب سے زیادہ پسند آیا۔ کھٹا کسی بہترین شعروں سے حیرن صفت تھا۔ آئینہ خانے میں پسند نہیں آیا۔ مصحف کے متعلق تفصیل جان کر خوشی ہوئی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ہمدی کے فوائد سے آگاہی ہوئی۔ تحریم قاطر کا شعر بہت پسند آیا۔

ج: پیاری بہن! تمہ سے ماما جوڑا ہے سلسلہ ان بہنوں کے لیے عی شروع کیا ہے جن کو سسرال میں مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا یا جنہوں نے اپنے حالات بہتر بنانے کے لیے کوشش اور محنت کی۔ اس سلسلے کو شروع کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں دو مقاصد تھے ایک یہ کہ ان لوگوں کو احساس دلایا جائے جو کسی لڑکی کو بیاہ کر لاتے ہیں اور اس کو بیٹی یا بہو کا مقام تو کیا انسان ہونے کی رعایت بھی نہیں دیتے۔ دوسرے جو بہوویں ان حالات سے نہیں گزریں، وہ ناشکری نہ کریں بلکہ اپنے سسرال والوں کی قدر کریں۔

اترودھ میں آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مایاب جیلانی کا اترودھ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے میاں سے طہر کی کا ذکر کیا ہے۔

غزالہ رشید اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔

نجمہ جبار نے بھاول پور سے ای میل کی ہے لکھا ہے مجھے یاد ہے کہ سب گھر والے ایک طرف ہوتے اور نجمہ گھر کے اوپر والے کمرے میں گری ہو یا سردی اپنی من پسند چیز جو اس وقت سے اب تک عزیز ہے یعنی رسالے ساتھ ہوتے تھے رسالے کی وجہ سے ایک ڈیڑھا

ابھی تک یاد ہے کہ بہت شوق سے ایک بار ڈائجسٹ لے کر اسکول میں گئی کہ بریک میں پڑھوں گی مگر ایک پھر ہوا تو پھر کو آنے میں دیر ہوئی اور میں کتاب میں رسالہ کھول کر پڑھنے لگی اور ساری جمع کلاس سے بے خبر اچانک مسکریچھے سے آئیں اور دروازہ اٹھا کر پڑھنا یا تو اس کے بعد بھی ڈائجسٹ اسکول میں نہیں لے کر گئی اور امتحان کے دنوں میں بھی پیپر کے دن تازہ شمارہ آجاتا تو میرا سب چھوڑ کر صرف اپنے پسندیدہ سلسلے دار ناول کی اگلی قسط پڑھنا اور باقی پیپر دے کے بعد یہ نہیں کہ پڑھائی کا شوق نہیں تھا بلکہ پڑھائی اور اس کے بعد جاب بھی اپنی مرضی سے کی۔

یقین کیجئے کہ اس بار کا شعاع مجھے سچ کہوں تو سالگرہ نمبر سے بھی زیادہ پسند آیا کہ دلکش سرورق اور اندر بہت منفرد اور الگ موضوع پر دلچسپ تحریریں ہاں مجھے شعاع کی اس بار تحریریں، ہی زیادہ پسند آئیں۔ ہر چیز دوسرے سے الگ ہوتی ہے کہ اس لیے تو جیسا شعاع ہے یہ ہمیں ایسا ہی پسند ہے۔ کاش آپ شعاع کو 150 کا کر کے صفحات 258 ہی کر دیں اب میں تم سے کوئی فرق نہیں پڑتا پھر پڑھنے والوں کو بھی اس مشکل وقت میں ادارے کا ساتھ دینا چاہیے کہ یہ ڈائجسٹ ہمارے پاس اس کٹھن وقت میں آ رہے ہیں، یہ ہی کافی ہے۔

سرورق بہت ہی اچھا تھا پچھلے ماہ سے زیادہ اچھا ہاں کبھی سر سے پاؤں کا بھی سرورق دیں۔ آپ کی ادارے میں باتیں بہت ہی آسان اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ غزالہ رشید سے ملاقات بہت اچھا لگا ہاں یہ جو اداکار سے ملاقات تھی پسند نہیں آئی کہ اس کا کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا اب ہم رہے پرانے ڈرامے کے شوقین تو نئے ڈرامے پسند نہیں آتے اور بس پڑھ لیتی ہوں یہ ہی کافی ہے۔

داؤد اور مندل بی بی میاں بیوی تھے تو یہ بہت ہی حیرت انگیز بات ہوئی واقعی رائٹر ہم پڑھنے والوں سے بہت آگے کا سوچتا ہے۔ اچھا تھا ناول۔ امت المعزز کے ناول کا انداز مجھے بہت پسند ہے بر جگلی اور لفظوں کا چناؤ بہت الگ ہے ہاں قسط بہت ہی چھوٹی سی تھی۔ آتش کا ذکر زیادہ کیا کریں۔

کھل ناول میں نعیمہ از سلطان کا اتنا پسند آیا کہ کیا بتاؤں اور شعاع والوں پر پیار کا اتنی زبردست تحریروں کا ہر ماہ انتخاب تو ہمیں پیسے وصول ہو جاتے ہیں۔ ناول میں حراجہ انداز اور بھائیوں کا بال سر پر نہ ہونا اور لمبی خفاق نے ناول کو خوش گوار بنادیا۔ ہر ماہ ایسا ناول دیں۔ دوسرا ناول ”بر سے گانوٹ کر“ بھی بہت اچھا تھا اور ساس مندوں کو ناول کے آخر میں حل آئی بہت کم وہ بھی۔ مجھے ہیروئن کے دیور رضا کا کردار بھی بہت پسند آیا۔ ساس تو بہت ہی بری لگی، یہ تحریر بھی اچھی تھی بہت۔

اب آپ کہیں کی کہ تعریف ہی تعریف مگر کیا کروں کوئی خامی نظر نہیں آرہی ورنہ میں تو خامیاں نکالتی ہوں۔ شاز یہ الطاف نے اچھا سبق ناول میں دیا، شاز یہ اب طویل تحریر بھی لکھیں، وافسانہ ”میں ماں ہوں“ بہت منفرد سا تھا۔ حمیرا عروش نے بھی اصلاحی تحریر دی، سگی خالہ نے ایسا سلوک کیا اپنی بھانجی کے ساتھ حد ہے ویسے۔ ”ہری مرچیں“ افسانہ بھی منفرد اور اصلاحی رہا، ہاں مجھے تو خود ہری مرچیں بہت پسند ہیں خاص کر ان کا اجار۔ حساب برآمد میں لڑکے نے ہالکلی سچ کیا۔ ”انا“ افسانہ بھی تلخ مگر بہت پاورفل تھا۔ ہاں واقعی اکثر ہر بات میں اناج میں آجاتی ہے خونی رشتوں میں بھی۔ حسہ کا ناول بھی ختم ہونے والا ہے اور یہ یاد رہے گا کہ اتنا اچھا جو ہے بس اب جنت اور قاریس کو سکون ملے آگے ہاں مجھے بہت انتظار ہے۔ اگلے قسط دار ناول کا تو پلیز اب کوئی آئیڈیا یا اشارہ دیں بتادیں کاش محبت سیما ہوں یا افشاں آفریدی کہ میری پسندیدہ ہیں۔ اور اس بار ماشاء اللہ تاریخ کے جھروکے میں مصنف سے متعلق بہت قیمتی باتیں ملیں۔

بیاری نجمہ! آپ ہمارے مستقل قاری ہیں اور خط بھی بڑی باقاعدگی سے لکھتی ہیں۔ تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود آپ کا خط شامل ہے۔ آپ نے بہت تفصیل سے اور بہت اچھا تبصرہ کیا تہہ دل سے شکریہ۔ رضوانہ قاسم کرلاں ہری پور سے شریک محفل ہیں،

خط میں نے اپنی امی کو پڑھ کر سنایا میں اب کام نہیں کر سکتی ہاں۔ بس نماز پڑھی اور اب خط لکھ رہی ہوں۔ اس

اجما نہیں کیا ایڈیٹر، مندرجہ ذیل نے اپنی جی کو جی نہیں سمجھا اور نہ ہی اس سے ملنے آئی۔ زہرہ کے ساتھ انصاف خوش حال نے کر دیا۔ اتنی غلطی نہیں تھی۔ یہ نہیں بتایا حویلی پتا کرنے کون کیا تھا۔ نائی شاہد بھی میرے خیال میں۔ اور نہ ہی گلے کو بتایا کہ کیا ہوا ہے۔ اس کا ایڈ نہیں اچھا ہوا۔ "میرا" کا کھل ناول میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس دفعہ نہیں آئی۔ کہانی۔ "آئینہ خانہ میں" حدیثہ کیانی آپ نے تو اچھا ہی سوچ کر شادی کی۔ لیکن پھر آپ کے شوہر نے ہی آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن آپ ہی اپنا گھر بچا لیتیں۔ گاگا کا اتنا ضروری تو نہیں تھا۔ "تاریخ کے جہر و گوں سے" یہ باتیں اچھی لگتی ہیں۔ اگلے مہینے کی 15 تاریخ کو میرے خالہ زاد میر کی برتھ ڈے ہے چکی برتھ ڈے میرا جیروں خوشیاں نصیب ہو تمہیں (آمین)

بیاری رضوانہ! تفصیلی خط کے لیے شکریہ مندرجہ ذیل کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے۔ جسے عظمت کا خط ہے۔ وہ خود کو دوسروں سے افضل سمجھتی ہے اور چاہتی ہے کہ سب اس کی تعظیم کریں۔ اس کو عقیم سمجھیں۔ اس کے اشاروں پر چلیں۔ ایسی عورت کے لیے رشتے، ذمہ داریاں، شوہر اور بیٹی ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے پوری زندگی سب پر حکومت کی۔ سب کو اپنا غلام سمجھا۔ اب اپنی سرشت سے کیسے ہٹ جاتی۔

گلے کا انجام اچھا ہی ہوا۔ اس کا شوہر اس کی طرف لوٹ آیا۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ خوش حال بھی خوش اور مطمئن ہے۔ اور لاریب کو بھی مشکل آگئی ہے۔

جہاں تک شادی بیاہ کی رسموں کا تعلق ہے۔ یہ خوشی کے لمحات کو طول دینے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس میں بے جا اسراف اور نمود و نمائش بری چیز ہے۔ دیکھیں بری نہیں ہوتیں یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے بھائی بہت اچھے ہیں لیکن دنیا میں سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ اپنی امی کو ہمارا سلام پہنچادیں۔

رمشاروشن نے الہ ہاد سے لکھا ہے
سب سے پہلے مصباح علی سید کے ڈراما میریل
"میرے ہم نشین" کا ذکر کروں گی جو ان کے ناول "دیکھو"

دفعہ شعاع 10 تاریخ کو مل گیا۔ ناول اصول شمع اچھی لگی۔ پہلی شعاع پڑی۔ عابد صاحب کو اللہ جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) حمد و نعت دونوں پڑھیں "بیارے" امی کی بیاری باتیں "بہت ہی بیاری" جب تم سے مانا جوڑا ہے "پڑھا۔ بھائی تو بہنوں کا اتالا کرتے ہیں نگرے اٹھاتے رہیں۔ میرے بھائی میرا اتالا خیال کرتے ہیں۔ آپ کی بہن ٹی وی دیکھتے کرسی کے نیچے چھپ گئی۔ یہ پڑھ کر ہنسی آئی۔ میرے بھائی بہت ہی اچھے ہیں۔ رسالے لا کر دیتے ہیں۔ اور خط بھی پوسٹ کرتے ہیں۔ "تفصیل قیصر سے ملاقات" بہت ہی اچھی لگی۔ آپ کو بیٹے کی بات پکی ہونے پر مبارکباد، میرے بھی بڑے بیٹے کا نام احمد ہے۔ مجھے تو بہت تنگ کرتا ہے۔ کیا آپ کا بیٹا چھوٹا تھا تو آپ کو بھی تنگ کرتا تھا۔ بیٹے کی شادی کے بعد بھی انٹرویو دیتا ہے۔ لازمی۔ آپ کوئی رسم نہیں کریں گی۔ لیکن حرا تو تب سے ٹی وی ڈراموں پر اتنی رکیں دکھائی جاتی ہیں۔ ان کو بند کرنا چاہیے۔ آپ سے ملاقات بہت ہی اچھی لگی۔ "خط آپ کے پڑھے کیونکہ یہ سب دوستوں، بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ سب کے ہی خط بہت اچھے ہوتے ہیں۔ عائشہ قیوم! پیشیاں واقعی بہت بیاری ہوتی ہیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن انہیں اسے گھر کا ہونا ہی ہے میں نے اپنی امی کو پہلے تو تنگ نہیں کیا لیکن اب شادی ہونے کے بعد جب سے بیار ہوئی وہ جیسے خیال کر رہی ہیں۔ کوئی نہیں کر سکتا، لیکن اب انہیں بہت قصہ دلانے لگ گئی بچے تنگ کرتے ہیں نا۔

میری امی کے لیے دعا ہے۔ میری امی ہنسی مسکراتی رہیں اور کسی کی محتاج نہ ہو (آمین) "والعصر" پڑھا۔ یہ عامر اپنے بھائی کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے کیا دھنسی ہے۔ میمنی کے ساتھ۔ داؤدی بیگم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ سہراب کچھ ٹھیک لڑکا نہیں لگ رہا۔ اگر اسے درنی کے ساتھ محبت ہے۔ تو رشتہ کیوں نہیں بھیج رہا ہے طریقے کے ساتھ درنی کے ساتھ۔ سہراب وقت گزاری کر رہا ہے۔ درنی پر بہت قصہ آتا ہے۔ جب ملاقات کرنے جاتی ہے۔ "ڈراما" بات "جب اپنی بیٹیوں کے ساتھ برا ہو۔ ساس بہو کے ساتھ ٹھیک ہوتی ہے۔" "نورا مقلوب" بھی ایڈ ہو گیا۔ لیکن

خدیجہ کو سزا نہیں ملی تھی اور پھر گلے کا بچہ بھی فی الحال اس دنیا میں نہیں آیا۔ ایسے میں کہانی ختم بالکل بھی حیرت نہیں آیا اینڈ میں۔ خوش اور لاریب کی خوش گوار زندگی پر دو چار منٹ تو بچتے تھے نا۔ "میری سیرا" غائب! لیکن ہارٹ بیٹ مس کرنے کے لیے فرزانہ کمرل تشریف فرما ہیں۔ او بے بے! حیرت آگیا۔ فرزانہ آئی! آپ ہی بتادیں آپ کہاں رہتی ہیں؟ کیا نام ہے؟ "ہم اور بلبلیں" امیزنگ اسٹوری۔ اگلے قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ اب غائب نہ ہو جائے گا۔ پلیز!

"تم ملے" جیبہ شیراز کا ناول اچھا لگا۔ "تیرے اقرار کا موسم" اور "تم ملے" میں کافی چیزیں مشترک تھیں۔ ایک میں امریکن پلٹ پھپھو اور بھانجا تو دوسرے میں لندن پلٹ لیکن ہاری تاپا زاد ہی لے گئے۔ ڈیجیٹل ساری کزنز اور دادی ماں کا رنگ لیے یہ کہانیاں زبردست لگیں۔

"محبت یا عادت" میں مسئلہ اینڈ پر بتایا گیا کہ بیوی کو محترم نے خود مارا تو ہو کر بھیجا ہے۔ ورنہ میرا تو خیال تھا

تمنائے روشنی پر مٹا ہے۔ بہت پسند آرہا ہے سب کو اور پھر ہم نے تو جو شیخیاں بگھاریں کہ یہ ناول میں نے بڑھا ہوا ہے۔ سب کو اینڈ بھی بتایا۔ لیکن اینڈ دیکھ کر میرے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے درخزنی مرگیا اور ہادی اور بخت کی شادی۔

دس ازناٹ لکھ۔ مجھے اینڈ پسند نہیں آیا۔ بلکہ میری ای کو بھی اعتراض ہے اینڈ پر۔ خیر ہائی سارا سیریل سو پر ڈوپر تھا۔

رسالے کی طرف آتے ہیں۔ نائٹل خزاں کی آمد آمد کا اعلان کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ پیلا پیلا ورق اس پر سرخ رنگ زیب تن کیے ناول اہول، خزاں کا پس منظر معلوم ہو رہی تھی (پیلے رنگ کی وجہ سے)

"پہلی شعاع" کے تو ہم گرویدہ ہیں۔ رضیہ آپی حقیقت کا پردہ چاک کرتی نظر آئیں کہ اب امداد کا شور واقعی مٹا دیا گیا ہے۔

ادارہ کے کارکن عابد صاحب کی مضرت کے لیے بھی دعا گو ہیں۔ "عمر ولعت" اس ہارڈی صاف شفاف اور خوب صورت انداز میں پرنٹ کی گئی تھیں۔ دل خوش ہو گیا۔ "پیارے نی کی پیاری باتیں" بہت سے حقائق سے جانکاری کا سبب بنیں۔ جزاک اللہ!

"دسک" بھی ناول ہی لگا۔ شاہین آپی! آپ پھر سے رائٹر کی لائن چھوڑ کر شوہر کی طرف آگئی ہیں۔ پلیز چھوڑیں یہ شوہر ہمیں ہماری رائٹرز سے ملو! میں بس۔ پلیز پلیز پلیز!


"نانا" کچھ ادھر سا لگا۔ جیسے بہن نے سب کچھ کھل کر نہ بتایا ہو۔ "والہصر" کی رفتار تیز تھی۔ اس کے بارے میں اندازے لگانے کے لیے میری زبان پھر سے سلب ہونے کو ہے تاب ہے کہ یہ شرر 60 پرسنٹ میسٹی ہے۔ 38 پرسنٹ عباد یا صلاح اور 2 پرسنٹ سہراب ہے۔ اور خولہ رہا ہے۔ (کوئی رو تو نہیں گیا؟ ۱۱۱۱)

احل عزیز آپی! اس بار کچھ میری عزت کا خیال کر کے میرے اندازوں سے ہم ردی دکھائیے گا۔

"نور القلوب" کے اختتام سے دل میں خشکی سی رہ گئی ہے۔ زہرہ والا معاملہ ابھی بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔

شپ گزیدہ

عنبرہ ہبید



قیمت 300/- روپے
25% ڈسکونٹ
قیمت 225/- روپے

داک فری

پاکستان میں کبھی کبھی پڑھیں اور کبھی لکھیں

دستی فری ہبید ہبید اک مٹوانے کے لئے

کتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اندھارا کراچی فون: 021-32216361

کہ خدا نخواستہ مر رہی گئی ہے۔ جیسے یاسیت سے وہ سوچ رہا تھا۔ گاؤں والے ایسے مردوں کو پتا ہے کیا کہتے ہیں؟ دن مریدا (ہاہاہا) "فیصلہ" بھی اچھی تحریر تھی۔ "لاٹ" انتہائی مختصر اور کچھ ادھوری سی تحریر لگی کہ صالحہ کے زندگی کے اوراق کو پلٹ کر اس کی مایوسی کی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی۔ "میں ایک ساس ہوں" حمیرا شفیق نے ساسوں کا دل جیت لیا (ہاہاہا) "سبتی" زبردست تھا۔ باقی سب سلسلے اسے دن تھے۔ اور ہمارا "مسکراہٹوں" کا صفحہ بڑب کر لیا ادارے والوں نے سوسائڈ، فزولوں کا ایک صفحہ کم کر دیں چاہے (کیونکہ میں تو شعر و شاعری کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہوں) لیکن مسکراہٹیں نہ چھینیں ہماری ہم سے اچھا! "مخلط آپ کے" صدف ناصر کو صرف مٹھائی کھلانے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ کچھ دن صبر کریں۔ دھڑے میچے میں ہماری شادی ہے۔ مہنا زراں کے شہر مانا نوالہ میں ایک گرینڈ سی پارٹی دیں گے۔ (مانا نوالہ ہمارا متوقع سسرالی شہر ہے) سو برا ظفر آپ میواتی ہیں ناں؟ بتائیے گا ضرور اور آپ کوٹ راولکھشن کے قریبی گاؤں سے رہتی نا۔ وہیں سسرالی نام کے گاؤں میں میری پھوپھی اور خالہ رہتی ہیں۔ کبھی آتا جاتا ہوا تو آپ کو ضرور ملاشوں گی ان شاء اللہ) سب کے تبصرے جان دار اور شان دار تھے۔ پیاری رمشا! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ نور اقلوب کے اینڈ میں آپ کو شکلی محسوس ہوئی۔ ہماری کچھ قارئین نے بھی یہ شکایت کی ہے کہ نور اقلوب کو جلد ختم کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ قارئین کو نور اقلوب بہت پسند تھا۔ اس کا اتنی جلدی ختم ہو جانا قارئین نے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔

مسکراہٹیں کا سلسلہ آپ کو پسند ہے، کوشش کریں گے کہ اس سلسلے کو ہر ماہ ضرور شامل کیا جائے۔

زلزلہ مزل کجمر نے احمد پور شہید شائع بھاول پور سے شرکت کی ہے، دیکھتی ہیں

سلسلے دار ناول نور اقلوب اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس میں کچھ کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ جیسے ہرہ کا کردار اور دانا و دمنور کا کردار اور تو اور مندل بی آسانی سے فرار ہو گئی۔ اسے اس کے کرموں کی سزا ملنی چاہیے تھی۔

چلیں خیر.....! بے ٹکاسا اینڈ تھا۔ واکٹر میرا موسٹ لیورٹ ہے۔ ہر قسط اتنی مختصر ہوتی ہے کہ شروع کرتے ہی صفحہ پلٹوں تو باقی آئندہ ماہ لکھا منہ چڑا رہا ہوتا ہے اور یہ درٹی کیا کرتی پھر رہی ہے۔ سہراب کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ امت العزیز شہزاد سے درخواست ہے کہ اب کرداروں کی گرہ کھول دی جائے۔ اتنا تجسس، انف.....! یہ کیا اس ماہ "عسر میرا" غائب کیوں بھی؟ زبردست ناول ہے۔ قاریں وجدان کے ساتھ بہت ملال ہوا۔ اس کا بچپن مار دیا گیا۔ پلیز راحم آفاق جیسے اٹھلی جنت فحش کی ہیروئن بھی ہونی چاہیے۔

مگر فہرست میں فرزاد نہ کھل کر دیکھ کر دل شاد ہو گیا۔ دوسری قسط پڑھ کر ایک ساتھ تبصرہ کروں گی۔ کل ٹیسٹ ہے تو اس لیے نہیں پڑھ سکی۔

"ٹم ٹم" جیب شیراز لٹکا ہے جی کوئی رائٹر ہیں۔ بہت اچھا ناول ہے۔ ہلکا پھلکا، مزہ آیا پڑھ کر اور شاز یہ جمال طارق ویل ڈن بھی! "تیرے اقرار کا موسم" مزے کی تحریر تھی۔ ناول اور ناولٹ ایک جیسے ناپک تھے۔ دونوں کی ہیروئنیں شرارتی چلی تھیں۔ اب بھی باقی کا شمار ابھی نہیں پڑھا۔ اسی سر پر آگئی ہیں کہ سالن بناؤ۔ تو ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہم آپ سے کچھ کہنا چاہیں گے۔ میں مطلب زلزلہ مزل کجمر "شعاع ایوارڈ شو" کے نام سے سلسلہ لکھنا چاہتی ہوں۔ جس میں میں پورے سال کے ناول، ناولٹ اور افسانوں پر تبصرہ کروں گی اور پوزیشن دوں گی۔ اور آپ کو دسمبر میں ارسال کر دوں گی۔ اگر جنوری 2023 کے شمارے میں آپ اسے شائع کریں تو لکھوں ورنہ شاید ہی فضول جائے گا۔

پیاری زلزلہ آپ شعاع ایوارڈ شو ضرور لکھیں تبصرہ ارسال کر دیں۔ ضرور شائع کریں گے۔ آپ کا پچھا اخطا اس لیے شائع نہ ہو سکا کہ وہ ہمیں تاخیر سے موصول ہوا تھا۔ آپ کے خط میں کوئی خرابی یا غلطی نہیں تھی۔

ناولٹ اور افسانہ کے لیے محذرت آپ کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔

☆☆

والعصر

- درہائی اپنی مانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مرہکی ہے۔ مگر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپر، میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔ جو درہائی کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی تنگدستی سے ڈر کر مانتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔ لی ریل ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ مانی درہائی کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آ جاتی ہے۔ پولیس کا نام سن کر بی ڈی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جو نیر قاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو ترمیمی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ قاروق احمد تھوڑا سا ہے۔ عباد درہائی کو پڑھانے پڑھاتے ہیں مانی بتاتی ہے کہ وہ کبائن امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر بجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شہزادہ کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔ شاکر فیروزہ کا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر مقرر کر دیا ہے۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔ فیروزہ کا چھوٹا بیٹا مہر بہت خود مر ہے۔ وہ بیگنی سے بہت تڑپتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر بیگنی کو بالکونی سے نیچے پھینک دیتا ہے۔



ورٹی کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میسٹی سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔
بی ڈی کو آکس فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کر کے دیکھے علاقہ سے متعلق خبر آرہی ہے۔ پتا
چلتا ہے کہ علاقہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔

ورٹی پھر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے صلاح چھوڑنے جاتا ہے، واسطہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔
اینا عامر سے کہتی ہے کہ میسٹی سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروادے۔
سید صاحب کو جب سے عامر نے میسٹی کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت
پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

جلدی سے پھر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔
آتش چھوڑنے کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل
جاتا ہے کہ وہ فون کر لی دوسری طرف فون اٹھا لیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر
ملائی ہے اس وقت کوئی اسے نہ دیکھتا ہے۔

شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور عامر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر
ہنستا ہے۔ قاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ ملا جان کے گل کے بنانے آتش کدہ سے ملتے ہیں۔
نامر، میسٹی سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کرنا کبھی کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو
سخت ست کہتی ہیں اور میسٹی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ میسٹی واپس آکر عامر سے اس کا جرم عتاب ہوتا ہے۔
بی ڈی اپنا پروموشنل ٹریپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارکس کتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک
فون آتا ہے۔ وہ علاقہ خان گل کیس کے سلسلے میں بی ڈی سے بات کرنا چاہتا ہے بی ڈی خوف زدہ ہو کر لائن
کاٹ دیتی ہے۔

شا کر کی بیوی فرح میسٹی اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ
ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کینیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں
بات کا کہتی ہے۔

ورٹی ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ ورٹی حامی
بہر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی نے سامنے میسٹی آ جاتے ہیں۔ ورٹی ڈر جاتی ہے۔

چودھویں قسط

اسدب.....!

اے غمی نوع انسان کے دب!

اے زمین و آسمان کے دب!

اے ہر "جان" و "بے جان" کے دب!

اے یمن سلیمان کے دب!!

(اے یمن سلیمان اے شک وہ منتا ہے ہر پکارنے والے کی پکار)

وہ زبان جو خورِ حمد گی، وہ شکوے سے تر ہوئی

(پر شکوے سے بہتر مبر ہے... مبر، جوا جرات ہے)

وہ دل، جو تیرا مسکن تھا، وہاں سناٹے نے ڈیرا ڈال لیا۔

(ہاں..... وہیں تو گھات لگائے بیٹھا تھا، تمہارا عددو)۔

اور وہ نعمت کہ جن کے ذریعے میں نے ہر سو تجھے دیکھا، اب تیرے دیدار سے قاصر ہوئیں.....

(وائے افسوس کہ اندھیرا جن لیا تم نے)

اور میں نے جانا کہ میری ہر صدا، تیرے نزدیک بے لواء ہے.....

(افسوس..... صدا افسوس)

سو میں نے اپنے "پہلے ہاتھ" آج سے پہلو میں گرا دیئے.....

(تو تم سے بڑا ظالم اور کون ہوگا؟)

اور میری نظر، عرشِ بریں کو اب امید سے نہیں بچتی.....

(حالانکہ "وہ" تمہیں دیکھ رہا ہے)

کہ احساس ہوا ہے..... میرے لیے وہاں اب کچھ نہیں.....

(افسوس..... صدا افسوس!)

سو آج سے میں اپنی تنہائی کا اعلان کرتا ہوں.....!!

(اے ابنِ سلیمان..... یاد دہانی ہو کر مایوسی کمر کے سوا کچھ نہیں).....!

☆☆☆

"امی نے جیسی کو کچھ نہیں کہا..... الٹا مجھے ہی ڈانٹنے لگیں کہ میں ہر وقت چھوٹے بھائی کے پیچھے لگا رہتا ہوں۔"

لان چیمز پر بیٹھے بیٹھے اس کی شاذ و نادر جڑنے والی پلکیں اس وقت بند تھیں..... سو یہ منظر اس پر قسمت سے

مہربان ہونے والی نیند میں خلل انداز نہ ہونے کا ارادہ کیے دے پاؤں، بس یوں ہی از خود غالباً خود کو دہرانے

کے لیے درود پوار پر منعکس ہو گیا..... جہاں عامر اس وقت بڑی بہن ہالی کے ہاں آیا بیٹھا، دل کے پھپھوٹے

پھوڑنے میں مصروف دکھائی دیتا تھا۔

ہالی کے بد دماغ، تحصیل شوہر نام دار ابھی دفتر سے نہ لوٹے تھے اور اوپر تلے کے چاروں نمونوں کو مار کوٹ

کر انہوں نے در سے بھیجا ہوا تھا۔ سو وہ خاصے المیہ نشان سے کم چینی اور برائے نام بھتی والی چائے کی پیالی عامر

کے سامنے رکھ کر اس کی چٹا خاصے ذوق و شوق سے ہمد تن سننے میں مصروف تھیں۔ عامر چائے کا گھونٹ بھرنے کو

ڈرا تھا تو درمیان میں وہ جلتے کتے سے لہجے میں بول پڑیں۔

"امی کو تو لگتا ہے بس تین ہی اولادیں ہیں۔ ایک بھائی جان، دوسرا وہ بیٹی اور تیسری شانی..... ہم سے تو

چھپاتی ہیں۔ مگر ہم بھی جان ہی لیتے ہیں کہ اس کے لیے آج کل اونچے گھروں میں رشتے دیکھ رہی ہیں۔"

"ہاں....." وہ بد مزہ چائے کا گھونٹ بھرنے کے سبب کڑوا ہو جانے والا منہ مزید بگاڑ کر بولا۔ "رشتے تو

لفٹی اور شانی دونوں ہی کے لیے تلاش کر رہی ہیں۔"

"واہ..... واہ..... واہ..... واہ....." وہ جلیلا کر بری طرح ہاتھ بچا کر بولیں۔

"ان مہارانیوں کے لیے رشتے تلاش کر رہی ہیں اور ہمیں اٹھا کر جیسے تیسے بیاہ دیا۔ کوئی عمر تھی ہمیں

رخصت کرنے کی..... پھر کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہوتا تو بات بھی تھی۔" وہ رو ہانسی ہی تو ہو گئیں۔

"جج....." وہ آنکھوں میں تبسم لیے بظاہر بڑی ہم دردی سے بولا۔ "واقعی بہت ظلم ہوا آپ کے ساتھ۔"

"تم ہی بتاؤ....." وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ کر بولیں۔ "ہم کوئی عیب دار تھے یا کہیں بھانجے

جار ہے تھے جو جلدی چا دی۔"

"امی تو ہیں ہی ایسی۔" وہ بچے پر ہنس کر ہنسنے لگا "میں اور آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔ بھائی کو بھی انہوں نے بہت مھوٹ دے رکھی ہے۔ آج بھی نیکی کی ہو لیں گی۔"

"اے لو۔" بانی صدمت سے گھر گئیں۔ "آج بھی ہلی گئیں۔ اور ایک ہم ہیں۔ حق ہا۔" دارے وہاں تو پھنسی کے دن بھی نیکی لانے میں ناک پڑ جاتے ہیں۔ شاپنگ دوپٹے کرنے لگی ہوں گی۔ "آنے والے" کے لیے اور کس لیے جائیں گی۔ "بولتے بولتے آخر میں قیاس آرائی کی۔ جس پر مامرنے کندھے اٹکا دیے۔"

"خیر۔۔۔ تم ظرمت کرو۔۔۔ ہم گھر آئیں گے تو بات کریں گے امی سے۔۔۔ کہہ دیا ہے۔ پھنسی کو شادی بلی جاری ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ضرور کہیں گے۔" وہ تو ظاہر ہے، یہاں کرنے کی ذہنی خوری آیا تھا سو خوش ہو کر ہوا۔ "کچھ کھانے کو دل چاہتا تو بتا دیا کریں۔ میں اداوں گا۔"

"ہاں پاکستان چوک سے بہاری کباب لانے دو، ہم کو۔۔۔ بہت دن سے کھائے نہیں ہیں ہم۔"

digest novels lovers' group

"سر۔۔۔ سر مینی۔۔۔" "کون سر مینی؟" "سہراب نے قہقہے سے پوچھا۔۔۔ وہ تھراں تھا کہ یکا یک اس پری وشن کے چہرے پر غیہ کیوں چھائی۔

"وہ پھنسی پھنسی ہی آواز میں بولی۔" وہ جو سامنے کھڑے ہیں۔"

"سامنے کھڑے ہیں؟" اور سامنے کھڑا جوانی بظاہر ہر سکون کرنا ظہور گاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اور جس پر سہراب کی نظر اب پڑی تھی۔ وہ ہر سہراب کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اور نیکی کی جانب نہیں بلکہ سہراب کی سمت آیا تھا۔

"صاف کا بیٹا۔ سہراب خان۔۔۔" اس نے اپنی گھنے بالوں سے الٹی مضبوطی میں کھائی گاڑی کی کھلی کڑی پر آرام سے بچھاتے ہوئے سر سراتے لہجے میں خدا جانے اسے پکارا تھا یا پھر کوہ "اور" کرا لیا تھا۔ سہراب سمجھ نہیں سکا۔ وہ نہ ٹھانڈے بھرے راہ انداز سے تھا۔

"تم ا۔۔۔" وہ اب اس نے محض اس "تم" پر اکتفا کیا مگر لہجے میں جو زہر آلود غمزدہ ہو رہا تھا۔ وہ اس "تم" کا ہر راہ اسباق و سہاق بیان کرتا تھا۔

"ہاں میں۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "تو تم از نہیں آئے اپنی حرکتوں سے"

"میں تمہارے۔۔۔ نہیں لگنا چاہتا۔" وہ سخت لہجے میں آگیا اسے ہنر کر بولا۔

"ہو بیچے۔۔۔"

"تم جانتے ہو کسی کو چاہی کے وہاں پر دیکھ کر بے شرموں کی طرح بیچے ہٹ جانا میری سرشت نہیں۔" یہ جواب کو کہہ تو قح تھا مگر پھر بھی سہراب بھر گیا۔

"کہو اس بندہ کو دور، تو یہاں سے۔"

"نئے ساتھ بھاری کھا ہے، اسے باہر لٹاؤ۔" وہ سہراب کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر تندی سے بولا۔

"اے۔۔۔" سہراب اسے "ہٹا" نہ دیکھ کر اٹھنے لہجے میں بولا۔ "میز سے بات کر رہا ہوں تو اسے میری کمزوری مت سمجھ۔۔۔ اور ہٹ جا بیچے۔"

"گامزدگی سے باہر نکلاؤ۔" اس بار مینی نے اسے نظرا انداز کر کے، اس بلب و فریب صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں تھراں لگائی اور نیکی کو براہ راست مطالبہ کر کے حکم لہجے میں کہا تھا۔ سہراب اچھے میں پڑ گیا۔

۳۸ 2022

"تم....." اس نے گردن کھما کر ایک عجیب نگاہ پہلے حال سے بے حال ہوتی ورٹی پر ڈالی پھر وہ ہارہ بیسی کی جانب متوجہ ہوتا، پھر آمیز لہجے میں ہوا۔ "تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"نہ صرف اسے..... بلکہ ورٹی کے پورے خاندان سے واقف ہوں میں" اس نے بڑے آرام سے بتایا اور ایک مرتبہ پھر ورٹی کو سابقہ لہجے میں مخاطب کر کے ہوا۔

"باہر نکلو ورٹی۔" اور ورٹی جس کے رستے سے اوسان بھی خاندان کا ذکر آ جانے پر جاتے رستے تھے اس بار بنا کچھ سوچتے کچھ جھٹ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ جب بیسی نے ایک سخت ملاقاتی، متاسف نگاہ بنا کچھ کہے اس کے بے رنگ چہرے پر ڈالی اور پاس سے گزرتا رکش روک کر ڈرائیور سے کچھ بات چیت کر کے اس تک آیا۔

"ڈرائیور کو میں نے تمہارے گھر کا پتا سمجھا دیا ہے۔ رکشے میں بیٹھ جاؤ اور سیدھی گھر جاؤ۔ شام کو گھر پر ملاقات ہوگی۔"

اور وہ جو اس لمحے مدد و رہبر سی لگی کے باعث خالی الذہن سی ہو رہی تھی، بنا کچھ کہے، سنے میا کی انداز سے فوراً ہی رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

اور اس کے سفر سے جاتے ہی بیسی نے ایک سلتی طیش آمیز نگاہاں حال و ہیں تے کھڑے سرداب خان پر ڈالی اور پھر مڑ کر اپنی بائیک پر سوار ہو گیا۔

"مگر یہ گاہ..... یہ مرنے کا میرے ہاتھوں سے؟" بائیک کے وہاں سے آگے بڑھتے ہی گویا سرداب کی خیند سے جاگ کر کھلا تے بڑبڑایا تھا۔

اس کی رگوں میں اس وقت لہو کی جگہ ادا گردش کر رہا تھا۔

شکاری کے جڑے سے "شکار" ایک ہار پھر وہ خدا کی فوج دار باجماعت کمال لے گیا تھا۔ اور اس ہار یہ "گھٹ" اس سے برداشت نہ ہو پاری تھی۔

"اس ہار تجھے جس نہیں نہ کرو یا تو میرا نام بھی سرداب خان نہیں۔"

ہاں راجپوت..... کیا رہا؟ "امیر ملی خان نے اس وقت "اپ اپٹ" لینے کی فرض سے تھوڑا بہت کو فون ملا یا تھا۔

"سب سے پہلے تو ہاتھ نہیں آ رہی تھی....." تیمور راجپوت اس وقت راستے میں تھا، اور کسی کام کے سلسلے میں ڈی سی آفس کی طرف جا رہا تھا۔ بہت کم اور بچے تک سے لہجے میں جو اہم تفصیل ان کے گوش گزار کرنا ہوا تھا۔

"مگر جب میں نے اس کے گھر جانے کی بات کی تو اب دو چار روز بعد ملاقات کا وقت دے دیا ہے۔"

"وہیں دہری گز....." امیر ملی خان بے ساختہ تو لگی انداز سے بولے۔

"کیا کہتے ہو..... کوئی سرا ہاتھ لگ سکتا ہے؟"

"امید تو ہے..... ہر قسمی طور پر تو اس سے ملاقات کے بعد ہی کہہ کہہ سکوں گا۔" وہ پیشہ ورانہ لہجے میں ہوا۔

"اوکے..... اوکے۔" ظاہر ہے کہ یہ ان کے سوال کا دواں ترین جواب خاصا وہ مطمئن سے ہو کر بولے۔

"آل دایسٹ اور بہت لکھ کر یہ تم نے میرے کہنے پر یہاں شامل پیش کر لیا۔"

"مائے بلیور خان۔" وہ لاکھا سا قہقہہ لگا کر ہوا۔ "ایک طرح سے اجماعی ہوا جو تم نے میری توجہ اور مبدل کروادی۔" پانی پانی پانی کیس میں نہ جانے گا اب تو یہ..... شہرت فتنے کے بہت مواقع ہیں۔"

"بایا....." یہ سرداب خان اس کی ازراہ سخن کی گئی اس بات پر دل کھول کر نصیحت۔

”اچھا ننان رکھتا ہوں۔“ اُمی ی آفس قریب آتے دیکھ کر اس نے اجازت چاہی۔

”اوکے اوکے اللہ حافظ۔“

”کیا ہوا سر؟“ ان کے کان سے فون بٹاتے ہی میز کی دوسری جانب بے قرار بیٹھا قاروق احمد نے بے صبری سے استفسار کیا۔

”دو چار دن بعد کا وقت دیا ہے لی ڈی نے۔“ انہوں نے فون میز پر رکھتے ہوئے اسے بتایا۔

”اور ان دو چار دنوں میں وہ کیا کرے گی؟“ دو تیرہری پہل ڈال کر بولا۔

”ظاہر ہے کہ اپنی حفاظت کا انتظام۔“

”لیکن سر! پھر اس طرح تو۔“

”پلیز یک مین۔“ امیر علی ننان نے اس کے اٹاؤلے پن پر بینک کی اوٹ سے اسے تیرہ گھرنے ہوئے کہا۔ ”لی بیٹھ۔“ کام کر رہے ہیں ہم۔ اور تم جانتے ہو کہ ہمارے ہاں کام اس طرح ہی ہوتا ہے۔“

”جیسا یہ یہاں کیا کر رہا ہے اس وقت؟“

زمک آلود صدر دروازے کے کھولے جانے کی تیز جیتی-مات کو گراں گزرتی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اور سامنے موجود پورٹی اب غلی نہ تھا بلکہ چند ماٹوس سے ”ابھی“ چہرے والی موجود تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ٹائپنگ بیگز کا ڈمیر تھا۔ لیونے کسی کو خاطر میں نہ لانے والی مسکراہٹ، پستکی آنکھوں میں غلائی، ہال میں غرور اور لہجے میں دوسروں کے لیے مسخر آمیز قنارت۔

”سو ہی رہا ہو گا۔۔۔ اسے اور کام ہی کیا ہے؟“ گھر کے اندر نی مے کی جانب اپنی شیر زنان کے ہمراہ یہ منی دینا مذاق اڑاتے لہجے میں جویا بولی گئی تھی سن کر اس کا دم گھٹنے لگا۔

شاید افسانہ ہر آواز ہونی لگی۔ اس قدر کہ گویا ایک سانس بھی لینا دشوار ہو گیا۔۔۔ جب وہ اپنے عیب وقت، طبیعت پر شے سے بے پروا ہو کر وہاں سے اٹھا، اور گھر سے باہر نکل آیا۔

”آوارہ رات کے اس وقت گھر سے باہر کیا جا رہا ہے۔“

اپنے مقب میں اس نے ایک بدلتا مگر فنکشنالی آواز سنئی۔ جسے ان سنی کر رہا اس کی مجبوری تھی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، چار اطراف پڑے سناٹے کے فراخ سینے پر بے نشان قدموں سے چٹا ہوا وہاں سے دور چلا آیا۔ جہاں اب سے بس کچھ ہی دیر پہلے اس کا گھر موجود تھا۔

اب اس کے جیب میں قدم کے ساتھ ایک منکر لپٹ رہا تھا، اور وہ جو سر بڑھائے فرماں فرماں چٹا ہوا تھا۔ اب اس منکر میں کھوپٹا تھا کہ جس میں اس کے گھر کے باہر واقع سرسبز کھادی کے ساتھ کھڑا مین بیسی سے

استفسار کر رہا تھا۔

digest novels lovers group

”کیا ہوا ملا جری؟“

”نہیں یار۔“ ”جو اپا مینی ہے پتا دیکھتے ہو۔“

”کبھی نہیں ملا۔“

”حیرت کی بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں گھر سے آخر تہہ راجہ کی تاب کہاں ہو گیا؟“

”نہا نہیں یار۔“ ”دو بدولی سے ہوا۔“ ”ابھی تو میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ کل کہا کراں گا؟“

”یار۔“ ”اب آتا جلد ہی جیسا وہاں دوسرا یہ تا تو ممکن نہیں۔“ ”میں نے بھی کہا۔“

”تو اب کیا؟“

حفظ شدہ شعلہ نومبر 2022

"اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ جو بنے نامے جڑیں ملتے ہیں وہی خرید کر سب مٹ کر ادا ہو۔" مہن نے صاف دہلی۔
 "تم بار بار مطلب ہے کہ ریڈی میڈ جڑیں؟" مہن نے ہر سوئی سے لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں۔"
 "پھر ان کے نمبر کاٹ لیتے ہیں یار۔" وہ بے چارگی سے ہوا۔
 "اے تو ہے۔" مہن نے تلافی سے گردن ہلائی۔ "پہلے اب اتنے کم وقت میں اور کبھی کیا سکتے ہو تم۔"
 "اتنی محنت اور محنت سے بتایا تھا میں نے اپنا جڑیں۔" وہ رنجیدگی سے ہوا۔
 "پتا نہیں کہاں چلا گیا۔" مہن نے نماز حاجت پڑھ کر دعا بھی مانگی مگر وہ نہیں ملا۔
 "تھل یار۔۔۔ کوئی بات نہیں۔" مہن اسے داسا دینے کی خاطر کندھے پر ہاتھ مار کر ہوا۔
 "ہو جاتا ہے۔۔۔ بہر حال۔۔۔ میں بک اسٹال چار ہا ہوں۔ چاہو تو میرے ساتھ چل کر جڑیں خرید لو۔ اگر وہاں نہیں ملتا تو پھر اردو بازار جانا پڑے گا۔"

"اے بیٹی۔۔۔ اگر طبیعت زیادہ بگڑ رہی تھی تو وہاں سے گھر میں کسی کو فون کر دیا ہوتا۔" مہن اس طرح رکتے میں اکیلے بیٹھ کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔
 "جیسے جیسے گھر تک پہنچ تو گئی تھی پر گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ ہر ڈال دیے تھے۔ سو قدرتی طور پر گوشہ خافت کے سارے عیاں موجود کمین اس کی دیگر گوں حالت دیکھ کر پریشان ہوا اٹھے تھے۔
 "بہت پکڑا رہے تھے مائی بیگم۔" وہ جو عارفہ کا فحاشی اکر دیا ہوا لیڈوں والا ٹخنہ اٹھا لال شربت گھونٹ مھونٹ حلق سے اتار رہی تھی، لیاقت بیگم کے تشویش زدہ سے لہجہ میں کہنے پر ان سے نکلتا ہوا آنے ہوئے بولی۔ "اس لیے اس وقت جو سمجھ میں آیا۔ وہ میں نے کر لیا۔"
 "اے۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔" وہ بے چارگی اپنی عزیز از جان کی فحاشی دیکھ کر دماغ سخت متکبر نہیں رہا۔
 "یہ جلدی سے اس کی وضاحت" تسلیم کرتے ہوئے سادگی سے بولیں۔ "جو کیا اچھا ہی کیا۔ اب بہتر محسوس کر رہی ہو یا اکثر کے پاس لے چلوں؟"
 "میرا خیال ہے کہ گری کے پامٹ لی لی لو ہو گیا تھا اس کا۔" عارفہ ماس کے چہرے پر چھوٹا حشر دیکھ کر ہم دہلی سے ان کی تسلی کی خاطر بولیں۔ "ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں کہ اکثر کے پاس جانے کی ضرورت محسوس ہو۔ کیوں درنی؟"
 "مائی مائی بیگم۔" درنی نے خالی نگاہیں سامنے کھڑی متوجہ نہ کیا ہوں سے اسے دیکھتی دھڑلے کو چھانے ہوئے تائید کیا۔ "آپ لوہک کھڑی ہیں۔ آج گری بھی تو بہت تھی۔"
 "مارے غائبیت کے چہرہ دیکھو کیا پتلا ہونگ ہو رہا ہے۔" لیاقت بیگم کے دل کو تو جیسے لگے تھے سو وہ اتنی آسانی سے کیسے قائل ہو جائیں۔ تب ہی فیبر مہن سے لہجہ میں عارفہ کی جانب دیکھ کر بولیں۔ "میں تو کتنی ہوں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔"
 "ڈاکٹر کی ذات کو حد درجہ مازک حراٹ مار کھا ہے۔" شریفہ نفرت سے بولیں۔
 "سب اسی کا نتیجہ ہے۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں پانی نہیں کہ یہ وقت ان کے قیلوے کا تھا اور لہجہ وہ اس درنی کی ہنسی کے لیے براہ نہیں کر سکتی تھیں۔
 "میں کہہ تو رہی ہوں کہ اب لوہک ہوں۔" درنی شریفہ کے تہرے پر دہلیسی ہو کر بولی۔ "نہیں۔"
 "ہاں جیسے کسی ڈاکٹر اور ڈاکٹر کے پاس۔"

”ہاں ہاں مت جاؤ۔“ عارفہ اس کی کیفیت کے پیش نظر اسے پکار کر بولیں۔
 ”بس اب اپنے کمرے میں جا کر اچھا سا غسل کرو اور اطمینان سے سو جاؤ، پلو رجا۔“
 انہوں نے بولتے بولتے بے تاثر چہرے کے ساتھ صوفے پر افلاقی سے بدلتا رہا جو اچانک ہمارے
 کرتے ہوئے کہا۔ ”ورنی کو سہارا دے کر کمرے تک پہنچا دو جانا۔“
 ”پلو۔۔۔“ رجا دل نہ مچانے کے باوجود اس کو اٹھارنے لڑکی سو کمری سے اٹھ کر اس تک آئی اور نشینی اور
 میں ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ جو ورنی نے ایک نظر اسے دیکھ کر تمام یوں لیا کہ وہ آج اس وقت کی بندہ
 سہارے کی شدید متاثر ہوئی۔

”اماں خیم۔ اب آپ بھی آرام کریں۔“ ان دونوں کے میزبیاں کی سمت بڑھتے ہی عارفہ نے عارفہ
 سے لیاقت بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ بھی ایک سردی سانس لے کر کھٹنوں پر زور دے کر اپنے کمرے
 جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”چاہو تو اپنی اس ”جالت“ کا اصل سبب مجھے بتا سکتی ہو۔“ رجانے اس کے ساتھ چلتے سرگوشی کی تھی
 اور وہ جو پہلے ہی خستہ حال تھی مزید کھڑائی۔

”تک کرنے لگی ہو مجھ پر؟“ پتا نہیں کیاں گرا سے افسوس ہوا۔
 ”جواز تو تم ہی سننے فراہم کیا ہے۔“ وہ اذیت سے بولی تو ورنی کو لہذا آگیا۔
 ”چھوڑ دو میرا ہاتھ۔“ وہ مارنسی سے بولی۔ ”خود جالتی ہوں میں۔“
 ”ہاں جالتی ہوں۔“ رجانے فی خیر سے لہجہ میں بولی۔ ”بہت کچھ ایسا ہے جو اب تم اکیلے کر سکتی ہو
 ماما جانتی ہو جاؤ۔“ رجانے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ جواب کسی حد تک اوصالی و بااثر تھا جو پاہلی لگی۔
 پیش پھر بھی بیکو پلٹ کر اپنے جانی رجا پر ال کرتی تھی سے اوپر نہ مٹی پلٹی تھی۔

آپ کی فیروزہ جوگی میں ہوں تو سب ٹھیک رہا مگر یہ جوڑ کی خولہ ہے، یہ کہیں فون ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔
 دو چار روز بعد تو نہیں، البتہ دو کم صاف ہوتے ہی ڈیڑھ دن بعد آتش پھیلی دستیاب پر آواز سے آتش کو
 لوٹ آیا تھا۔ سڑکی خان ابھی اتری نہ تھی مگر ”باخبر“ رہتا بھی مگر بر تھا۔ سو آتے ہی اچھا سا غسل کرنے کے
 اپنے نکلنے، پڑنے کے کمرے میں آ بیٹھا تھا اور اب پھلی ایک کافی کے گرم گرم گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی
 موجودگی میں یہاں ہونے والی سرگرمیوں کی بات خاتون سے رپورٹ لے رہا تھا۔
 اور خاتون تو گویا اس خولہ کی ذمہ داری اٹھانے کو بہت تیار ہی بیٹھا تھا، سب سے پہلے آتش کو اس نے
 کے متعلق آگاہ کیا۔

”کہیں ملا یا تھا اس نے فون؟“ وہ یہ اطلاع پا کر سب بہمن ہوا، نہ فکر مند اور نہ ہی مضطرب۔
 ”بلکہ یہ وہی فون ہے جسے میں نے چھوڑا۔“
 ”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ خاتون جیسے اپنی ”اماں“ از خود بھانپ کر شرمندہ سا ہو کر بولا۔
 ”ہوں۔“ خاتون کافی کا خالی کپ میز پر دھرنے کے بعد، اطمینان سے صوفے کی پشت سے کرا
 ہاں بازو پھیلا کر آرام وہ انداز سے بیٹھتے ہوئے بولا۔
 ”اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس احموزی معلومات کا کیا کروں؟“
 ”مذرت جانتا ہوں سر۔“ وہ بے پناہ شرم ساری سے بولا۔ ”یقیناً مجھ سے نکلے ہوئی۔ مجھے فوراً
 کہہ دینا چاہیے تھا مگر اس نے کہاں فون ملا ہے۔“

جیکبہند شعل نومبر 2022

”خیر دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے دایاں ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”اور کوئی خاص بات؟“
 ”تیسرے۔“ وہ اگلی ”خاص بات“ چوکنے سے انداز میں بتانے لگا۔ ”وہ بی ڈی میڈم بہت پریشانی میں
 دھرائی تھیں۔ اور وہ شرر۔۔۔ وہ بھی آپ سے ملاقات کی فرس سے آیا تھا۔“
 ”یہ تو میں جانتا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اگر اس کے ملاوہ کوئی اور اہم بات ہے تو مجھے بتاؤ۔“
 ”میرے کچھ دیر آرام کروں گا۔“

”نہیں سر۔“ وہ خوب سے لہجے میں بولا۔ ”اور تو کوئی بات نہیں۔۔۔“
 ”ہوں۔“ تو چلو میں کچھ دیر آرام کرنے جا رہا ہوں۔“ ان پر ذرا اہتمام کر دالینا اور شام اٹھنے کے بعد
 ہاڈی کو ٹال کر کے رات کے کھانے پر مدعو کر لیتا۔ اس سے کہتا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 ہاڈی ہاڈی

میرے ہاتھوں میں نوٹو چوڑیاں ہیں
 ذرا ٹھہرو جتن، مجبور ہاں ہیں۔۔۔
 رات بھر ملاقات کی سڑکوں پر سرگرداں رہ کر جس دم وہ گھر کی جانب واپس پلٹا منج کا مارا طلوع ہو چکا تھا۔
 گھر کے دروازے اب اس پر کھولے نہیں جاتے تھے سو وہ لوہے کا دروازہ ٹاپ کر اندر پورنی میں کودا اور بجائے
 لالچ کے ان سے گھر کے بھی گھن کو جانی پنکی سی گل سے گزر کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور اس کے عتاب میں
 ایک لادگی پٹی آئی تھی۔

اس کے دسویں کے استقامت میں چند ہی روز ہوتی تھے کہ جب آقا ٹانگی کی شادی کی تاریخ ٹھہرا دی گئی۔
 توں کہ روئے مے کا کوئی مسئلہ نہ تھا لہذا جھٹ پٹ ساری تیاریاں ہو گئیں اور آن کوہ کناری سے
 سب کمرے پہلے سوئی ٹیبلٹ میں گھسی کر کے سہاؤ صک رنگ وہ پلا آدھے چہرے پر ڈالنے لگا۔ کٹار سے نیوں
 میں ڈھیروں سینے سہائے تاج درون چہرے والی لگی کو مایوں بخار دیا گیا تھا۔
 اسی رات ہی ہنگامہ خیزی۔ عزیز اقارب کا شادی سے آفتہ وہ ہفتہ قبل گھر میں پڑا۔ سہاگ گیت۔
 ڈھیروں سر نہیں۔ مگر پھر بھی۔ کچھ تھا۔۔۔ کوئی مظلوم سا احساس، جو اس سارے خوش گوار ماحول پر سرنگی
 سائے کی مانند رفتہ رفتہ چھاتا جا رہا تھا۔ مگر فی الوقت کوئی بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔
 میسٹی کو کمرے میں بند ہو کر بڑھائی کرنے کا حکم ملا تھا۔ سو وہ اب ہر جہاں سارے شور و غل سے بھٹل دام
 بھٹان ہٹا کر ساری توجہ بڑھائی پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ تب ہی دیر سے سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر
 داخل ہوا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ چیخا اپنے تئیں سب سے نظر بچا کر بہت سی ملا انداز سے یہاں آیا تھا مگر
 یہاں پہلے ہی سے موجود میسٹی کو دیکھ کر کھٹک ہو گیا۔
 ”مارے گھر میں کہیں جگہ نہیں۔ اس لیے یہاں بیٹھ کر پڑ رہا ہوں۔“
 ”بڑے پڑھا کو بن رہے ہو۔۔۔“ وہ نہ جانے کیوں تھلا گیا۔
 ”پھر وہ سے بھیجے ہیں میرے۔۔۔“ اس نے لمبیدگی سے بتایا۔
 ”بھیجے گا اتنا ہی خیال تھا تو پہلے ہی سے تیاری کرتے۔۔۔“ وہ دھڑکے بولا۔
 اب وہ اس پر کیا کہتا کہ تیاری تو ظاہر ہے وہ پہلے ہی سے کر رہا تھا۔ یہ تو اس کے احمات کے دلوں میں
 شادی کی تاریخ ٹھہرانے والوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ اس کا امتحان جس۔ شادی کی تاریخ درمیان میں آئی گی۔
 ”پلٹو ابھی ابھر جاؤ۔۔۔ مجھے تمہارا کام ہے کمرے میں۔“ وہ ٹھکانے لہجے میں چند لمحوں بعد بولا تو میسٹی

بہنہ ہی سے بھنبلا گیا۔

"مگر میں بڑھ رہا ہوں۔"

"ہاں من لیا۔ پر کہا، ابھی باہر جاؤ۔" اس نے آنکھیں دکھائیں۔ "تھوڑی دیر بعد وہاں آ جاؤ۔"
"اوپر اپنے کمرے سے مجھے بچے پر تیار نہ تھا۔ سو بسنی نے ایک بے چارگی بھری انتہائی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنی کتاب وہیں خراک کر کے چھوڑ کر گیا۔ تب اس نے سر مت سے کمرہ منتقل کیا اور ایکسٹینشن سے دینا کو فون مارا۔
بہنہ گیا۔

"کیا تلیف ہے۔ ہار ہار فون کیوں کر لیتے ہو؟" فون ہار ہار دوا لیتی تھی تاہم نگلی سے بول۔

"ہار ہار۔" وہ بٹا شت سے ہوا۔ "اٹھ کو مانو۔ آج پورے چار دن بعد فون کر رہا ہوں۔"

"ہاں تو کیوں کر رہے ہو۔ مت کیا کرو۔" وہ زور دے پھینکے سے بولی۔

"حق ہا۔ اب تک مارا نہیں ہو؟" وہ مایوسی سے ہوا۔

"مارا ہی تو انہوں نے ہوتی ہے۔" اس نے غامض طور پر بتایا۔

"تو کیا میں تمہارا اپنا نہیں۔" وہ شاکی ہوا۔

"ہوتے تو ثابت بھی کرتے۔" وہ خطر سے بولی۔

"میں کوشش کرتا رہا تھا۔ پر تم نے اعتبار ہی نہ کیا۔" اس نے اپنی صفائی دی تھی گویا۔

"جتنی دیر تم انکار سے تھے۔ ایڈیشن کا وقت نکل جاتا تھا۔" وہ اس کی وضاحت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا۔ ایڈیشن ہو گیا تو لی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں تو۔" وہ اتر اٹھ سے بولی۔ "کیا تم یہ بھڑے تھے کہ اگر تم ایڈیشن نہیں کراؤ گے تو نہیں ہوگا؟"

"میں ایسا کیوں بکھوں گا۔" وہ کھسکا کر ہوا۔

"خیر یہ بتاؤ اس وقت فون کیوں کیا ہے؟"

"نگلی کی شادی ہو رہی ہے۔" اس نے بتایا۔

group @Nadia Majid
"کون بھی؟" وہ ذرا سنا ہوئی۔

"میری بہن۔"

"اچھا۔" وہ تامل ہو کر بولی۔ "تو؟"

"تو یہ کہ میں تمہیں انوائٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اتنا تو دارتے ہو اپنے گھر والوں سے۔" وہ اس پر تسخیر سے ہنسی۔ "مجھے بلا ہی لیا تو گھر والوں سے کیا کہہ کر متعارف کرواؤ گے۔"

"کہہ دوں گا کہ تم تم زندگی ہو میری۔" وہ سوچتے ہوئے مجھ سے بھونکا۔

"ڈاڈا۔" وہ بے پاکی سے ہنسی۔ "نگلی ڈاڈا لگا۔ اور وہ یہ سن کر مجھے سر آنکھوں پر ہنچائیں گے؟"

"تم ابھی مجھے جانتی نہیں ہو۔" وہ اس کے مذاق اڑانے پر سخت برا مان کر ہوا۔

"میں چاہوں تو یہ کرشمہ کر بھی سکتا ہوں۔"

"اچھا۔ چلو۔ پھر دکھاؤ اپنی یہ کرشمہ سازی۔" اس نے جیسے عامر کو کھانا بیچ دیا۔

"یہی تم آنے کی ہامی بھر رہی ہو۔" وہ خوش ہو کر ہوا۔

"ہاں۔" وہ توفانی انداز سے بولی۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ تم میں اتنا دم غم ہے۔"

پتہ پتہ

حیاتِ شعلہ نومبر 2022

اب کیا سوچیں کیا ہوا ہے

جو ہوگا اچھا ہوگا ..

"کیسے اس مہینے کے ہوتے ہوئے اب جو ہوگا وہ کیسے اچھا ہوگا؟" اس کے نیم تاریک دھنک کرے میں گونجتی اس کے من پھراتے فنی کی آواز تو اسے دلا سے دے رہی تھی مگر وہ کوئی نادان طفل نہ تھا، تب ہی اپنے دابنے ہاتھ سے ہاتھیں پھیلی پر پوری شدت سے دھکا مارتے ہوئے دانت کچکا کر بیڑا لپٹا تھا۔
"کیا کروں .. اس حرام زادے کا کیا کروں میں؟" اس نے دھشت سے کمرے کی برائے جس جس کر ڈالی۔

"تم نے پہلے ہی کیا کر لیا تھا؟" کوئی اندر سے اس پر ہنسا تھا۔
"کس قدر شہری موقع تھا آج اس میکنے کا اب سی، شوخ دھنک دھنک سی قہقہے کے رنگ چہانے کا۔ اور وہ کہیں پتا نہیں کدھر سے وہاں آٹھا اور آٹھا تو لگا .. اب کیا یہ ضروری تھا کہ وہ اورٹی سے واقفیت بھی رکھتا تو سوچی سوچی کروڑوں ہاتھوں سے ہانگوں کی طرح اپنے ہال ٹوپیٹے لگا۔
"اب تک تو وہ بہت کچھ بتا چکا ہو گا درنی کے گھر والوں کو میرے بارے میں۔" اس کی اصل تشویش یہی تھی۔

"کیا کروں؟ فون کروں اسے۔" اس نے سرعت سے اپنے بال پھوڑ کر پگھلتے ہوئے فون الٹا کر درنی کا نمبر اٹل کیا مگر۔۔۔

"آپ کے مطلوب نمبر سے فی الوقت رابطہ۔۔۔"
دوسری طرف ملنے والی ٹیپ نے اسے یاد دلایا کہ وہ دن میں فون آن ہی کہاں کیا کرتی تھی۔
"ڈر ہک، بزدل، کم ہمت۔۔۔" وہ فون بستر پر اچھال کر بٹے بنے لہجے میں بیڑا لپٹا کہ اسے اس وقت اس قمار پر بھی بے طرح طیش آ رہا تھا اور ایک اسی پر کیا مہول۔۔۔ وہ تو اس سے زمین سے لے کر آسمان تک گواہر شے پر غبار کہ ہاتھ مارا سوائے اس "امرت بل" کے۔۔۔ جو ایسے "کڑے دھتوں" میں بیٹھ ہی اس کا بے لوث تھوڑا سا لگی ثابت ہوا کرتا تھا۔

سو اس لمحے بھی اس نے نیم دیوانوں کی سی حالت میں، سرخی صوفے کے سامنے دھری ٹھٹھے کی سلا والی مہوئی کی میز پر بیڑے کا ہتھام سے سجے اس دیرینہ رفیق کو الٹا کر لپٹا سے لگا لیا اور کچھ دیر کے لیے جیسے دنیا بھلا کے برہم سے بے نیاز ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے!

یہ کیسے پاگل مہم کو تم نے یہاں تک رسائی دے دی ہے؟"
خاتون کے فون کی دیر تھی، رات وہ پہلی فرصت میں آنش کے مقابل موجود تھی۔۔۔ مٹائیے تناول کیا جانے لگا تھا۔ اور اب وہ آنش کدے کے کتب خانے میں اس کے سامنے بیٹھی "ہاتھ دھو" کا آواز کر رہی تھی کہ کھانے کی میز پر تو وہ بوجہ زیادہ تر لب کشائی سے گریز اس ہی رہی تھی۔
"کون؟" وہ پہر کی نسبت، سیاہ شلوار اور کھنٹوں سے ڈھکا لپٹے آرام دہ کرتے میں لمبوس بٹش سا آنش دل دھس سے پوچھنے لگا۔ "تس کی بات کر رہی ہو؟"

"وہ آئی صنگ شرر۔۔۔" وہ ہانک ہانک بھا کر ذرا تریتے انداز سے شخصیت ہوئی زمین پر دوڑا ال کر اس کا نام یاد کرتے ہوئے بولی۔ "شرر نام بتایا تھا اس نے اپنا۔"
"تس کی بات کر رہی ہو؟" اس نے ملاقات ہوئی۔

43 2022 نومبر

”ہاں اس روز جب تم یہاں نہیں تھے۔“ وہ آخرتے باؤں کا جوتا سامنا تلی ہوئی بولی۔

”اور وہ نہیں پاگل تھا۔“ آتش جسم لہجے میں گویا ہوا۔

”کیا نہیں ہے؟“ لی ڈی فورت آمیز بے زاری سے بولی۔

”اگر ہے بھی۔“ دھما آتش کی آنکھوں میں وہی چمک ابھری کہ جس کے آگے ہزار بابیروں کی

جواہر باندھیں ہوئی تھی۔ ”تو بس جان لو کہ اس کی بھی دماغ کی تودارے لیے کارآمد ہے۔“

”بھی بھئی میں تمہاری باتیں سمجھ نہیں پاتی ہوں۔“ وہ کچھ نائف سی ہو کر سیدھی ہوئی۔

”جس میں ہر بات کی لہجہ ہو۔۔۔ یہ ضروری بھی نہیں۔“ وہ کچھ حیرت سے بولا۔

”بس میری حکید ضروری ہے تمہارے لیے ہو کیے جاؤ۔“

”کرتی ہوں۔“ وہ جیسے کسی عمر کے ذرا اثر لہجے میں بولی ”تب ہی تو ہر پریشانی میں سب سے پہلے تم

ہی سے رجوع کرتی ہوں۔“

”کیا تمہارے مسئلہ کا؟“ آتش کو لی ڈی کی عقیدت مندی نے محفوظ کیا تھا۔ سو سرور سے لہجے میں اس

کے ”مسئلے“ کی جانب آنا مستفسر۔

”تم یہاں تھے نہیں۔“ وہ تجویز کی سے بتانے لگی۔ ”اور اس بارے میں تم سے فون پر کچھ واکس کرنا میں

نے مناسب نہیں سمجھا۔ کیا ہا میرا فون نیپ ہو رہا ہے۔“

وہ یقیناً خوف زدہ ہو کر ضرورت سے زیادہ بھٹکا ہو رہی تھی۔ پر اس بات کا اگلا نشان رد بھی نہیں کیا جاسکتا تھا

سو آتش دھیرے سے سر ہٹا کر تائید ہوا۔

”نکلن ہے۔ بہر حال تم نے کیا مل لیا اس مسئلے کا؟“

”اس روز وہ ”پاگل“ کہہ رہا تھا کہ اٹھ کے بعد اگر کوئی داری دے کر سکتا ہے؟ تو وہ ہم خود ہیں۔ سو میں نے

اپنی مدد آپ کے تحت جو کچھ میں کچھ یاد کیا۔“

”کیا کیا؟“ ”پاگل“ نے یہ سن کر آتش کے روم روم میں جیسے بیجان ہوا دیکھا تھا مگر چوں کہ کسی پر ہوں۔“

ظاہر ہو جا رہا اس کی فطرت نہ تھا سو بظاہر مل سے اس نے جانا چاہا تھا۔

”میں نے اس آفسر سے دو چار روز کا وقت مانگ لیا تھا۔“ لی ڈی نے اپنا مل اس کے گوش گزار کرتے

ہوئے کہا۔ ”خیال بھی تھا کہ تب تک تم یقیناً آئی جاؤ گے۔۔۔ اب اس سے زیادہ میں اپنی مدد اور کیا کر سکتی

ہوں۔۔۔“

”تو تاؤ۔ اب میں کیا کروں؟“ وہ امتحان کی طرح اس کا تاؤ سے ماری چہرہ نکتی ہوئی بولی۔

”اپنے وکیل کے ہمراہ اس سے ملاقات کر لو۔“

”رنگی؟“ لی ڈی یہ سن کر اسی حیران اس لیے ہوئی کہ وہ گمان کر رہی تھی کہ شاید آتش اس آفسر کا کوئی

خاطر خواہ انتظام کر دے گا۔

”ہاں لی ڈی۔“ وہ ہنسنا ہوا۔ ”مسئلہ کا سامنا کرنا سیکھ جاؤ اب۔ فرار کسی شکل کا کوئی پانیدار مل تو

ہیں۔“

”اتنی۔۔۔ لہجہ کہہ رہے ہو تم۔“ بات جیسے فراموشی اس کی مثل میں آئی تھی تب ہی زور و شور سے سر ہٹا

کر بولی۔ ”اور پھر میں نے کیا ہی کیا ہے جو خود ان کو اتنا زور دے رہی ہوں۔“

”پاگل“

جولائی 2022

"بہت شکر یہ آتش۔" وہاں کہ بیٹھ کی طرح وہ آتش سے بات دیت کر کے قہقہے طور پر شانیت ہو چکی تھی۔ سو عقیدت سے آنکھیں بند کر کے اپنا سراں کے سامنے ذرا سا ٹھہرتے ہوئے طراغ حسین پیش کرنے والے لہجہ میں کہا۔

"شکر تقسیم ہو۔" ہم تقسیم ہو۔"

اور آتش..... پہلے کی طرح بیانی کے اس عقیدت مند انداز پر نہ شاد ہو سکا اور نہ ہی سرور۔ اُجائے کیا بات تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

باہر دن انہیں ہوا تھا گلاب اس کی "رات" ہو گئی تھی سو خواب کی مانند ایک اور دھڑکنوں سے آ بیٹھا۔ دو دن کل تھی کو مایوں بخا دیا گیا تھا اور اب کل ٹر کے والوں نے بری لے کر آتا تھا۔ سو گھر میں اس حوالے سے انتظامات کیے جا رہے تھے۔

پورے گھر میں اپنا کارہنگی ہوئی تھی۔ اور مہمانوں کی موجودگی کے باعث قہقہہ کوئی "جائے پناہ" نہ تھی سو بحالت مجبوری بیسی اپنی کتب الخائے مکان کی طرف باغی را تھا کہ مقب سے عامر نے اپنے معنوی میلے لہجے میں اسے پکارا کہ جسے کسی اب غولی بکنے لگا تھا۔ سو وہ نہ کنا سا ہو کر خیر ضرور کیا کر چکے نہیں مڑا۔

"میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟"

"پنہ منے..... مکان کے گھر۔"

"اچھا۔ اچھا۔" وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے ہوا ہوا۔ "ہاں دیکھو۔ میں کہہ کہوں گا تو خواہوا براہوں گا..... مگر گھر کے بڑوں کو سنا دینا تو چاہیے تھا کہ ان دنوں تمہارے ہیجے۔"

"آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے....." اس نے اسکا کرٹو کا۔

"کہیں فینرنگ ملے ہو، جو تم سے کام ہوگا..... وہ اس پر ہنس کر ہوا۔

"تو پھر روکا کیوں ہے مجھے....." اس نے بیحدگی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں....." وہ لہجہ سرسری سا بنا کر ہوا۔ "وہ میں پوچھ رہا تھا کہ کیا تم اپنے دوستوں وغیرہ کو بھی نگی کی شادی میں بلا رہے ہو؟"

"صرف مکان کو....."

"کیوں؟" وہ تعجب سے ہوا۔ "تمہارے تو اتنے سارے دوست ہیں، ان سب کو کیوں نہیں بلا رہے؟" وہ کہہ نہیں سکا کہ وہ تو آپ ہی ہیں۔ ہاں یہی کی تھا کہ وہ ان سب کے سامنے اس کے ہاتھوں اٹھالی رات کو نا مال فراموش نہیں کر پاتا تھا۔

اس روز کے بعد اس نے اپنے لیے کسی کی آکھ میں دھڑکی دیکھی تھی، تو کسی کی آکھ میں استہزاء سے سنو۔ سو اس نے بھائی ان سب سے کنارہ کش ہو جانے ہی میں جانی تھی۔

"کیا سوچنے لگے؟" اس نے بغور بیسی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں....." وہ سر جھٹک کر ہوا۔ "اب جاؤں؟"

"ہاں....." پہلے پوری بات تو سن لو۔" وہ تھا سا ہو کر ہوا۔

"پہلے ہاں....." پہلے پوری بات تو سن لو۔" وہ تھا سا ہو کر ہوا۔

"پہلے ہاں....." پہلے پوری بات تو سن لو۔" وہ تھا سا ہو کر ہوا۔

45 2022 نومبر

”وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جوڑنا نہیں تھا نوٹی۔“ اس نے سنبھل کر کہا شروع کیا۔
 ”کون نوٹی؟“ میننی نے ماتھے پر ہلکا ہال کرنا بھی تے اتے دیکھا۔
 ”اے جی جس کا انڈین ٹین کروانا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کا انڈین ٹین ہو گیا تہا رے ہی اسکول میں۔“
 ”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔
 ”ہاں، تب ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تم اس سے دوستی کرو اور اسے بالائی ناظمی کی شادی میں۔“ وہ ہاتھ بٹا بٹا کر بہت مزے سے کہہ گیا۔
 ”تی؟“ میننی نے بے حد حیران ہو کر اسے دیکھا۔
 ”کیوں؟ کیا میں نے کوئی بہت ہی نا سمجھ میں آنے والی بات کر دی ہے؟“ میننی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ٹہالت سے بے طریت چٹ کر بولا۔
 ”بات تو نا سمجھ میں آنے والی کی ہے آپ نے۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔
 ”تو تمہیں سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے۔“ وہ دیر محنت سے بولا۔ ”بس جو میں کہہ رہا ہوں، تم وہ کرو۔“
 ”ٹھیک ہے۔۔۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں کہہ کر جلدی سے گھر کا صدر دروازہ عبور کر گیا مبادا کوئی اور مطالبہ پیش کرے۔
 اس نے تو ہائی جبرلی بھی پر مامرا اب بھی غیر مطمئن تھا کہ، کیا اگر نوٹی کے ساتھ شادی میں آ بھی جاتی تو تب بھی وہ بات نہ بنتی کہ جو وہ دانا چا اور ہا تھا۔
 ”کیا کروں۔ کیا کروں میں؟“ وہ ہرج میں بھاگتے دوڑتے بچوں کو پریشان نظروں سے دیکھ کر سوچنے لگا اور ہرگز نہ کیا اس کی آنکھیں پٹپٹنے لگی تھیں۔

”کب سے جانتی ہیں آپ اس سے اب کو؟“
 وہ کمرے میں جا کر لیٹ تو گئی مگر ساری وہ پہر شام میں میننی کا سامنے کرنے کے خیال نے اسے ہراساں کیے رکھا تھا۔ پتا نہ چلے کہ وہ اپنے وقت پر اسے پڑ جانے آیا تب اس نے ایک موبو سی امید کے تحت خرابی طبیعت کا بیان کرنا سے ہال دینا چاہا مگر وہ ٹلنے پر راضی نہ ہوا اور اسے یہ کہہ کر بلوا لیا کہ بس آدھ گھنٹے میں فارغ کرو گے گا سو مرنی کیانے کرنی کے مصداق، اپنے اڑنے اڑنے سے تاثرات لیے وہ اس وقت درانگ روم میں میننی کے ہاتھ ملے جو وہ بھی۔
 ”اسے۔۔۔“ جتنا بھوکا شادی کے دنوں سے۔۔۔“ وہ ٹھیک ہو جانے والا لگا تر کرنے کی شدید خواہش لے رہا تھا۔
 ”میں ہی آواز میں جوابا بولی۔“
 ”ہوں۔“ اس نے اپنے پوزے میں ہاتھ باندھتے ہوئے مخصوص انداز سے کمر موٹنے کی پشت سے نکالتے ہوئے پرسوج سے لہجے میں انگا سوال کیا۔
 ”اور کیا لکھ جاتی ہیں آپ اس کے بارے میں؟“ یہ نہ جتنا یادہ مشکل تھا۔ تب ہی ابھی سے اسے دیکھ کر نا چھٹا۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”مطلب یہ۔“ وہ دہا جاتے ہوئے بھی دوشی سے بولا۔ ”کہ جتنا جانتی ہیں آپ اس شخص کے بارے میں۔“
 ”حاضر ہے اس سے بات کرنے میں پڑیں؟“

"اس نے بتایا ہے کہ اس کے ڈیڑھ کے میں ہوتے ہیں۔" وہ جیسے برامان کر اس کے بارے میں جو کچھ بھی جانتی تھی، جلدی جلدی بتانے لگی۔ "اور اس کی مز بھی ان دنوں ان ہی کے پاس گئی ہوگی ہیں اور وہ خود یہاں اپنے لڑکائیوں میں۔"

"آپ کو ذرا بھی اندازہ ہے کہ آپ کر کیا رہی ہیں؟" وہ اس کے جواب پر اس قدر بے چین ہوا کہ خلاف عادت اسے درمیان ہی سے ٹوک کر کہہ بیٹھا۔

اس کے سنبھلنے میں کوئی ایسا تاثر تو ضرور تھا کہ ایک لمحہ کو درنی چپ رہ گئی۔
 "وہ" وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" پندتا ہے بعد جب وہ گویا ہوگی تو فوراً اسے اپنا لہجہ بہت بڑا سا محسوس ہوا تھا۔

"... شادی ...؟"۔ "میں اس کی یہ منطوق سن کر بے ساختہ پھر آ میزٹش سے ہوا۔" کتنا فرسودہ اور گھساٹا جال ہے جس میں آپ جیسی نادان لڑکیاں پا آ سالی پھنس جاتی ہیں۔"
 "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نے مجھے پھنسا پایا ہے؟" وہ مدد درجہ ناگواری سے بولی۔
 "اگر نہیں۔" وہ اس مرتبہ ایک مضبوطی سے اس کے لڑکھائے سے سمجھانے کی غرض سے ہوا۔ "تو پھر آپ خود ہی تادیں کہ جو کچھ وہ آپ کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس طرز عمل کو اور کہا کہتے ہیں۔؟"
 "میت۔" اس بار درنی کے سنبھلنے میں کسی بھی قسم کی شرمندگی، تجلیات یا کھمیا بہت کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس نے جیسے بہت قافہ سے مہی کو آ گاہ کیا تھا۔

"میت۔" وہ دہا چاہتے ہوئے بھی استہزاء سے لہجہ میں کہہ گیا۔
 "اس پاکیزہ قہقہہ کی منہیت سے واقف بھی ہیں آپ؟"

"پہلے نہیں تھی۔" اس کا انداز مہیسی کو بے طعن کڑوا تھا تب ہی وہ سخت سے لہجہ میں ہٹا رہا تھا۔ ہوا۔ "مہی مجھے آپ سے نہیں۔ اب وہاں سے بات کرنا پڑے گی۔"
 "سر پلیز۔" وہاں کے ذکر پر وہ بوکھلا گئی۔ تب ہی منت بھرے لہجہ میں بولی۔ "آپ میرے ننو ہیں۔" مگر اس سے زیادہ آپ میرے معاملے میں مت پڑیں۔"
 "اتھا۔" تو آپ کے خیال میں مجھے لڑا کرنا چاہیے؟" اس نے بانٹنا چاہا۔
 "بہتر ہے کہ آپ۔" آپ بس اپنے کام سے کام لیں۔" وہ بری طرح اٹھیاں دلاتے ہوئی گئی۔
 "اور آپ کو کھائی میں گرنے دوں؟" وہ ہوا۔ "نہیں بدرا لورا ظفر میرے گھیر کو یہ بات کسی صورت کو اور نہیں۔"

"سر پلیز۔" وہ گلو کیر ہو کر بولی۔ "زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کی خاص محبت اور توجہ کا ذائقہ چکھا ہے۔ کوئی ہے جو صرف اور صرف میرا ہے۔ مجھ سے میری یہ خوشی مت چھینیں۔"
 "ورنی۔" وہ ظاہر ہے اس کی انھیات سے کسی حد تک واقف ہی تھا سو اس بار بہت ہم دردی سے اسے دیکھتا رہتا۔ ف سے لہجہ میں ہوا۔ "مجھے آپ کی محرومیوں کا احساس ہے۔ مگر آپ کچھ نہیں رہیں۔ سہا اب ایک ظہر ہا کہ انسان ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" وہ پہلی بار مہیسی کے لہجہ پر ہوئی۔
 "تو میں کہ میں ابھی طعن جانتا ہوں اسے۔" مہیسی گھبراہٹ سے ہوا۔
 "تو وہ؟" وہی بجا بھی کا بھانپا ہے۔"

جلد شدہ شعبان نومبر 2022

"اس بات سے سب ہی واقف ہیں کہ آپ کے اور مرحومہ کے درمیان کچھ عرصے سے بنجید و قسم کی دشمنی چل رہی تھی....."

بی بی کے وکیل شاد زیب ہمدانی کے مناسبت سے آراستہ دفتر کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھا۔ خوب رو و خوش قامت تیرہ راجپوت اپنے سامنے براجمان پھول دار سریشی پاؤں اور اسی پرنٹ کی ڈھیلی ڈھالی سی شرٹ میں لمبوس بی بی سے سوالات کا باقاعدہ آغاز کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ صوفے پر اس کا معاون بیٹھا ٹولس لے رہا تھا۔ جب کہ اس نے اپنے فون کا ریکارڈنگ آف کر رکھا تھا۔

"دشمنی؟" جواب بی بی نے سے قبل شاطر صورت، کارآگموں والا ہمدانی کو بھڑک کر بولا تھا۔ "کیا بات کرتے ہیں آفیسر..... آپ سے کس نے کہا؟"

"میں سیم سے بات کر رہا ہوں۔" اس نے بی بی کے سنگل صوفے کے ساتھ دھرے صوفے کرسی پر چوکی سے براجمان ہمدانی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ خواخوہاں اپنی گردن سہلانے لگا۔ بی بی نے ایک نظر ہمدانی کو دیکھا۔ پھر بہت متاملہ لہجے میں بولی۔

"یہی جواب میرا بھی سمجھ لیجیے۔"

"مگر آپ کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس تو اس ضمن میں کچھ اور کہتے نظر آتے ہیں۔" راجپوت نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سوال کیا۔

"وہاں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔" وہ بتاؤں بے پرواہ لہجے میں بولی۔ "اسے کون اہمیت دیتا ہے؟" "نہ صرف عوام الناس بلکہ سائبر کرائم والے بھی....." اس بار وہ سخت سے لہجے میں گویا اسے پاور کرتے ہوئے بولا۔ "اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ آپ بات کو یہاں وہاں کھانے کے بجائے میرے ہر سوال کا سیدھا سیدھا جواب دیں۔"

"آپ اس لہجے میں میری معزز کابینٹ سے بات نہیں کر سکتے۔" ہمدانی نے پھر بدالکت کی۔ "ہمیں کس سے کس لہجے میں بات کرنی ہے؟ یہ آپ سے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ درشتی سے بولا تو ہمدانی تلملایا گیا۔

"اچھی بد۔ عاشی ہے۔"

"ہمدانی پلیز....." بی بی جو دل عی دل میں راجپوت کے لہجے سے متاثر ہو گئی تھی، ہمدانی کو ٹوکتے ہوئے بولی۔ "میں جواب دے رہی ہوں..... آپ ہر جیسے جو بچھڑا پاتے ہیں۔" "آپ دونوں کے درمیان Rivalry (مناسبت) کس حد تک تھی؟" "بس یہی..... سوشل میڈیا کی حد تک....."

"مگر ہماری معلومات کے مطابق مرحومہ نے آپ کی شہرت کو زک پہنچانے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے تھے۔"

"ہاں....." وہ اس کی خور پر بھی کھوجتی نگاہوں سے بے آرام ہو کر پہلو بدلتے ہوئے بولی "جیسے تھے۔" "بدل لینے کا دل نہیں چاہا؟"

"وہ آل ریڈی تباہ ہو چکی تھی....." اس بار بی بی کا لہجہ خود بخود تسفرا نہ سا ہو گیا۔ "مجھے اس سے بدلے لے کر کیا کرنا تھا؟"

"پہلو ہار مارا۔" چہ کی راہ میں مائل تو ہو رہی تھی۔ "وہ اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔"

حکومت پاکستان کے زیر نگرانی

"ہاں دو کوشش تو کر رہی تھی پر مجھے اس سے کیا فرق پڑا تھا؟" بی بی ذی الہود اسے لہجے میں بولی۔
 "ملکی تاریخ کی سب سے بڑی بحث مودی اس فرائے ڈے ورلڈ والڈر۔ لیڈز ہونے جارہی ہے، جس کا
 لیڈنگ ایکسٹریس۔ میں ہوں..... ساری دنیا کا میڈیا مجھے کورج دے رہا ہے۔ شاید یہی سب اس سے
 برداشت نہیں ہو سکا۔ اور اس نے سوسائڈ کر لی۔"

"آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ اس نے سوسائڈ کی تھی؟" راجپوت نے اس کے ناموش
 ہونے پر ترنت اگاتھ سوال پوچھا۔

"آفسر..... یہ کس طرح کا سوال ہے؟" وہ ماتھے پر ہل ڈال کر ترش سے بولی۔
 "سوال تو کسی طرح کا بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بے لکھ لہجے میں بولا۔ "پر لگتا ہے۔ آپ اس کا جواب دینا
 نہیں چاہتیں۔"

"خبروں میں یہی سناتا تھا۔" وہ چپا چپا کر بولی۔
 "تب یہ بھی جانتی ہوں گی کہ خود کشی کی کیسے تھی۔" راجپوت کے اس سوال کا جواب بی بی نے نفی میں
 سر ہلا کر دیا تھا۔

"کانی میں زہر تھا ان کی۔" وہ بڑے آرام سے گویا اسے مطلع کرتے ہوئے بولا۔ "یعنی پہلے انہوں نے
 کانی بنا لی، پھر بڑے عہدہ سے اس میں زہر ملا کر لی لیا۔"
 "آفسر..... وہ جزبہ ہو کر بولی۔ "یہ بات آپ مجھے اس طرح بتا کر کیوں بتا رہے ہیں؟"
 "آٹم سوری کہ اگر آپ کو ایسا محسوس ہوا۔" وہ خفیف سا سکرایا۔ "میں بس یہ پوچھتا چاہ رہا تھا کہ کیا یہ
 بات آپ کو کچھ عجیب نہیں لگتی؟"

"اب میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں..... اپنی دے۔" وہ دائیں کلائی پر بندھی پڑے سے ڈاکل والی
 سیاہ سرنگی گھڑی دیکھ کر اچانک ہی بڑے مصروف سے لہجے میں بولی۔ "اگر کوئی اور سوال رہ گیا ہے تو ذرا جلدی
 کر لیں..... اچھے کلی آدھ گھنٹے میں مجھے کہیں ضروری پہنچنا ہے۔"
 "وقت دینے کا شکریہ....." راجپوت ٹنگ لہجے میں بولا۔ "لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں دوبارہ
 آپ کو زمت دوں گا۔"

☆☆☆

"گھر نے سے نکلے وقت عامر بھائی نے مجھ سے ایک عجیب بات کی....."
 اسے نیند نہیں آرہی تھی..... سو اس نے بستر پر یوں ہی طرید پڑے بندھتا بے سوچ خیال کیا اور اٹھ بیٹھا مگر اسے
 حاما ہی کہاں تھا؟ اس خیال نے اسے بدل کر دیا اور بہت زیادہ مضطرب بھی۔ سو اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑے
 سگریٹ کے ہنک میں سے ایک سگریٹ کھینچا اور اسے لیوں سے یوں اگا یا جیسے وہ نفرت فیر مترقہ ہو اور وہ شاید
 اس کے لیے تھا بھی..... کڑوا، کثیف ناگوار دھواں نچھلنے لگا تھا اور اس کے ساتھ ایک اور نیا..... نہیں.....
 یا تو نہیں کچھ پرانا..... عطر کہ جس میں وہ اور حنا، حنا کے گھر کے لار ایچک روم میں آنے سے سامنے بھانجھن کو اٹھکھو
 تھے۔

"اب کیا کہہ دیا انہوں نے؟" اس کے آگے ملنے کی خیالی دھرتے ہوئے حنا نے مسکرا کر پوچھا۔
 "کہہ رہے تھے کہ نولی سے دوستی کرو اور اسے ملنی باجی کی شادی میں بالو....." اس نے ہاتھ میں ہنڈی
 کتاب بند کر کے رکھتے ہوئے اسے کچھ پریشان سے لہجے میں بتایا۔
 "کیا یہ کن ذات، مرہب ہے؟" وہ ہلکے پھلے لہجے میں بولا۔

☆ 2022 نومبر ☆

"وہی لڑکا جس کا ایڈیشن کروانا تھا۔" وہ چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولا۔
 "اور۔۔۔" مٹان کی یہ لمبی سی "اور" بڑی معنی خیز تھی۔۔۔ جس پر میسٹی مزید الجھ کر بولا۔
 "میں سوچ رہا ہوں کہ عامر بھائی جیسا آدمی اس لڑکے پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہا ہے؟"
 "اس کی وجہ میرے ذہن میں آ رہی ہے، بتا دوں؟" مٹان نے شرارت سے میسٹی کا کبیر چہرہ دیکھ کر
 استفسار کیا تو اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلادیا کہ وہ دلائی یہ تھی سلجھا مچا رہا تھا۔
 "تو نہیں ڈولی کا اطلاق اس لڑکی سے تو نہیں جسے اس روز نامہ بھائی نے اپنے کمرائٹ پر بار کھا تھا۔"
 "کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" میسٹی بڑے بھرپور انداز سے یوں پوچھا گویا اس کے ذہن میں بھی کہیں نا کہیں یہی
 نکتہ موجود تھا۔

"اب اس اندازے کی تصدیق تو موصوف سے مل کر ہی کی جاسکتی ہے۔" مٹان تبسم لہجے میں بولا۔
 "تو کیا کہتے ہو؟" میسٹی نے مشورہ مانا تو مٹان نے اس سے کہا۔
 "کیا ہر تہ ہے؟" وہ ترنٹ بولا۔ "دیکھیں تو کسی کے ہمارے تیا س کے گھوڑے درست سمت میں دوڑ رہے
 ہیں یا نہیں۔"

digest novels lovers group

دل امید توڑا ہے کسی نے
 سہارا دے کر چھوڑا ہے کس نے

"تم سر میسٹی کے رشتے دار ہو؟"
 عام حالات میں، ورنی نہیں، خود سہراب اسے کال کر لیا کرتا تھا مگر آج یوں کہ بات ذرا مختلف تھی اور پھر
 بیٹا بھی اپنے گھر لوٹ چکی تھیں سو جوں ہی رات ہوئی، ورنی نے بیٹا کے کمرے میں بند ہو کر سہراب کو فون مارا کہ
 بڑی بے صبری سے چھوٹے ہی سوال کر ڈالا تھا۔
 "اور کیا بتایا اس نے؟" اگرچہ اس وقت بھی وہ ہنوز "کیف و سرور" ہی کی
 کیفیت کے زیر اثر تھا، مگر یہ نام ہی ایسا تھا کہ جسے سن کر اس کا "بھانجھا" نشہ فوراً ہی برن ہو گیا۔
 "بس یہی کہ تم ان کی بھانجھی کے بھانجے۔۔۔ اور۔۔۔" وہ آگے بڑھ کر کہتے کہتے یک دم خاموشی سی ہو گئی۔
 اور اس کی دانستہ اختیار کی گئی اس خاموشی نے سہراب کو بڑے بھرپور انداز سے چوٹا مار دیا۔
 "اور؟" اس نے بے چینی سے جاننا چاہا۔
 "اور۔۔۔" وہ کچھ ہلکا پھٹ سے بولی۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ تم خطرناک ہو۔۔۔"
 "سالا بکو اس کرتا ہے۔۔۔" وہ یہ سن کر اچانک ہی آپے سے باہر ہو کر بے طرح دھاڑا تھا۔۔۔ ورنی اس
 کے اس انداز پر بششدر ہو گئی۔

"سہراب؟" اس نے ٹوکنا چاہا پھر وہ متوجہ ہی کب تھا؟ سو اس کی پروا کیے بغیر بے غلط بولے گیا۔
 "وہ خود ایک لبر کا آوارہ اور بدکردار ہے۔ مجھے تو سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ سارے زمانے میں آخر جس میں وہی
 کیوں مائنڈ ٹن پڑنے کے لیے؟" اور سہراب کے اس سوال کا جواب چونکہ ورنی کے نہیں، کاتب تقدیر کے پاس
 تھا، سو وہ بے حد غضبناک ہو کر بولی۔

"مجھے کہاں لگنے تھے۔۔۔ یہ تو عباد بھائی کے دوست ہیں۔"
 "انہیں قتل نہیں ہے۔" اسے اور کچھ نہ مانتا تو اب عباد پر شروع ہو گیا۔
 "یہ کببہ دوست مال کے ہیں تمہارے عباد بھائی نے۔"

"یہ سب چھوڑ دو اور مجھے بتاؤ کہ میں اب سرخسٹی کا کیا کروں؟" وہ چڑ کر بولی۔ "وہ تو مہادیو بھائی کو سب بتا دینے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

"یعنی اب تک اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا؟" اس مرے میں پہلی بار سہراب کے دل نے کچھ اطمینان محسوس کیا۔

"ابھی تک تو نہیں....." وہ بولی۔ "بس مجھے وارن کیا ہے کہ میں تم سے بات چیت ختم کر دوں۔"

"اس خدائی فوج دار کو تو میں بتاتا ہوں۔" وہ تیزی سے کچھ سوچتا ہوا ہوا۔

"پر بتاؤ گے کیا؟" درٹی نے متشکر ہو کر پوچھا۔

"وہ سب تم مجھے پر چھوڑ دو۔" وہ شاطر لہجے میں ہوا۔ "اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں بس اس پر عمل کرتی جاؤ۔"

ہٹا ہٹا

"ڈیم اٹ۔ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا....." امیر علی خان کی زبانی، راجپوت اور بی ڈی کے مابین ہونے والی گفتیشی ملاقات کی تفصیلات جان کر قاروق احمد از حد پیش زدہ سے انداز میں میز پر زوردار ہاتھ مار کر بے ساختگی سے ہوا تھا۔

"تو تمہارا کیا خیال تھا؟" امیر علی خان خود بھی کچھ مایوس سے ہوئے تھے تاہم اس کی جذباتیت پر اسے ٹوکتے ہوئے بولے۔

"وہ دو چار معمولی سے سوالات پر گھبرا کر اتنی آسانی سے پکڑائی دے دے گی؟"

"نہیں سر....." وہ بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے ہوا۔ "مجھے ابھی طرح اندازہ ہے کہ اس کی پشت بہت مضبوط ہے۔"

"ہوں....." امیر علی خان نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہاتھ سہلاتے ہوئے ہر سوئی سے لہجے میں بھکارا بھرا۔ "سو تو ہے..... پر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟" اور مگر وہ دیکھتے ہی رو گئے مگر کچھ نہ ہوا۔

"سوائے اس کہ بی ڈی کی پہلی ہی فلم نے عالم گیر شہرت حاصل کر کے اسے جیسے راتوں رات ہر اشارہ بتا دیا۔"

ہٹا ہٹا

"تم یہاں ہو؟"

تاریکی میں ادبے میز پر پڑے جھولے میں بیٹھی رہا، ونڈ زفری کان میں اکائے ایف ایم پر نشر کردہ اپنے من پسند پروگرام "ستاروں بھری رات" میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی کہ اسے احوال دہائیوں کی آواز۔

"کیا ہوا؟" اب وہاں اتنا اندھیرا بھی نہ تھا کہ رجا سامنے کھڑی درٹی کو پہچان نہ پالی۔ تب ہی کچھ تعجب سے دائیں کان میں کھسا ونڈ زفری ٹال کر بیچیدگی سے بولی۔

"سارے گھر میں احوال دہائی میں تھیں۔" وہ اس کے برابر میں آہستگی سے براہمان ہوتے ہوئے بولی۔ "اور تم یہاں بیٹھی ہو....."

"یہ خاموش رات، میں اور تمہائی....." وہ سر جھٹک کر کس قدر دل گرفتگی سے بولی۔ "ہم تینوں تو روزی یہاں ہوتے ہیں۔"

"کیوں کیا اب ملتان کے ساتھ اندھیا کیرم کی بازی نہیں جیتی؟" کس قدر بے خبر ہو گئی تھی وہ ان دنوں اپنے ارد گرد سے..... اسے خود پر حیرت ہوئی۔

"بھئی....." اس کے چہرے پر محسوس سی احساسی بکھر گئی۔

جنگل جہنم شعلہ نومبر 2022

"دو کیوں؟" درنی نے تعجب سے پوچھا۔ اب وہ اس "کیوں" کا اسے کیا جواب دینا سوچتا ہوا بولنے لگا۔

"کیوں کو چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ آج تم نے کمرے کی جان کیسے چھوڑ دی؟" وہ طنز نہیں کر رہی تھی پر درنی ہنسنے لگا۔

"وہ..... کس..... آج پڑھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"ہاں آج تمہاری طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں۔" وہ بولی اور پھر ان کے درمیان خاموشی کا ایک مختصر سادقہ در آیا گو یار دونوں کے پاس مزید بولنے کو کچھ نہ بچا۔

"مجھے تم سے ایک بات شیئر کرنی ہے رجا۔" خاموشی کا دورانیہ طویل ہوتا دیکھ کر درنی ہی نے لب کشائی میں پہل کی تھی کہ رجا کا تو ایسا کوئی ارادہ نہ دکھائی دیتا تھا۔

"اچھا....." رجا اس کے غیر معمولی انداز پر چونکی تو ضرورتاً ہم ظاہر کیے بغیر سپاٹ سے لہجے میں بولی۔ "تو کرو۔"

"پہلے وعدہ کرو....." درنی بے چینی سے پوری کی پوری اس کی جانب گھوم کر پریشان کن لہجے میں بولی۔ "تم سن کر مجھے ملال نہیں سمجھو گی۔"

"ایسی کیا بات ہے درنی؟" اس بار اس نے جملہ ہی ایسا کہہ دیا تھا کہ اس نے رجا کو یا سب کچھ فراموش کر کے درنی کے لیے پہلے والی رہبان کی تم جانا جانتی ہو کہ آج..... آج میرے ساتھ کیا ہوا؟" اس نے سوچنا بھی بلک سوچا، سمجھ کر اسے "سمجھائی گئی" تمہید باندھ لی۔

"کیا ہوا تھا؟" رجا فون بند کر کے ایک جانب رکھتے ہوئے ہر تن گوش ہوئی۔

"وو..... وہ سرخسہ....." وہ انک انک کے بتانے لگی۔ "انہوں نے زبردستی مجھے لٹے بلایا تھا۔"

"کیا؟" حیرت، بے چینی، غصہ، ماتمف..... کیا نہیں تھا رجا کے اس ایک "کیا" میں۔

"ہاں رجا....." وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ فون بھی انہوں نے مجھے زبردستی دیا تھا۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ..... وہ اتنے دن سے مجھے ہراساں کر رہے ہیں۔"

"اوہ میرے خدا....." رجا نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

"اور تم اتنے دن سے یہ سب لیس کر رہی ہو....." چند لمحوں بعد وہ اس سے ملحد ہوتے ہوئے اسے بڑے بھروسہ و انداز سے ڈپٹ کر بولی۔

"تو اور کیا کرتی میں؟" بتا نہیں کیا بات ہوئی کہ وہ اس وقت حقیقتاً رو پڑی تھی۔

"مجھے بتائیں۔" وہ بے حد شش بھرے لہجے میں بولی۔

"نہیں بتا سکتی تھی۔"

"کیوں نہیں بتا سکتی تھیں؟"

"کیونکہ انہوں نے..... انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی۔" وہ بچھے ہوئے لہجے میں بولی۔ اور اس سے قبل کہ رجا جو ایک کوئی رد عمل ظاہر کرتی۔ ان دونوں کے عقب سے ایک نمبر سے بھرپور آواز ابھری تھی۔

"کیسی دھمکی؟"

دونوں نے بیک وقت بے طمرن چونک کر آواز کی سمت دیکھا تھا

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

۲۰۲۲

حقیقتاً شوال ۱۴۴۳ھ نومبر ۲۰۲۲ء

سبک روی سے چلتی ٹھنڈی ہوا میں ماحول کو
بے حد خوش گوار بنا رہی تھی۔

قرۃ العین سکندر



وہ اپنے جمولے پر چنگ بنی جمول رہی تھی۔
جب اچانک ہی اس کے پاؤں سے کوئی شے
نکرائی تھی اس نے چونک کر جمولے کو بمشکل روک کر
اس شے کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ پتھر میں لپٹا کوئی کاغذ
تھا۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا اور اسے
اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپا کر غیر محسوس طریقے
سے چھت کی طرف دیکھا تھا۔

سامنے والے گھر کی بالکونی میں اسد کھڑا ہے
ہی مسکرا کر دیکھ رہا تھا یہ لوگ عزیز دار تھے۔ پرانی
جان پہچان تھی۔ مگر حال ہی میں ادھر شفٹ ہوئے
تھے۔ وہ لفظ محبت سے بالبد ضرور تھی۔ مگر اماں کے
ساتھ مستقل مزاجی سے ٹی وی دیکھ دیکھ کر وہ کئی باتوں
کو وقت سے پہلے ہی سمجھنے لگی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے
دل کے ساتھ اندر کمرے میں بھاگ گئی تھی کہ سامنے
سے آتے ہوئے علی سے جا ٹکرائی تھی۔

”اندھی ہو کیا نظر نہیں آتا؟“
علی کے ماتھے پر چوٹ لگی تھی اور اس کے
پاؤں پر وہ چڑھ گئی تھی۔

”ایک تو اس لڑکی کو نبھانے کب عقل آتی ہے میں
کہتی ہوں لڑکی ذات ہے سنبھل کر چلا کر اے
عذرت! سن اپنی بیٹی کو کوئی ادب آداب سکھا۔“ دادی
جان کے پتھر پر ٹی وی میں ڈوبی عذرت نے برا
سامنے بنا کر اماں کی طرف دیکھا ضرور تھا مگر دوبارہ ٹی
وی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

علی کرکٹ کھیلنے چلا گیا تھا جبکہ دعا کمرے میں
کھس گئی تھی۔

عالیہ بیگم نے تاسف سے بہو کی طرف
دیکھا تھا۔ جیسے ہی ٹی وی پر مظلوم بہو کے ڈائلاگ
آنے لگے تو عذرت نے تیزی سے ٹی وی کا وائیم
بڑھا دیا تھا۔ ”جب کسی کی بیٹی بیاہ کر لائی جاتی ہے،
اس پر ظلم کیا جاتا ہے تب یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ گھر

میں اپنی بچی کو کی بچی بیاہنے کے قابل ہے۔“
اور لی وی میں بہو کے اس ڈائلاگ کے بعد
باس نے اس کے منہ پر زور دیا چاٹا رسید کیا تھا بہو
فل میک اپ میں نیر بہا رہی تھی۔ عذرت نے کن
اکھیوں سے ساس کو دیکھا تھا۔ جبکہ عالیہ نے دکھ سے
گہری سانس بھری تھی۔
عذرت اس بات سے قطعی طور پر بے خبر تھی کہ

امدراش کی جٹی لویٹر پڑھ کر آنے والے دنوں کے منصوبے بتا رہی ہے۔

☆☆☆

مندست تیزی سے دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہار ہار مضطرب انداز میں کچن سے باہر ملحق لابیج میں لگے ہوئے وال کلاک میں وقت دیکھ رہی تھی۔ آج وہ علی کا من پسند آلو گوشت بنارہی تھی۔ دعا بھی کھا تو جتنی بھی مگرایے بھنا ہوا گوشت پسند تھا۔ وہ شور با پسند نہیں کرتی تھی اس لیے وہ خوب اچھی طرح سے گوشت کی بھنائی کر رہی تھی۔ مگر اس کے ذہن میں بیک وقت بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ مگر اسے زیادہ سرعت سے کام نہتا کر رات کا لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے مٹ ہو جانے والا ڈراما نشر مکرر میں دیکھنا تھا۔

اتفاق سے بچیوں کے گھر آنے کا بھی یہی وقت تھا۔ علی میٹرک میں تھا اور وعاسیکنڈ ایئر کالج کی طالبہ تھی وہ قدرے توقف سے گھر آتی تھی۔

اس نے بھنا گوشت تھوڑا سا ٹکال کر الگ
 ہاؤل میں رکھ دیا تھا۔ اور باقی گوشت میں آلو ڈال کر
 شوربا بنادیا تھا بلی آج پر ڈھک کر وہ آٹا گوندھنے لگی
 تھی۔ جب اس کی سانس نے کچن میں جھانکا تھا۔
 ”بہو! کافی دیر پہلے چائے کا کہا تھا کیا نی
 نہیں۔“ دوستی بھر کر بد مزہ ہوئی تھی۔

جی بتا رہی ہوں، آپ سکون سے بیٹھ جائیں۔" عذرت نے تیز لہجہ میں کہا تھا اس کے لیے تو ایک ایک لہجہ ہیستی تھا۔

”میں کہتی ہوں..... ان ڈراموں میں کچھ نہیں رکھا، اپنی بچی پر بنگا رکھو یہ عمر بہت نازک ہوتی ہے۔ صبح دوکان چلے جاتے ہوئے لب اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگا کر گئی ہے۔ کیا کنواری لڑکیوں کے یہ چھن ہوتے ہیں۔ کچھ کرو ایسا نہ ہو کہ گیا وقت ہاتھ نہ آئے۔“

سپاس کا ادا کیا تھا کہ عزت کو تو گویا پتھے ٹنگ گئے تھے، اس نے وہی آنے والے ہاتھ کسر پر رکھتے

ہوئے سخت لہجہ میں ساس نے دو بدو ہو کر کہا تھا۔
 ”نہ آپ صاف صاف یہ کیوں نہیں کہیں
 آپ کو میرا بیوی دیکھنا کھٹا ہے اور عامر نے بیوی
 میرے کمرے میں لگا دیا جبکہ آپ چاہتی تھیں کہ ادھر
 برآمدے میں لگ جائے، آپ کی نہیں مانی تو اب
 میری محسوم بیٹی کو بدو عا میں دینے پر اتر آئی ہیں۔
 بدورت کی زبان کے آگے تو خدق بھی اس نے
 ساس کو سنا دیں۔

مگر حال یہ اس قدر بدتمیزی کے بعد بھی لب
بستہ صبح کے دانے پھیرتی ہوئی اپنے کمرے میں
داخل ہوئی تھیں۔ اب کہاں کی چائے کہاں
کا ہوش.....

عذرت فطر نام ایک نیک دل لڑکی تھی جب ہوا کہ اس گھر میں آئی وہ سیدھی سادی تھی۔ رفتہ رفتہ ارد گرد کے ماحول اور نت نئے سازشی ڈراموں سے وہ سانس بہو اور نند بھانج کی گیم کھیلنے لگی تھی۔ وہ بڑھاپا کہتی تھی کہ یہ اصلاحی ڈرامے ہیں۔

اور واقعی وہ ڈرامے اصلاحی ہی ہوا کرتے تھے مگر وہ اینڈ تک ممبر کیے بتانے جسے کے اور اپنی طرف داری پر چند چنیدہ ڈرامے گھر میں فال والیوم بر لکھا کرتی تھی۔ وہ تو ان سے بھی کوئی نصیحت حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی وہ بس چاہتی تھی کہ ساس اور سند کو ہر صورت نیچا دکھائے۔ جب ساس کے حق یا وقوع میں کوئی سین آتا تو وہ جھٹ جھیل بدل دیا کرتی تھی۔ معاشرے میں جنم لینے والی کہانیاں معاشرے کی عکاس ہوتی ہیں، کچھ اس انداز میں کہ انسان اصلاح معاشرہ کی طرف پہلا قدم رکھے مگر وہ تو بس آنکھ بند کر کے اپنی من پسند راوی پر کاغذ رزتی تھی۔ اور اس معاملے میں وہ کسی کی بھی نہ سنتی تھی۔

☆☆☆

اس دن بہت دیر ہو گئی مگر دعا کر نہیں سکی۔۔۔۔۔
 شام ڈھانے کو گئی۔ تب دعا کی ایک دو دستوں کو فون
 کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو دو دن سے کالج تھا نہیں
 آ رہی ہے۔ اب تو ندرت کی جان نکل گئی۔ اللہ تعالیٰ !

نے تو یہ کے دروازے اسے بندے پر کھول رکھے
ہیں وہ تو کہتا ہے۔ ہے کوئی مانگنے والا کہ اس میں
اسے نواز دوں۔

اس وقت عمامت کے آنسو موتیوں کی طرح
اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ ساس طعنے دینے
کے بجائے حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

”لو یہ گلو کوڑ والا پانی پی لو پھر تمہارا بی بی
لو ہو جاتا ہے۔“

”ہائے اماں اعلیٰ کے ابا گھر آنے والے
ہیں۔ میں ان کو کیا جواب دوں گی۔“

”ایسا کریں اس پانی میں زہر ملا دیں تاکہ یہ
قصہ ہی ختم ہو۔“

وہ مسلسل بدور رہی تھی۔

”توبہ کرو بہو۔ ایسے نہیں کہتے۔ اللہ تعالیٰ بہت
مہربان ہے وہ اپنے بندوں پر بھی غم نہیں کرتا ہاں مگر
جو وہ خود اپنی جانوں پر کر بیٹھتے ہیں۔ تم معافی مانگو،
مدد مانگو وہ ضرور سنتا ہے۔“

عمرت آج شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔
ڈراموں اور اصل زندگی میں زمین و آسمان کا فرق
ہوتا ہے۔ ساس کی باتوں سے اس کے دل کوڑھار
بند ہو گئی تھی۔

اسی وقت دعا علی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی
تھی۔ دعا کانپ رہی تھی اس کے چہرے کا رنگ اڑا
ہوا تھا۔

”اس کو میں قریبی کہنے میرا سے لایا ہوں،
سامنے والے اسد کے ساتھ ہیز اکھا رہی تھی۔“ یہ
سننے ہی عمرت کے تواضع کی امتیاز رہی تھی۔ وہ
کچھ سخت سست کہنے اور مارنے والی تھی جب گھر میں
عامر داخل ہوئے تھے۔

”یہ دعا کیا اب آئی ہے کالج سے۔“
اس سوال پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔
جب عالیہ نے بیٹے بڑے سجاد سے کہا تھا۔
”گھر تو آئی تھی۔ اب علی کے ساتھ دوست
کے گھر کچھ لو کس لینے گئی تھی اس کا بیٹہ ہے۔“

اماں کے سامنے عامر کچھ نہ بولے اور محنت میں لگے
تنگے سے منہ ہاتھ دھونے لگے تھے۔

عالیہ کے اشارے پر سب اپنے اپنے کام میں
لگ گئے تھے۔

دعا جھٹ کمرے میں چلی گئی تھی اور عمرت
ساس اور شوہر کے لیے چائے بنانے لگی تھی۔

آج عمرت نے چلی مرتبہ دل سے عالیہ کے
لیے چائے بنائی تھی۔

اور تب اس کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹے پٹی
تھی، جب عامر نے کہا۔

”اماں! اپنی دعا کے لیے فرجاد کے بیٹے اسد کا
رشتہ آیا ہے۔“

”ارے اسد تو بہت اچھا لڑکا ہے تم فوراً ہاں
کہہ دو۔“ عالیہ کی بات پر عمرت نے ساس کو ممنونیت
سے دیکھا تھا۔ عامر نے ہنکارا بھرا تھا۔
”مگر ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔“

دوستانہ ہوئے۔

”دیکھو بچیاں مناسب وقت پر اپنے گھر کی
ہو جائیں تو اچھا ہے بعد میں بے شک پرہمتی
رہے۔“

اماں کی بات پر وہ مسکرا کر بولے تھے۔

”ٹھیک ہے اماں! پھر کل ہی چلتے ہیں بات
ہمیں کر آتے ہیں۔“

عمرت کی آنکھ نم کر لپ مسکرا رہے تھے اور دعا
امیر اللہ سے کہتی تو یہ کر رہی تھی کہ گمراہی کے رستے
سے بچ گئی۔ اس نے اسد سے واشگاف گفتگوں میں
کہا تھا کہ وہ اب اس سے روز روز مل نہیں سکتی،
سیدھے راستے سے رشتہ بھیجے وہ خوش تھی۔ اور اللہ
تعالیٰ نے اس کا پردہ رکھ لیا۔

اس نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی
گمراہی کے گڑھے میں نہیں گرے گی۔

وہ آنسو پونچھ کے عزم کر چکی تھی۔ کل کی معافی
کی تیاری بھی تو کرنی تھی۔

☆☆



”کچھ لوگوں کو دیکھ کر تو پہلی ہی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے بڑے ہی پسندیدہ ہیں۔ یعنی ہر لحاظ سے نوازے گئے۔ مکی حلال کمائی، بڑے دل والے، لوگوں کے کام آنے والے، خوش اخلاق، خدا ترس، دیکھنے سننے میں اچھے، تعلیم، خاندان، صحت، شکل و صورت..... کون سی نعمت ہے جو نہیں ملی ہوئی اور پھر اور پھر.....“

دوسری بار ان پر غور کریں تو کتنا عجیب لگتا ہے کہ اس قدر ہر طرح سے نوازے گئے اس مرد کو بھری دنیا میں کوئی اللہ کی بندی نہ ملی کہ جس کو وہ نوازی گئی ان نعمتوں میں اپنا حصہ دار بنا سکے۔ یہ نہیں کہ شادی محض ایک ضرورت ہے بلکہ یہ بھی تو ہے کہ ایک اس عمل میں اللہ تعالیٰ نے ایک بہت ہی عمدہ، خوب صورت اور دل گداز سا فلسفہ رکھ چھوڑا ہے۔ ایک مرد کے لیے یہ کتنا اچھا اور دلچسپ احساس ہو سکتا ہے کہ وہ کسی جیتے جاگتے، سانس لیتے، دل رکھتے انسان کی کفالت اپنے ذمہ لے رہا ہے۔ نجانے کتنے ہی مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ کچھ جو صرف نظروں سے اپنی ضروریات بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی آپ اس قدر تو ان کے لیے نہیں کرتے کہ اپنے ہر مال و دولت میں اس کو حصہ دار بنائیں۔ صدقہ خیرات بھی کرتے ہیں تو ایک حد تک صرف وہ ایک عورت ہوتی ہے جس کو آپ اپنے نکاح میں لیتے ہیں اور اس طرح وہ آپ کی زندگی میں شامل ہوتی ہے کہ آپ کے وقت، دولت، صحت، عزت اور گھر تک میں آپ کی باقاعدہ حصہ دار بن جاتی ہے اور آپ اس کی پوری ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس کی عزت، اس کا رکھ رکھاؤ، ہنسی خوشی سب کچھ آپ سے منسوب ہوتا ہے۔ بہت حیرت ہوتی ہے اس طرح کے مکمل مردوں کو دیکھ کر جو شادی کے نام سے کترانے لگتے ہیں یا اپنے بڑوں کے شادی کرنے کی تلقین کرنے پر طنز یہ قہقہہ لگاتے ہیں آخر اس میں کیا راز ہے؟“

آخری جملے پر اس نے نظریں جمکالی تھیں۔ گو اب تک اس پورے پھر کے دوران اس نے ایک بار



بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ مخاطب مجھ سے ہی تھی۔ میں مسکرایا۔

یہ جو طعنیہ قہقہہ لگانے والی بات اس نے مجھ پر ہی کی تھی اس کا جواب دینا تو لازمی تھا۔ اس جملے نے ہی تو محفل میں بننے والے اس چھوٹے سے حلقے میں اس کی بات سننے والے ہر ایک کو میری ہی طرف متوجہ کر دیا تھا.....!

”شاید اس لیے کتراتے ہوں کہ ایک عورت جس کو وہ عزت و احترام کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کریں اور جس کی کفالت بھی اپنے ذمہ لے لیں اور وہی عورت احسان مند ہونے کے بجائے نہ تو شوہر کی عزت کا خیال کرے نہ ہی شوہر کے گھر والوں کا۔ بلکہ الٹا یہ جتانے میں لگ جائے کہ شادی کر کے اس نے احسان کیا ہے.....؟“

میرے بروقت جواب پر چند ایک شادی شدہ مردوں نے بڑی ہی خوب صورتی سے اپنے ہونٹوں پر بے اختیار آبی مسکراہٹ کو چھپالیا۔ جبکہ ان کے ارد گرد منڈلائی ان کی بیگمات نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اور اب باقاعدہ محفل کی توجہ اس کی طرف پلٹ گئی تھی، محبت سمیت سب کو اس کے جواب کا انتظار تھا۔

”آزمائش صرف میرے عزت اور صحت کی نہیں ہوتی۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہر نعمت جو ہمیں دی گئی ہے زندگی کے کسی سوڑ پر کہیں نہ کہیں اس کی آزمائش بھی لازمی ہوگی اور حسن سلوک کی عادت بھی ایک نعمت ہے۔ جس کی آزمائش بھی ہوئی ناں کہ ہمیں ہر دم کوئی ایسا ٹکرائے جو ہمارے حراج پر بھاری پڑے۔ جو ہماری برداشت کو آخری حد تک آزمائے۔ کیا معلوم وہ عورت اپنے شوہر کے حسن سلوک کی آزمائش ہو؟“

میں لا جواب تو نہیں ہوا تھا مگر اس سے بحث در بحث کرنے کا ابھی ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا کیونکہ میں اس کے پھلے بھائی کی بیوی کو تیار سے حلقے کی طرف آتے دیکھ چکا تھا اور یہ تو ہم سب ہی جانتے تھے کہ

اگر اس کی بھابھی نے اسے اس طرح ہم سب سے بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو اس کے ساتھ محفل میں ہی وہ سب ہو جائے گا جو اکثر اوقات شرارتی ہنسون کے محفل میں بدتمیزی کرنے کے بعد گھر جانے پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ میری دونوں بڑی بہنیں بھی اپنے شوہروں کو لیے تیزی سے حلقے سے نکل گئیں۔

اس کی بھابھی طعنیہ ی مسکراتی ہم کچھ بچے ہوؤں پر نظریں ڈالتی آگے بڑھ گئی۔ اس کے سامنے سے گزرنے پر شاید اسے بھی ہوش آیا اور وہ بھی برقی رفتار سے اٹھ کر ہم سب سے اجازت یا معذرت کے بغیر اس کی طرف چلی گئی۔ جس کے ارد گرد بچے صوفوں پر اس کے خاندان کے بقایا لوگ بڑے ٹھسے اور رعب سے بیٹھے ہوئے تھے۔

ہم دونوں خاندانوں میں کئی سالوں سے ملنا ملنا تو کیا سلام دعا تک بند گئی۔ وجہ اس کی وہی جو عام رشتہ داری میں ہوتی ہے۔ دونوں طرف لڑکیاں تھیں اور لڑکے بھی اور دونوں طرف صرف لڑکوں کو حاصل کر لینے کی خواہش تھی جبکہ لڑکیوں سے ہر ممکن اجتناب برتا جاتا تھا۔

ایک دو بار بڑی مصیبتوں اور جتن کے ساتھ کسی لڑکے اور لڑکی نے اپنے والدین کی پسند ناپسند کو نظر انداز کر کے اگر رشتے کی بات چلائی بھی چاہی تو اس قدر ہنگامہ، فساد اور جھگڑا ہوا کہ شادی تو دور کی بات..... ناچاقی دو چند ہو گئی۔ حیرت بھی ہوئی، کبھی کہ کیا ایک ماں کے دو بچے آپس میں گئے بھائی بہن کے درمیان زندگی میں اس قدر دوریاں بھی آ سکتی ہیں کہ ایک دوسرے کی اولادوں سے نفرت محسوس ہونے لگے؟

پھر بھی جان ویسے تو کافی سمجھ دار پڑھی لکھی اور بردبار تھیں مگر نجانے ان کی ساری عقل مندی اور دانائی ایک ہماری امی جان کے سامنے آتے ہی جیسے پاتال میں جا گر لی اس طرف امی جان کا بھی ایسا ہی کچھ حال ہوتا۔ خواتین کی ہاں میں ہاں ملانے کے

لیے ان کے جوان ہوتے کچھ بچوں نے بھی اپنا اپنا کردار بھرپور نبھایا۔

ایسا نہیں کہ یہ ناچاتی ہمیشہ سے تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں شاید آٹھویں میں پڑھتا تھا تو امی جان مجھے تیار کر کے بہت سے تحفے تحائف اور مٹھائی وغیرہ لے کر پھوپھی جان کے ہاں پہنچی تھیں جن کے ہاں چار بیٹوں کے بعد ایک بیٹی آئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دونوں خاندان ایک دل دو جان تھے۔

امی جان اپنی نند پر جان چھڑکتی تھیں اور نند بھی بھابھی جان، بھابھی جان کرتے نہ سکتی تھیں۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور پھوپھی جان کے چاروں بیٹے مکمل مل کر بیٹھا کرتے تھے اور تب ہی کا وہ چند سالوں کا دور تھا جب میں نے پھوپھی جان کے ہاں اسے دودھ پیتی تھی سے بڑے ہو کر پاؤں پاؤں چلتے دیکھا۔ امی جان مجھے ہمیشہ ساتھ رکھتی تھیں۔ لہذا پھوپھی جان کے ہاں آنے جانے میں بھی میرا مانہ نہیں ہوا۔

اس کے چند سالوں تک ہمارے درمیان ایسا ہی بھائی چارہ رہا اور پھر پھوپھی جان کے بڑے بیٹے سلمان بھائی کی طرف سے جب بڑی باجی کے لیے پہلی بار پسندیدگی کے اشارے ملنے شروع ہوئے تو جیسے پھوپھی جان کی زبان میں بھی کانٹے اگنے لگے۔ ماں سلمان بھائی بڑے ذہین، صحت مند اور مضبوط مستقبل کے حامل نظر آتے تھے مگر بڑی باجی بھی کچھ کم خوب صورت اور جس کچھ نہ تھیں۔ پھر بھی پھوپھی جان کو نچانے اپنے بھائی کی سب سے بڑی بیٹی میں ایسا کوئی گمن نظر نہ آیا کہ جس کی بدولت وہ ان کی بہو بن سکتیں۔ بس پھر یہی وہ دور تھا جب پہلی بار دونوں خاندانوں میں گھمسان کی جگہ چھڑ گئی۔ چند سالوں ایک دوسرے کی شکلوں سے بے زار رہنے کے بعد پھوپھی جان کے انتقال پر امی جان کو پھوپھی جان سے ایک بار پھر محبت ہو گئی۔

☆☆☆

بڑی باجی اور سلمان دونوں کی قسمت کا فیصلہ

بھی ان کے والدین کی مرضی سے ہو چکا تھا لہذا میدان بھی صاف تھا مگر کب تک رہتا ایک بار پھر پھوپھی جان کے تیسرے نمبر کے صاحبزادے عیान بھائی کو ہمارے گھر میں اپنا محبوب نظر آنے لگا اور ایک بار پھر پھوپھی جان نے بڑی نخوت سے بیٹے کی خواہش کو رد کر دیا اور نتیجے میں دونوں خاندان ایک بار پھر جدا ہو گئے۔

دوسری بار کی جدائی کا دور میری غیر موجودگی میں آیا تھا۔ اس سے پہلے میں بڑا بن چھن کر لندن پڑھنے کے سلسلے میں جانے کی خوشی میں پھوپھی جان کے ہاں باقاعدہ اپنے خاندان سمیت کھانے پر مدعو بھی کیا گیا تھا۔

لندن میں رہائش کے دوران ہی امی جان نے ایک دن مجھے روتے ہوئے پھوپھی جان کا یوں عیان بھائی کا مکمل باجی کے لیے رشتے کے ٹھکرانے کا بتایا تھا۔ میں نے امی جان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جب ان کو معلوم ہے کہ پھوپھی جان اس ایک بات پر خوش نہیں ہوتیں تو آخر امی جان ہی اس ایک بات کو بار بار کیوں چھیڑتی ہیں؟ امی جان کا خیال تھا کہ دونوں خاندانوں میں اتفاق کی ایک یہی صورت ہے جبکہ ہمیشہ اسی ایک صورت کے پیدا کرنے کی کوشش میں دونوں خاندانوں کے درمیان اتفاق کو بری طرح نقصان پہنچا تھا۔

☆☆☆

میرے لندن سے پڑھائی مکمل کر کے واپس آنے پر امی جان اور پھوپھی جان میں پرانی دوستی جیسا تو کچھ نہ بچا تھا مگر ایسی دشمنی بھی نہیں تھی کہ ملنا ملانا ہی بند ہو۔ کسی مشترکہ رشتہ دار کی مغل میں ملاقات ہوتی تو دونوں اچھے سے بات چیت کر لیتیں۔

میرے آنے کے بعد پھوپھی جان نے بقول امی جان کئی سالوں بعد ہمیں اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ میں میری دونوں بڑی بہنیں جواب شادی شدہ تھیں اور مجھ سے چھوٹے دو بھائی سب ہی تو خوشی خوشی پھوپھی

ہے جس کے دل میں ہمارے والدین اور ہم سب کے لیے ابھی بھی ویسی ہی محبت اور عزت ہے جیسی امی جان اور پھوپھی جان کے درمیان تھی۔

اس کی باقاعدہ کئی ٹھوس وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اکثر ہم لوگ اپنے مشترکہ رشتہ داروں سے سنتے کہ زینت اپنی ممانی جان یا ماموں جان یعنی میرے والدین کو یاد کرتے رو پڑتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ امی جان یا بابا جانی کی برسی کے موقع پر اس کا فون آجاتا یا پھر دعا کا کوئی اہتمام جس میں باقاعدہ امی جان اور بابا جانی کے لیے خصوصی دعا کروالی جاتی۔

زینت کی شخصیت ہمیشہ سے ہی ایسی تھی یا سخت گیر شوہر کی بدولت وہ نرم پڑ گئی تھی، اس کا تو مجھے اندازہ نہیں کیونکہ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی اسے ایک انسان ایک عورت یا لڑکی کے روپ میں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی..... وہ تو بس امی جان کی پسندیدہ بیٹی تھی۔ بہت نازک اور حساس دل والی، فوراً نرم پڑ جانے والی۔

عموماً ایسے لوگوں کے دل صاف شفاف ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ دشمن اور ٹیڑھے مزاج کے بھی نہیں ہوتے اور شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آزمائش تو دیے گئے ہر جذبے پر نعمت کی ہوگی تو پھر اس جیسی نازک دل کی لڑکی کو اگر بد مزاج، بد دماغ اور اکثر شوہر مل گیا تھا تو یقیناً یہ اس کے صاف شفاف دل کی آزمائش ہی تو تھی۔

پاکستان آنے کے بعد میں اس کے شوہر کی آئے دن کی بدتمیزیوں کے بارے میں سن کر خاموش رہتا تھا اکثر ہی رشتہ داروں میں اس کے شوہر کی حالیہ کسی بدتمیزی کا ذکر چھڑ جاتا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اپنی ان حرکتوں کا پرچار بھی وہ خود ہی تمام رشتہ داروں کو فون کر کے کرتا تھا۔ اس نے چند ایسے رشتہ داروں کو خاص طور سے فون کرنا ہوتا جو اس کی نظر میں اس کی بیوی زینت یا اس کی بیوی کے خاندان سے خارج رکھتے ہوں۔ یوں بڑی باجی اس کے لیے بہت اہم تھیں ہر دو چار دن بعد بڑی باجی کو فون کرے کسی کم ذات

جان کے گھر جا پہنچے تھے۔ وہاں بھی بے حد والہانہ پن سے ہماری خاطر داری ہوئی اور تب مجھے محسوس ہوا کہ اب کی بار بھی ہمارے خاندان میں جدائی قریب ہے۔ کیونکہ پھوپھی جان مجھ پر واری صدمے جارہی تھیں۔

میں اس بات پر کافی حیرت زدہ ہوا تھا جب امی جان کو پھوپھی جان کے اس والہانہ پن پر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ انہوں نے تو واپسی پر باقاعدہ زینت کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت تقدس سے چوما بھی تھا۔ مگر کیا کرتے کہ زندگی کے اس ڈرامے میں دن بھی کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی صورت فک ہی پڑتے ہیں۔

بڑی باجی بے حد خفا تھیں اور ان کی بی بی باربار کی تلقین اور یاد دہانی کے سبب زینت ہمارے گھر کی زینت نہ بن سکی۔ میں چند سالوں کے لیے ایک اچھی نوکری کے سلسلے میں آسٹریلیا آیا ہی تھا کہ امی جان نے مجھے زینت کی شادی کا بتایا، ان کو ڈر تھا کہ میں پردیس میں اکیلا اس کی شادی کی خبر سن کر کچھ کر نہ پائوں۔

مجھے اپنی ماں کی معصومیت پر ہنسی آئی اور ایک دو بار اپنے دل کو ٹٹولا..... ایسا کیوں تھا کہ میں تو کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا مگر مسلسل میرے ارد گرد موجود ہر کسی کو میری بے حد پروا ہو رہی تھی۔ خیر دن گزرنے سے گزر گئے۔

☆☆☆

امی جان کے انتقال پر میں کئی سالوں بعد پاکستان لوٹا..... اس خاندان میں بھی اب ایسا کوئی نہیں بچا تھا کہ جو دشمنی ہونے پر بھی کبھی کبھار ہی کسی شکل دکھا جائے۔ اب جو کدورت پھوپھی جان کے بچوں نے اپنے دل میں ہمارے لیے بانی کی اس سے کہیں زیادہ میرے بھائی بہنوں کے دل میں ان کے لیے تھی مگر ہاں یہ بات بھی تھی کہ بڑی باجی سب سے اب ہم سب میں مشترکہ طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ پھوپھی جان کے خاندان میں ایک شخصیت ایسی ضرور

گھرانے کی لڑاکا عورت کی طرح زینت کے ساتھ کی گئی اپنی حالیہ بدتمیزی کا مزے سے تذکرہ کرنا نہ بھول۔

وہ سمجھتا تھا کہ شاید یہ سب باتیں ہمیں سرور کریں گی اور ہم سب زینت کی اسکی درگت پر دل سے خوش ہوتے ہوں گے۔ بڑی باجی بھی پریشان تھیں۔ کئی بار منع کرنے کے باوجود وہ فون کر لے سے باز نہ آیا۔

ایک روز اتفاق سے میں بھی بڑی باجی کے گھر پر موجود تھا۔ بڑی باجی کے پاس فون آیا تو انہوں نے چند لمحے سن کر بے دلی سے فون مجھے پکڑا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ شاید کسی مرد کو بات کرتا سن کر وہ شرمندہ ہو کر فون جلدی سے بند کر دے گا۔ مگر میرا نام سنتے ہی اس کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔ یعنی وہ میرے اور زینت بارے میں جانتا تھا۔

اب تو اس نے ایسی ایسی اندرونی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ زینت کا کزن ہونے کے ناتے تو کیا ایک مرد ہونے کے ناتے بھی مجھے بڑی غیرت آنے لگی۔ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ اس کا ساتھ زینت کے بد قسمت ہونے کی دلیل ہے۔

اس دن تو ہم سب بھائی بہن بڑی باجی کے ہاں کھانے پر مدعو تھے اور ہمیشہ کی طرح میری دونوں بھادھیں اور بڑی بہنیں مجھ سے شادی کر لینے جیسے ہنسی مذاق میں مصروف، ہیں مگر دوسرے ہی دن صبح ہی صبح مجھے بڑی باجی کا فون آ گیا اور انہوں نے کبیر آواز میں مجھ سے باز پرس شروع کر دی۔

ہوا یوں کہ میری بات سن کر زینت کے شوہر نے اسے گھر سے نکال باہر کیا اور اب اس کی ضد بھی کہ جب تک میں اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی نہ مانگوں وہ زینت کو واپس نہیں بلائے گا۔ ادھر زینت کے گھر والے ایک بار پھر ہم سب بھائی بہنوں پر بگڑ رہے تھے۔

معاملات کی سنگینی کا احساس ہم سب کو تھا مگر

میں کسی بھی طرح ایسے شخص سے ملنا نہیں چاہتا تھا جو فون پر اس قدر کھلے الفاظ میں زینت کے بارے میں ایسی مغلطات بک سکتا ہو، وہ میرے سامنے کیا کیا نہ کہے گا اور پھر میں کہاں تک خود کو روک سکوں گا۔ مجھے خود پر پہلی بار حیرت ہوئی تھی، ویسے میں اب تک خود کو بہت ٹینڈے مزاج کا شخص سمجھتا تھا مگر یہ عجیب بات ہوئی تھی کہ زینت کے بارے میں ایسی ویسی بات کے شروع ہوتے ہی میرا حراج گرم ہوا تھا۔

بہر حال میں نے بڑی باجی، بھائیوں، بہنوں اور دیگر رشتہ داروں کے اصرار پر بھی ملنے سے صاف انکار کر دیا اور یوں زینت بقول اس کے گھر والوں کے اب تک میکے میں براجمان تھی مگر یہ بات اب بہت حد تک دھوکے سے بھی گردش کر رہی تھی کہ زینت کو اس کے شوہر نے اس دن طلاق دے کر بھیجا تھا اور میری معافی اور شوہر سے ملنے والی بات محض اس کے شوہر کی ایک شرارت تھی۔

زینت نے چند دنوں کم مہم رہنے کے بعد اپنے بھائی بہنوں کو خود پر گزر چکے سانچے کے بارے میں بتا دیا تھا اور اس کے گھر والے کسی نہ کسی پر زینت کی تباہی کی ذمہ داری ڈالنے پر تلے ہوئے تھے اور مجھ سے بڑھ کر اچھا بھائی ان کو کوئی ملا نہیں تھا۔

اس بات کو آج محفل میں ایک بار پھر اس طرح باور کرایا گیا کہ جیسے ہی ہمارا خاندان ہال میں داخل ہوا، زینت کے خاندان والے ہم سب سے کترا کر اس کے پاس بچے صوفوں پر جا بیٹھے تھے۔ زینت کے اٹھ کر جانے پر میں سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے آج ہا قاعدہ آ کر مجھے یہ کیوں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مجھے شادی کر لینا چاہیے۔

کیا وہ خائف تھی.....؟ مجھے اتنا تو اندازہ تھا کہ چار بھائیوں کے درمیان ایک طلاق یافتہ نند کو کیا کیا سہنا پڑتا ہو گا جبکہ اس کے ماں باپ بھی نہ ہوں۔ ایسے میں چھوٹے سے چھوٹا اسکینڈل بھی اس کے خاندان میں اس کے کمزور اور نازک مقام کو بہت نقصان پہنچا سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ہی کیوں ڈر رہی

تھی؟ میں نے تو اب تک کسی رشتہ دار کے سامنے اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ اسے جب میں نے پہلے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو اب کیسے پہنچا سکتا تھا۔

ہاں یہ الگ بات کہ بڑی باجی کو آج کل اس پر کچھ زیادہ رحم آنے لگا ہو اور وہ ہر دم اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتی رہتی تھی اور انہوں نے ہی تو مجھے اس کی علیحدگی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور لوگ چند لمحوں میں ہی کھانا کھانے میں مگن ہو چکے تھے۔

زینت ایک خالی میز کے پاس اکیلی نظر آئی تو مجھے موقع مل گیا۔ میں اس کے پہلو میں پہنچا ہی تھا کہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”میں شاید چند دنوں بعد واپس آ بیٹھتا ہوں۔“

اس نے بے اختیار پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں نمی آئی تھی یا مجھے دھوکا ہوا تھا بہر حال اس نے فوراً ہی مجھ سے نظریں پھیر لی تھیں۔

”چاند گرہن بہت چھوٹے سے وقفے کے لیے ہی ظہور پذیر ہوتا ہے مگر بس وہی لمحہ ہوتا ہے چاند سے سورج کے ملاپ کا..... اور دونوں کے اتنے کم سے وقت کے ملاپ پر بھی زمین والوں میں کھلبلی مچ رہتی ہے کچھ مراسیمہ اور کچھ بے چین رہتے ہیں۔ کون جانے دونوں کا ملاپ زمین والوں کے لیے کیسی ہی آزمائش لے آئے؟“

میں اپنی عیبات پر حیران ہو گیا تھا۔ یہ میں کیا اور کیوں کہہ رہا تھا اور وہ بھی اس سے جس سے شاید کبھی اس طرح کی کوئی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ زیر لب مسکرا دی تھی۔

”بہت شکریہ!“

دو لفظ کہتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی تھی اور مجھے بہت بے چین کر گئی تھی۔ جدائی پر کوئی کسی کو شکریہ کیسے کہہ سکتا ہے؟ ہاں صرف اس وقت جب کہ جدا ہونے والا کوئی بہت ہی نامناسب اور ناپسندیدہ شخص ہو جس

کے جدا ہونے سے ہی ہمیں سکون ملنے کی امید ہو۔ مجھے پہلی بار اپنی قسمت کے اچھے ہونے پر شک سا ہوا تھا۔ چند دنوں بعد میرے واپس جانے کی بات پر بڑی باجی ملاتال پھر گئیں۔

”یہ کیسے اور کیوں کرو گے تم؟ اتنی بزدلی دکھاؤ گے اب؟“

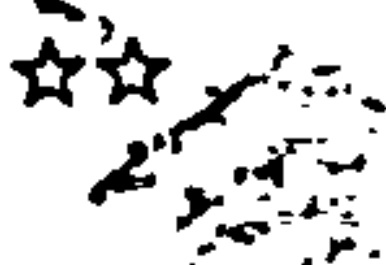
بڑی باجی کے اس سوال پر میں حیران ہو گیا۔ آسٹریلیا جانا بزدلی ہے؟ میں نے پوچھنا چاہا مگر خاموش رہا، آج کل ہر کوئی مجھ سے نجانے یوں پہلیوں میں کیوں بات کرنے لگا تھا۔

آخر بڑی باجی نے ہی بات بدھائی۔

”چند دنوں بعد جانا ہے تم کو میرے ساتھ پھوپھی جان کے گھر..... زینت کا باقاعدہ رشتہ مانتے۔“ میں نے گھبرا کر پہلو بدلا۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ ہم اپنے والدین کی خواہشات کے آگے مجبور ہوئے۔ کبھی اپنی ہی خود غرضی میں اپنا نقصان کر بیٹھے مگر اب وقت بدل گیا ہے۔ تم دونوں نے ہی اپنی اپنی جگہ بہت کچھ آزمائشیں سہہ لی ہیں۔ بہت مشکل حالات سے گزر چکے ہو۔ میرے خیال میں اب تم دونوں کے اوپر خاندان یا رشتہ داروں کی بلا وجہ کی زور زبردستی کوئی اثر نہیں کر سکتی۔ ان دونوں خاندان کے ملاپ کے لیے تم دونوں کا ایسا ہی مضبوط، ایسا ہی سخت جان ہونا ضروری تھا۔ میں زینت کو جانتی ہوں۔ وہ اس وقت بھی لڑنے کی طاقت رکھتی تھی اگر تمہاری طرف سے اسے مثبت اشارہ ملتا۔ مگر اب تم کو ہی ہمت دکھانی ہے۔ اب وہ وقت آن پہنچا ہے۔“

پھر وہ مجھے بہت ہی تفصیل اور سہولت سے ایک ایک بات سمجھانے لگیں اور میں..... میں یہ بات سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کس قدر مشکل لگتا ہے مگر اتنا ہی آسان ہے انسان کے لیے پرانی رنجشیں بھلا کرنے سے رشتوں کو جوڑنا۔



اکھان دل ہی صبیحہ دے گئے

نظر میں آئے پان کھا کر مجھے اپنی طبیعت تھوڑی خراب کرنی تھی۔ "عمار نے ہو بہو تائی سروری کی پوٹے منہ کے ساتھ نعل اتاری تو سب کی بھوڑی ہنسی سے لٹکا گونج اٹھی۔

"حالاں کہ تمہاری تائی تو وہ بخیل ہستی ہے جو کسی کو اپنا بخار بھی نہ دے۔ ساتھ پان تو اس نے لڑی زردگی میں نہ کھائے ہوں گے۔ ایک پان کو چٹکی چٹکی کھاتے ہفت نکال دیتی ہے۔" اماں نے تائی سروری کے خرید گن گتوئے تو سب نے ان کی تائید میں اپنی موٹی گردنیں پورے دُور سے ہلائیں۔

"چل اب ماموں شرف کا کارڈ بھی لکھ دے، سکا نہیں ہے تو کیا ہوا؟ سکول سے بڑھ کر چاہتا ہے چھپس۔ بہن سمجھ کر ہمیشہ ہر موقع پر کھڑا رہا ہے تو اس موقع پر کیسے بھول جاؤں میں اس کو۔" ماموں زاد کی محبت اٹھ کر آئی۔

"اماں! رشتے داروں کے کارڈ تو مکمل ہو گئے۔ اب ذرا محلے والوں کی طرف آ جاؤ۔"

"ہاں بھئی۔ محلے والوں کا تو پہلا حق ہے ان کو بھلا میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔" انگلیوں پر محلے داروں کو گھنٹے لگیں کہ کس کس کو بلانا ہے۔

"ابھی تک کارڈ لکھنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا؟ یہاں پیٹ میں چوے دوڑ دوڑ کر بے دم کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے اٹھ کر کچھ شکم سیری کا سامان بھی کر لو۔"

کاشی اماں کے پاس آ کر دم سے گرا تو وہ اسپرنگ والے صوفے کی وجہ سے اچھل پڑیں اور

لکھ: "خالہ جبین بیچ اہل و عیال،" اماں نے ہینک درست کرتے ہوئے معمر کو کارڈ لکھوانے شروع کیے۔

"لکھ دیا اماں!" اس نے لکھا ہوا کارڈ ایک سائیڈ پر رکھا اور دوسرا کارڈ اٹھایا۔

"اماں!" تائی سروری کو تو جلدی کارڈ بھیج دینا حیدر آباد سے خاندوال کا سفر بھی لمبا ہے اور کچھ تیاری بھی تو کرنی ہوگی شادی کی۔" چھنوں نے اماں کو یاد دہانی کروائی۔

"دفع کر تائی، سروری نے کیا آئے گی شادی میں۔ ہمیں ہی بھگتنا پڑ جائے گا اسے، ساتھ میں دو چار پوتا پوتی کو لٹکا لائی تو کوٹہ اکڑیں گے ہمارا تو۔"

"ہاں اماں اٹھیک کہتی ہو، چنگ پر پڑی پڑی حکم چلائے جائیں گی اور پان کا خرچا الگ کر دیا میں گی۔"

"اے بیٹا! جلدی سے بتا رہی تمباکو کا سانچی پان بنوا کر لائیو، سرچکرار ہے۔ طبیعت بڑی بوچھل ہو رہی ہے۔ گلوری منہ میں رکھوں تو کچھ طبیعت سدھرے۔ پورے ساتھ پان بنوا کر چلی تھی گھر سے ٹرین میں یونکی اپنا چاندی کا پاند ان کھولا۔ پورے ڈبے میں پان کی دل فریب مہک سب کے نتھنے مہکا گئی۔

"کیا مردہ کیا عورت سب ہی نے لپٹائی نظروں سے ایسے دیکھا کہ منہ میں رکھا پان چبا، مشعل ہو گیا۔ میں نے بھی سارے یان عیدوں میں بانٹ دیے۔"

اسے خشکیں لگا ہوں سے گھورتے ہوئے بولیں۔
 ”ایک دن پیٹ پوجانہ کی تو کچھ نہیں ہوگا۔ اگر
 پھر بھی اتنی ہی بھوک ستا رہی ہے تو جانا سر بیکری
 والے سے دو کریم رول پکڑ لا اور دودھ کے ساتھ
 کھالے۔“ انہوں نے اسے اپنے پاس سے اٹھا کر
 بلپر کی طرف دھکیلا اور پھر کارڈز کی طرف متوجہ
 ہوئیں۔
 ”اماں، اذرا جلدی بولو، ایمان سے میری تو کمر
 بھی بند ہوگئی۔ لکھتے کتے اگلیاں بھی دیکھ لگیں۔ اتنی
 دیر تو میں بھی امتحانی کرے میں نہیں بیٹھا جسنی دیر
 سے میں اس جس زودہ کرے میں بیٹھا کارڈ لکھ رہا
 ہوں۔“ معمر کارڈز پکڑے پکڑے اماں کی گود میں
 لیٹ گیا۔
 ”لو تم تو لکھتے لکھتے تھک گئے اور ہم نہیں دیکھ
 دیکھ کر عی، اکڑ گئے ہیں، چھو پر جھنڈا ہٹ سوارنگی
 کیونکہ اس کے پسندیدہ ڈرامے کا ٹائم ہو چکا تھا مگر



اماں کا حکم تھا کہ یہاں سے کوئی نہیں ملے گا جب تک کارڈ مکمل نہ لکھ لیے جائیں، کیا پتا دماغ میں کوئی ضروری نام لکھنے سے رہ جائے تو ان میں سے کوئی یاد تو کروادے گا۔

”اے زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں۔ ڈرامے کی آگ لگ رہی ہے تو جادو ہو، جا کے دیکھ اپنی پرکٹی سفید پاؤں میں تھڑی چٹی کپڑیوں کو، یہ ہمارے ہاں میرا بچہ دماغ کا تیز، اس سے پوچھ لوں گی اگر کوئی نام ذہن سے نکل بھی گیا تو۔“

ہمارا اپنی تعریف سن کر مزید پھیل کر بیٹھ گیا اور چھوٹا چھپیں بھرتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں دوڑ گئی۔

اماں پھر سے معرکہ کو نام لکھوانے لگیں۔

”اکرام کہاڑیے کا نام جمع کیل لکھ دے، ہے تو بے چارہ کہاڑیا پر دل کا بڑا گئی ہے جتنا اس کے گھر والے لکھا کے جائیں گے، اس سے چار گنا زیادہ دے کے جائیں گے۔“

”اماں اجلدی جلدی بولو، اب تو چسل بھی جواب دینے لگی ہے پیکا پیکا سا لکھ رہی ہے۔“

”ہاں بس اب اپنی یہ لگی میں وہ جو لبا سا لڑکا رہتا ہے۔۔۔۔۔ ارے دی جو دفتر میں کام کرتا ہے۔ یہ ہے۔۔۔۔۔ بسی سی کار ہے جس کے پاس، اماں نے نام یاد نہ آنے پر ہمار کی طرف دیکھا۔

”نور عالم، ہمار نے فوراً اماں کا مطلوب نام زبان سے ادا کیا۔

”ہاں وہی نور عالم! انہوں نے محبت سے ہمار کے لیوٹر سے سر پر اپنا سیاہی مائل ہاتھ پھیرا۔

”اماں! ان سے تو ہماری کوئی سلام دعا نہیں ہے، ان کو تو رہنے ہی دو۔ ویسے بھی وہ اچھے خاصے بڑھے لکھے ہیں۔ ہمارے عجیب الفت خانہ ان کو دیکھ کر وہ کیا سوچیں گے؟“ منہ مرنے نام لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔

”اے میں کہہ رہی ہوں لکھ۔ اس کی بیوی سے سلام دعا ہے میری۔ ایک دو مرتبہ لگی سے گزرتے

ہوئے اس نے مجھے سلام بھی کیا اور اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی ہے۔ اتنا۔۔۔۔۔ بڑا گھر ہے اس کا تو دل بھی بڑا ہی ہوگا ناں۔“

وہ اس کے ناکوں والے کمرے سے کچھ زیادہ ہی متاثر لگ رہی تھیں۔

”لو بھئی اماں! میرا کام تو ختم، ایمان سے اب تو نیند بھی آنکھوں میں بھر گئی ہے۔“ اس نے انگڑائی کے ساتھ ہی بڑی سی جمائی بھی لی مگر اگلے ہی لمبے اس کے انگڑائی لیتے بازو فضا میں ہی رہ گئے۔ اماں نے بھی صوفہ چھوڑا اور اپنے بھاری بھر کم وجود کو سنبھالتی باہر تخت کی طرف بھاگیں۔ جہاں منور حسین سر جھکائے گلست خوردہ سے بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا منور حسین! ٹھیک تو ہو؟“ مگر ادھر کبیر خاموشی تھی۔

”اے کچھ تو بتاؤ۔ یوں منہ لٹکا کر بیٹھ گئے میرا تو دل ہولائے دے رہے ہو۔“ اماں بھی وہیں تخت پر بیٹھ گئیں۔

چھوٹا بھی ادھورا ڈرامہ چھوڑ کر منور حسین کے قدموں میں بیٹھ گئی اور منور حسن چھوٹے سر پر ہاتھ رکھ کر مدھی آواز میں بولے۔

”مجھے معاف کر دینا میری بیٹی! تجھے اب چہر جوڑوں اور معمولی جہیز میں ہی اس گھر سے رخصت ہونا گا۔“

”کیا اول فول بولے جا رہے ہو، کیا سٹھیا گئے ہو؟ سیدھی طرح اصل بات کی طرف کیوں نہیں آتے۔“

اماں نے جھنجھلا کر ان کے ماتواں کندھے پر ہاتھ مارا تو ان کی ہڈیوں کے چننے کی آواز واضح سنائی دی۔ باقی سب بھی منہ کھولے کچھ نہ بکھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ منور حسن ہکلائے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں بولو۔“ اماں نے ان کے خضاب لگے بالوں پر ہاتھ پھیر کر حوصلہ دیا اور پانی کا گلاس ان کے کپکپاتے لبوں سے لگایا جو ہمار ان کی

حالت کے پیش نظر لے آیا تھا۔
پانی لی کر کچھ حالت تو سنبھل گئی مگر آواز ابھی بھی
کانپ رہی تھی۔ مگر صورت حال سے سب کو آگاہ کرنا
بھی لازمی تھا۔

وہ..... ہاجرہ بیگم ابھیہ سلطانہ نے شادی سے
انکار کر دیا ہے۔" خبر سنا کر وہ چور سے من گئے۔
"کیا....." الفاظ تھے یا ہم، ہاجرہ بیگم کو غش
آ گیا۔

پچھواپنے میلے دوپٹے کو منہ میں پھنسا کر دہلی
آواز سے رونے لگی۔ عمار اور بلو کے چہروں پر بھی یہ
خبر سن کر مرونی چھا گئی مگر اماں کی حالت دیکھتے ہوئے
انہیں جلدی سے ان ہی کے لہسن پہاڑ کی بسانہ میں
رچے دوپٹے سے ہوا دینے لگے۔ چلو بھربانی ان کے
منہ میں ٹپکا یا تو انہوں نے ہٹ سے آنکھیں کھول دیں
اور بھرائی ہوئی آواز میں منور حسین سے مخاطب ہوئیں۔

"پر منور حسین! انکار کی کوئی وجہ بھی تو بتائی ہوگی
اس نے۔"

"ہاں۔" منور حسین نے سرد آہ بھری۔
"وجہ سن کر ہی تو میرے پاؤں تلے سے زمین
سرک گئی۔"

"اے اب بتا بھی چکو، نہیں ہو رہا مبرمجہ
سے۔" انہوں نے اپنا سینہ مسلا۔

"دو دن پہلے ہارٹ ایک ہوا ہے اے۔ کل
ہی اسپتال سے گھر آئی ہے۔ آج اس نے مجھے فون
کر کے بلایا۔ کہنے لگی میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں
میں میں نہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میں نہیں
چاہتی کہ تم شادی کے چند دن یا چھ ماہ بعد ہی
رغٹو دے ہو جاؤ۔ میں تمہارے جیسے غصے غصے کو یہ دکھ
ہرگز نہیں دوں گی۔"

منور حسین یہ بات بتاتے ہوئے تقریباً رو رہی
ویسے اور اماں ان کا تو یہ حال تھا کہ کانٹو بدن میں لہو
نہیں۔

"ہائے یہ کیا ہوا؟"

لاکھوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث ابھیہ سلطانہ
منور حسین کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ بھاری بھر کم
ہونے کے باعث رشتہ ہی نہ ہو سکا جو آٹا انکار کر کے چلا
جاتا اور شادی کی عمر نکلتی چلی گئی۔

ماں باپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد
وہ اس مکان میں بالکل تنہا رہ گئیں۔ سرکاری اسکول
میں نوکری کر لی ہزاروں کمائی تھیں۔ ابھی
ریٹائرمنٹ لے کر لاکھوں روپے کی مالک بنی تھیں۔
سنا تھا جوانی میں منور حسین پر بڑی آس لگائے تھے
تھیں اور اسی آس کا قاعدہ اٹھاتے ہوئے ہاجرہ بیگم
نے اپنے شوہر منور حسین کا رشتہ ابھیہ سلطانہ کے
سامنے رکھا تو وہ بھی کچھ پس و پیش کے بعد مان گئیں
کہ تنہا رہتے رہتے وہ بھی ادب گئی تھیں اب اپنی
زندگی کے باقی ماندہ ایام وہ بھرے پورے گھر میں
گزارنا چاہتی تھیں۔

ہاجرہ بیگم نے ان کو شے میں ایسا اتارا کہ منور
حسین کی سادگی اور پر غلوں رویہ دیکھ کر آنے والے
دوہوں کے تصور سے ہی کھلی کھلی رہنے لگیں مگر قدرت
کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہاجرہ بیگم کا یہ خواب کہ دو
کمروں کے گھر سے ابھیہ کے بڑے سے پختہ و خوب
صورت مکان میں شفٹ ہو جائیں گے، بنی خوب
جھنجھ لے کر رخصت ہوگی اور ابھیہ کی ساری کمائی
میرے بیٹوں کے کام آئے گی۔ ان کے تو دن ہی بھر
جائیں گے۔

بڑی دھڑکی سوچی تھی، انہوں نے تو، اپنے شوہر میں
بنوارہ بھی اسی بنیاد پر برداشت کرنے کی ٹھان لی تھی۔ یہ
کڑوی گولی نگلنے کا فیصلہ اپنے بچوں کے خواب پورے
کرنے کے لیے کیا تھا مگر سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔
ابھیہ کے انکار کی خبر سن کر وہ اس شعر کی تفسیر بنی
ہوئی تھیں۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کند
دو چار ہاتھ جب لب ہام رہ گیا

☆☆

قرآنہ کھرن

گنگا اونیٹ

مکمل ناول

محسن لندن سے فلم اینڈ ٹیلی ویژن پروڈکشن میں ڈیپلوما حاصل کر کے کام کا آغاز کر چکا ہے۔ عون لندن فیشن میک میں انعام حاصل کر چکا ہے، وہ ایک ان پروڈکشنل ماڈل ہے۔ محسن اپنے نئے سیریل کے لیے عون کی منت سماجت کرتا ہے اور ایک مشہور اداکارہ سے ملاقات رکھتا ہے۔ عون اسکرپٹ پڑھنے کے بعد اسے انکار کرتا ہے جبکہ محسن اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نیاز منزل میں مباحہ اپنی بھابھی زنگس، بھتیجے قاضی اور بھتیجی بدرا کے ساتھ رہتی ہے۔ نوکری کرتی ہے کسی پر بوجھ نہیں ہے۔ جواد سے الگ رہتی ہے، گھر میں قاضی کی شادی کی تیاری چل رہی ہے۔

عون کو ذکیہ خالہ کا بیٹا سمجھ کر بدرا اور زنگس اسے شادی کے کاموں میں مدد کے لیے رکھ لیتی ہیں۔

مباحہ عون کے سپرد اپنا ایک کام کرتی ہے اور محلہ رازداری برتنے کی کوکبھی ہے۔

digest novels lovers group@Nadia Majid ♥
(دوسری اور آخری قسط)

جال پر چھوڑ دیا تھا جن میں سرفہرست اس کی بیٹی ریسرہ تھی۔

شہود کی پہلی منگنی سے شروع ہونے والی اسٹوری جو ریسرہ کے ذکر پر روک کر باقی آئندہ جیسے اتفاق کے ساتھ عون کو منہ چڑا رہی تھی، اگر وہ کسی فولڈر میں سودے کی صورت ہوتی تو اس وقت وہ جس اضطراب کا شکار تھا، وہ فولڈر باہر کیل میں پڑا

اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اطلس کی ملائم شرٹ کے ساتھ کھدو کی شال لینے والی مباحہ کے لیے اس گھر میں ایسی جہالت کی بنا پر کوئی جگہ نہیں تھی تو اس بھول سے نکل آؤ کہ جواد کا گھر، اس کی بیوی کی ایسی احمقانہ اور عجیب گانوں حرکتوں کی وجہ سے ٹوٹا تھا کیونکہ جواد کی شادی کے اگلے ایک سال تک باتوت نے سوائے عون عالم کے جیسے اپنے بریلی ممبر کو اس کے



5



کی سوشل ورکرزن اس کے گلے کی ہڈی ثابت ہو رہی تھی اس کا منتشر ذہن اس کے دامن ایس پر پڑی اسٹوری کی ایک ایک ڈائن دیتا رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پایا کہ کس لائن میں چھپا کون سا کردار اسے زیادہ ہرٹ کر رہا ہے، وہ ابھی حسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ یعنی پہلے بھی گرینی کے خلاف پولی رہتی تھی۔ بسا اوقات وہ اپنی ماں کو بھی نہیں بخشتی تھی۔ وہ اگر اس حقیقت سے ایک ہفتہ قبل پردہ اٹھاتی تو وہ دھاڑ کے کہہ سکتا تھا۔ ”یہ جو تم نے ڈرامہ لکھا ہے، مجھوت کا پلندہ ہے، ہر اسر بکواس ہے۔“

”مگر اب حالات رخ بدل چکے تھے اپنی کلائیوں میں لاکھوں سینے والی صابہ ہزاروں کمانے کی غرض سے خوار ہوتی پھر رہی تھی تو کیوں؟“ اس کی اس حالت کا ذمہ دار گر عالم دلا سے حلقہ کوئی فرد تھا تو وہ کون تھا۔

اسٹوری کے پہلے حصے نے اسے الجھا کے رکھ دیا تھا۔ اس کے نزدیک صرف دادی کا ہی نہیں اپنے باقی گیلی میسرز کا بیج بھی اس قدر قد آور تھا جس کے آگے عون شہود کو بر کوئی ہونا محسوس ہوتا تھا دوسری جانب صابہ اگر فیش کل جیسی شخصیت کی حامل تھی۔ وہ اس بات کو تسلیم کر سکتا تھا پھر اس کے بعد کیا ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ فیش کل میں ہر قد آور شے کا عکس ہونا ہوئے کے جھلکتا ہے ٹکڑوں میں بٹ کے جھلکتا ہے، درمیان میں کوئی حقیقت بھی جو اس نے فکر لو جو ان سے چھلی تھی۔ اس نے ایک بوجھل قسم کا سانس خارج کرتے ہوئے آج پہلی بار محسوس کیا کہ ہر چھوٹی بڑی یا مہلک بیماری کے علاوہ بھی کوئی کوئی تکلیف ہونی ہے جو آپ کو تنگ کر سکتی ہے، اس وقت وہ اپنے منہ کی اندازوں کی جس قدر بھی نفی کرتا پھر بھی اک خیال سا ذہن میں چھبھتا تھا۔

کیا واقعی یعنی وہ سب کچھ جانتی ہے جو وہ نہیں جانتا۔

وہ پیشانی مساتے ہوئے بینک کا دروازہ کھولی کر باہر گلی میں نکل آیا۔ یعنی جو جانتی ہے اگر وہ بہت بڑا

ہوا تو اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بینک میں واپس آکر اس نے سٹریٹ سنکائی تھی۔ ”اس نے حرف حرف تو بیکار کیا، لکھنا نہیں تو مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا ہوگا۔“ اس نے گہرے کس لیتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ وہ اگلے دن واپس جانے کا سوچ رہا تھا اس لیے نہیں کہ وہاں ڈھیروں کام اور بہت سے لوگ اس کے منتظر تھے۔ اس لیے کہ یعنی کی اس اسٹوری کا اگلا حصہ وہاں کی زبانی جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایک پرانے ماڈل کی سوک (ادیر) جب تازہ پینٹ شدہ عمارت کے سامنے رکی تو ماہ اکتوبر کی دوسری دہائی کی دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ گاڑی کے عقبی دروازے کھلے پھر ایک ساتھ بند ہوئے سوک سے اترنے والے دونوں مردوں کے ہاتھوں میں کچھ سامان تھا پھر گھر کی جانب بڑھتے قاخر کے ماتھے پر سلوٹ ابھری۔

اس نے گھر کا چوٹ کھلا دروازہ آج بھی بڑبڑاتے ہوئے پار کیا مگر اس سے چند قدم پیچھے تھا، اس کی نگاہ گھومی، سائیڈ والے گھر سے چند لوگ نکل رہے تھے ان کے ہاتھوں میں بیگ تھے، اسے یاد آیا۔ رات کو اس نے بھی اپنا بیگ پیک کیا تھا۔ دو تین جنرل اور شرف اتنے ہی سلوار سوٹ، شیوٹنگ کٹ کلون ایسی ہی چھوٹی موٹی ضرورت کی اشیاء کو بیگ میں سیٹ کرتے ہوئے وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے ماضی میں ہونے والے کسی حادثے کے گھٹ کا حصہ نہیں بننا تھا۔

اسے اب ماں کو پریشان کرنے کے بجائے یہ کرنا تھا کہ نیاز منزل کا ایڈریس جو ادانگل کے ہاتھ پر رکھ کر ان دونوں ماں بیٹا کو جلال عالم کی گلی کے ہر فرد کی پریشانی سے بری ہو جانا۔

اسے یعنی کے اسکرپٹ کے اگلے حصے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، آج بھی اسے اپنی مرضی ماہی بے فکری اتنی ہی عزیز تھی وہ اپنی مصروفیات کو پھر سے جوائن کرتے ہوئے پہلے اسے ٹماہ کے ساتھ میوزک ویڈیو پیکام کرنا تھا۔

جامد وجود کے ساتھ کھڑا اس کی شکل دیکھ رہا تھا ساکن آنکھوں کے ساتھ۔

اس کے رنگ بدلتے چہرے پر ہلکا سا ہنس تھا وہ اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اگر اس کے چہرے پر ایک ہی تاثر تھا اس نوجوان سے راز داری قائم رکھنے کی التجا تھی۔

”میں تمہیں جس آدمی کے پاس بھیجوں گی تم نے اسے یہ نہیں بتانا کہ ہم آپس میں رشتے دار ہیں بلکہ تم نے۔“

اس نے بات مکمل کرنے سے پہلے لب بھنج لے، بات ادھوری رہ گئی تھی مگر اس نے سامنے کھڑی عورت کے چہرے پر سنجیدگی کی جگہ ایک نرم مسکراہٹ نے گھیری تو وہ سمجھ گیا کہ ان کی طرف آنے والا کون تھا۔

بات مکمل ہو جاتی تو اس وقت رخت سبز باغ کے کھڑا وہ نوجوان وہ سب محسوس نہ کر رہا ہوتا جو حیرت سے بڑھ کے تھا۔ سورج ابھی مشرقی عورت کے پیچھے ہی تھا اس نے دیکھا اس کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کے بھلے گوشے پر بھی چمک رہے تھے۔

وہ آدمی کون تھا صاف کو اس سے کیا کام تھا تو کیا حقائق کھلنے کی گھڑی آگئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کے ایک گہرا سانس لیا۔ بعض دفعہ کسی نئے مقام پر آنا اور رہنا مشکل ہوتا ہے اور واپس جانا اس سے بھی مشکل۔

☆☆☆

نانی کے پاؤں کی سوجن اب اتر چکی تھی پھر بھی احتیاطاً وہ اپنے کاموں میں بدرا سے مدد لے رہی تھی جو نانی کو پہنچ کروانے کے بعد ان کے بال بتا رہی تھی۔ وہ دونوں جو دو پہر ڈھلنے کے بعد گھر آئے تھے اب گول میز کے اطراف ایک کھلے رجسٹر پر سر جوڑے بیٹھے تھے۔

قاخر اپنے محدود بجٹ کی وجہ سے مہندی کی تقریب کے حوالے سے کھانے پینے اور کیڑرنگ وغیرہ جیسے اخراجات کا حساب لگا کر اس تمام خرچے کا تخمینہ لگانا چاہتا تھا۔

نانی اسے بہت سی باتیں سمجھا رہی تھیں، خصوصاً قاخر کی بیوی کے حوالے سے مگر وہ حوجہ نہیں لگتی کہ اس

دوسرا نمبر محسن کی سیریل کا تھا۔ بیک کی زب بند کرنے کے بعد وہ پرسکون تھا، اسے خیال بھی آئی تھی۔ صبح جب سورج ہمسائیوں کی مشرقی عمارت سے بھی نیچے ہی تھا تو اس نے بیٹھک کی کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ روز ایسا ہوتا کہ وہ بات کرنے کے لیے تمہید باغدہ رہا ہوتا، وہ معروف انداز میں ہوں ہاں کرتے ہوئے بھی اسے تو کبھی کلائی موڑ کے ماتم دیکھتی پھر زگس اسے آواز دیتی کہ ناشتہ لے جاؤ تو وہ سیکنڈ کی تاخیر سے پہلے کچن میں ہوتی۔

وہ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے کھڑکی کے سامنے سے ہٹا تو ہر روز کی طرح اس کے قدم کچن کی جانب اٹھ رہے تھے۔ ہر روز کی طرح وہ خیر مقدمی طور پر اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

آج اس کے پاس کوئی تمہید نہیں تھی۔ وہ اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ وہ میرون اور بلیک پر جھڑ سوت میں ملیں تھی جو اس پر سوت کر رہا تھا وہ پانی کا پائپ کیاری میں لگا کر اس کی طرف آئی۔

”بتا بے تمہارے یہاں آنے سے پہلے میں سوچتی تھی۔ کم از کم اس شہر میں تو ایسا کوئی شخص نہیں جس پر میں اعتماد کر سکتی ہوں۔“

اسے حیرت ہوئی اس کی بات سے زیادہ اس کے انداز پر، وہ یونہی بات کرتے کرتے اس کے برابر میں ٹھہر گئی جیسے اس تمہید کے بعد وہ اس سے کوئی خاص بات کرنے والی ہو۔

اس کے برابر کھڑا نوجوان اس کی اگلی بات کا منتظر تھا مگر اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جلدی میں تھا وہ دھوپ چڑھنے کا اور کسی جالی دار دروازے کی کلک کا منتظر نہیں تھا۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔

اس نے کٹ کٹاک کی آواز سے اور ان کے ڈر بے کی جانب نظر اٹھانے سے بھی اجیزا برتا۔

”میں سوچتی تھی پھر مایوس ہو جاتی تھی یہ ناممکن تھا میں کسی پر کیسے بھروسہ کرئی۔ کام ہی ایسا ہے۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے بتا رہی تھی، اسے جتا بھی رہی تھی کہ وہ اس کے لیے قابل بھروسہ ہے اور وہ

کی نگاہ اس پینک شدہ شاپنگ کی جانب بھٹک جاتی جو قافراں کی فرمائش پر اپنے بیڈروم کی سجاوٹ کے لیے لایا تھا۔ نگاہ چیزوں کی طرف اٹکی تو وہ چہرہ بھی چھوڑ آئی جو آج گہری سنجیدگی کی گرفت میں تھا۔

اب شادی کی رسومات سے بھرپور ہفتے کا آغاز ہونے والا تھا اسی لیے صباہ بھی آج معمولی کام نپٹانے کے چکر میں تھی۔ اس نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے اور بدرا کے شادی پر پہننے والے کپڑے بھی بریس کر رہی تھی۔

زرگس نگر کے پاس سے بری کے جوڑے اٹھا لائی تھی۔ اب ان کی سلائی چیک کر رہی تھی۔

ان مانی نو اسی کے بیچ ہونے والی ہلکی پھلکی بحث کا رخ مانی نے نہایت سجاؤ کے ساتھ اس وقت بدلا جب اس نے بدرا کی آستین کے ساتھ جڑی خوب صورت ڈوری کا دوسرا حصہ غائب پایا۔

”جسہیں اس تھا ڈوری کی اداسی محسوس نہیں ہوتی۔“ مانی نے آستین چھولی کر کے اس کی آستین پر ہلکی سی دھب لگائی۔

”اللہ مانی آپ بھی ناں۔“ وہ ہنسی۔

اس کی ہنسی کی آواز گول میز کے اطراف عین اس کے سامنے بیٹھے شخص تک گئی جو نگاہ کو اپنا پابند نہیں رکھتا تھا ہاتھوں پر خوشبودار روشن لگائی مانی اسے بتا رہی تھیں کہ کس طرح تمام ساڑھیاں ان کی سہیلیاں ہیں وہ ان کا خیال رکھتی ہیں.....

”میں نہیں دیر کی تھی۔“ وہ سر جھکتے ہوئے ایک بار پھر سے ہنسی۔ رجسٹر پر چلتے مارکر کی نوک سے جو اچانک رکی وہ اس کی ہنسی تھی۔ ایسی ہنسی کے گرد باڈر لائن ہونی چاہیے (اس کی دشمن) اس وقت وہ اس سے بہتر القاب منتخب نہیں کر سکتا تھا۔

”اب پچھتاتی ہوں اماں! چار سال پہلے جب آ نے حامد کے لیے بدرا کو مانگا تھا تو قافرا نے بہن کی کم عمری کا بہانا نہ بنا کر انکار کر دیا تھا تب اگر میں آپا کی طرف داری نہ اڑ جاتی تو کتنا اچھا ہوتا اب حامد کی بیوی کو دیکھو، کیسے عیش کر رہی ہے۔“

وہ بات ماں سے کر رہی تھیں سنا بیٹے کو رہی تھیں مانی اپنی ہلکی سبز ساڑھی کے گہرے سبز حاشے کی لمبائی چیک کر رہی تھیں کہ بہو کی نوکریانی اکثر اس کے کپڑوں کو واشنگ مشین میں ڈال دیتی تھی۔

انہوں نے سبز حاشے سے ہاتھ ہٹا کر بیٹی کی طرف دیکھا وہ کیسی لا پرواہ ماں تھی جس کے بیٹے کو دن بھر کی ڈیوٹی کے بعد گھر آنے پر بھی فراغت نصیب نہیں تھی بجائے اس کے بیٹا اپنے کمرے کے لیے جو سامان لایا تھا وہ اٹھ کر چیک کر لی، اسے پرانے پچھتاوے یاد آ رہے تھے وہ بھی اکلوتی بہو کی بری دیکھ کر انہوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار بھی کیا۔

بدرا ان کے جوڑے پر نہیں لگا کے شاپنگ کی طرف بڑھی۔

”رانی باتوں پر پچھتانے کا اب کچھ فائدہ نہیں زرگس! خوشی رو پے سے نہیں قسمت اور مقدر سے ملتی ہے صباہ بھی تو بڑے گھر میں میا ہی گئی تھی۔“ انہوں نے بیٹی کو مثال دے کر سمجھایا مگر آواز دھیمی ہی رہی۔

”بھی تو دکھ ہے اماں! صباہ اگر اپنے گھر میں آباد ہوتی تو آج بدرا بھی ان مسائل سے دو چار نہ ہوتی، کئی اچھے رشتے آتے ہیں مگر جب صباہ کی بات سن کر ہی تو اگلے ہی دن سعادت کا پیغام آ جاتا ہے کہ پھولی تنگی ایک ہی ذات۔“ مانی مثال دے کے پچھتا میں۔ زرگس کی آواز محض تک پھیل چکی تھی۔ کاش ان باتوں کی بھی باڈر لائن ہوتی جن سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

رجسٹر۔ چلتا مار کر پھر سے رکاوٹ چلے کپڑوں کو اٹکی پر پھیلائی صباہ کو قافرا اور عون نے یک بیک دیکھا اس کا چہرہ سپاٹ تھا جیسے وہ ان باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔

”نہ کیا کریں ایسی باتیں، کم از کم آنی کی موجودگی میں احتیاط کیا کریں۔“ قافرا نے سو بار کا کہا جملہ ایک بار پھر سے دہرایا، تکلیف اور الجھا کے ساتھ۔

”تم سے تو بات کر رہی تھی مشکل ہے زرگس! یہ بیج

ہے کہ گھر تو دو افراد کا ٹوٹا ہے مگر اس سے دو خاندان

متاثر ہوتے ہیں۔“

مائی بھی زنگس تو کبھی قاخر کو سمجھاری تھیں۔ جب بیایا بچوں کا گھر ٹوٹ جاتا ہے تو پھر میکے واپسی پر بھادجوں کا سلوک بدل جاتا ہے، جب والدین کا سایہ بھی سر پر نہ ہو تو یہ سلوک بدترین ہو جاتا ہے اب میں اپنی بیٹی کو دوش دوں یا تم سے شکوہ کروں تم جو اپنی ماں کو لٹا کر رہے تھے۔“

وہ کسی پر بوجھ نہیں، اپنا کماتی ہیں۔“ ٹھیک ہے وہ کسی پر بوجھ نہیں مگر جوان جہان ہے، خوب صورت ہے اس کی ہر اونچ نیچ کی ذمہ دار اس کی بھادج ہی ٹھہرے گی، سچ کہوں تو ہم بوجھوں کو تم جیسی تعلیم یافتہ نسل سے یہ امید نہیں تھی جو اس غیر اسلامی رسم کو جڑ سے اکھاڑنے کے بجائے اس کی آبیاری کر رہے ہو۔“

وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے افسردگی سے گویا ہوئیں حرف بہ حرف غور سے سنتے قاخر نے ان کی آخری بات پر سر جھکا لیا تھا تو اس کا کیا مطلب تھا۔ عمن کے اوسان خطا ہوئے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ان روایات پر قائم کھڑا تھا، ہر عورت اپنی ہر روایات سے باخبر ہوتی ہے۔

عالم دلا، بیٹی کا اسکرپٹ اور جواد جیسے یہ سب پس منظر میں چلے گئے تھے اب سامنے کوئی دوسرا کھڑا تھا جس کی خاطر وہ عمن کو اپنا راز دار بنانا چاہتی تھی، اس راز دار نے تحیر میں اتر کے اسے دیکھا جو لاٹری ایریا میں کھڑی کسی محلے دار عورت سے بات چیت میں مشغول تھی اپنی اسی خوش حال قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ، وہ اس عورت کو بوجھتے بوجھتے جب اندازے کے قریب تر تھا تو آج صبح اچانک وہ ایک دوسری پہلی میں ڈھل گئی تھی۔

☆☆☆

گھر صرف دو افراد کا ٹوٹتا ہے مگر اس سے دو خاندان متاثر ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نہ صرف جان چکا تھا بلکہ بھگت بھی رہا تھا بقول اس کے دوست کے وہ اس عجیب و غریب اکیڈمی میں ریلٹی پر مبنی

ایکٹنگ سیکھ رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ کچن کی چوکھٹ کے ساتھ بیٹھا ایک جہازی سائز لائین کورنگ مار سے صاف کرنے میں مصروف تھا۔ اس کالی لائین کو چکانے کی یہ جگہ بھی زنگس کی مختص کردہ تھی جو اس وقت ماں کے سر پر کھڑی دکھڑے دور ہی تھیں۔

”مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا یہ پورا سوٹ میپنگ کے ساتھ پہنتی ہے یا نہیں، فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ سولہ جماعتیں پڑھنے کے بعد بھی اسے پتا نہیں کون سی بات کس کے سامنے کرنی ہے۔“ اپنی لواہی کو یہ سمجھانے کے بجائے کہ تمہارے قریبی سوٹ کے ساتھ کا دوپٹے الماری میں پڑا پڑا تمہارے اس فیروزہ بننے کا دشمن بن چکا ہے، اسے پاس بٹھا کر کچھ مشکل سمجھائیں ابھی خان صاحب کی بیوی مشالی اور مبارک باد دینے آئی تھی، اس نے آپ کی لاڈلی سے جب مصروفیات کی بابت پوچھا تو جھٹ سے بولی آج کل سارا دن بس ڈرامے دیکھتی ہوں۔“ ہائے کئی بار سمجھا چکی ہوں کہ لڑکی کو بھی کے قاعدے کی طرح نہیں ہونا چاہیے بس قریبی پڑھ لی جائے۔“

عمن نے گردن موڑ کے اس دشمن دار دوڑے کو دیکھنا ضروری سمجھا، وہ اپنی ماں کی صندوقچی چرا کر کچن کی اوٹ میں بیٹھی یقیناً کسی چابی کی تلاش میں تھی، وہ اس بات سے اچلی۔

”سچ بتانا کیا واقعی میں الف امار اور ب بکری جیسی سیدھی سادی ہوں۔“ یہ سوال ذکیہ کے بیٹے کے لیے تھا۔ مگر جس نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا وہ کوئی اور تھا ایک ماڈل، ایک اداکار، ایک مسافر جو پہلے بھی بھیس بدلنا تھا جو کبھی صبح سویرے قیند برباد کر کے آنکھیں ملتا ہوا ایک لڑکی کے پیچھے چرچ جاتا تھا پھر اس کی محبت کا اعتراف بھی نہیں کرتا تھا تھوڑی دیر پہلے وہ محسن سے بات کر رہا تھا۔

”مصروف تو نہیں تھے۔“ اس نے بات روک کے پوچھا وہ بے ساختہ کہہ گیا کہ ”لائین صاف کر رہا ہوں۔“ تو اپنے آفس میں کافی سے لطف اندوز

ہوتے محسن نے ہنسی سے دہرا ہوتے ہوئے کال کاٹ دی تھی پھر دس منٹ بعد اسے دوبارہ کال پہ لے کر وہ بتا رہا تھا کہ میں رائٹر سے یہ سین بھی لکھوا رہا ہوں۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا تو اس کی پوزیشن کے مطابق محسن اس کے سین پہ سین لکھوا رہا تھا کیونکہ وہ اس گھر کے ہر فرد کو جانتا تھا۔ دو دن قبل آنے والی مانی سے لے کر اس لڑکی تک جو قافلوں کے اندر کہیں اب حسرت بین کے رہ گئی تھی وہ خود کو اچھا انسان سمجھتا تھا تو آج ڈیڑھروں کام کی باتوں کے دوران بھی اس نے صبا کے راز کو راز ہی رکھا تھا بالکل اسی طرح جیسے وہ اس سے بدرا کی ذات شیئر نہیں کرتا تھا۔ اپنے نام کی طرح منفرد سی اس لڑکی کو انہماک سے دیکھنا بھی آسان نہیں تھا کہ اس کا دشمن دارو پٹہ بھی دل لگی جتانے لگتا تھا اس کے بارے میں کسی دوسرے سے بات کرنا آسان نہیں تھا اسے یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ وہ الف انار جیسی بھی پائیں۔

”بانی گھر میں مہمان آگئے ہیں تو چینی چاہیے تھی۔“ اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا پھر ہنسی کی آواز پر خاموش رہ گیا۔

”چینی چاہیے تھی تو دکان پر جانا تھا اک تیری اماں ہی جانتی ہے کہ چینی مہنگی ہوگئی ہے تب ہی تو بے جتنا پیالہ دے کر تجھے پڑوس میں بھیج دیا۔“ برآمدے سے نرس کی سخت آواز ابھری۔

”افوہ اماں! ہر چیز کو تو آپ نے تالا لگا رکھا ہے۔“ وہ برآمدے کی طرف منہ اٹھا کر بولی تو وہ بے وقت مسکرانے پر مجبور ہوا، اس کے پاس ہرتالے کی چابی تھی تاہم صرف اپنا ہی خیال نہیں رکھتی مہمانوں کے لیے پلان بی اور مسائیوں کے لیے پلان سی بھی ہوتا ہے، وہ کالز اکڑا کے آگے بیٹھی پھر باورچی خانے میں گھستے ہی ہنسی کی کمر پہ دھموکا جڑا کتنی بار سمجھا چکی ہوں۔

”جب برتن کے ساتھ چیز لینے آؤ تو میری اماں سے کہا کرو کہ میں تو برتن کو رنگ کروانے آئی ہوں۔“ وہ اس کے لب جتنے پیالے کو چینی سے

بھرتے ہوئے بولی۔

پیلے کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے حون نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔

”ہر چیز کو ایک ہی برش سے رنگ کرنے والی بدرا نوید الف انار جیسی سیدھی تو ہرگز بھی نہیں تھی، اس مہمان نے اگر خالہ کو بتا دیا تو۔“ ہنسی نے سہم کے حون کو دیکھا۔

”تم اس کی فکر کرنے کے بجائے جلدی سے بھاگ لو، اسے تم میرا ہی سمجھو۔“ وہ اس کے کان میں ہنسی۔

”اوہ مانی گاڈ!“ وہ نیچے کہیں زمین میں دھنسا، کشش کے دانے پھاکتے ہوئے وہ بطور محافظ اس کے ہمراہ چل پڑی۔ وہ نہیں جانتی تھی جسے وہ اپنا بتا چکی تھی۔ وہ اسے ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے دو تین سال کا بچہ ہنسی کے قاعدے کو دیکھتا ہے۔

اس کو ادراک نہیں اس کی بل کھاتی ہوئی زلف کے ہر چمچ میں بھٹکا ہوا اک جنگل ہے! اور

ہر چمچ کے جنگل کی کہانی پہ مبہوت ہوں میں اس کو ادراک نہیں

اس چشم ستم کی جادوگری کی

وہ ملائم سی ہنار

سر پھری راہ میں ست رستے پر عروں کو بلاتی

پھر اڑا دیتی ہے

انہیں سرمست پر عروں کی آنی جانی پہ

مبہوت ہوں میں

☆☆☆

”تمہاری آنی میں اگر اتنی ہی برداشت تھی تو وہ اپنا گھر چھوڑ کر واپس کیوں آگئیں۔“

حون کے اس سوال نے اسے پریشان ہی نہیں شرمندہ بھی کیا تھا۔ تب سے یہ بات ذہن میں سرائی رہی تھی کہ وہ اسے جواب کیوں نہیں دے پانی آنی سے اس نے بھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔

”آپ وہاں دو تین رنگوں کے کپڑے پہنتی ہوں گی۔“

ایسا کہتے ہی اس نے اپنے تین رنگی لباس کو خاکے سے دیکھا کہ یہ بری عادت بھی جالی ہی نہیں تھی۔“

”میں نے یہ عادت بھی بدل ڈالی تھی۔“ وہ اسے بتا نہیں سکی۔

بس پڑھتی رہی وہ دونوں بچے کئے تھے تو نئی زندگی ملنے کے بعد اب آنے سے ماننے آ کر مسکرا اٹھے تھے۔

”جب کوئی خاص وجہ نہیں تھی تو پھر آپ دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑا کیوں؟“

وہ اصرار سے بولی۔ اسے آنی کی یہ عادت سخت ناپسند تھی جب وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی تو دیوار میں جالی تھیں۔

انہوں نے ایک دوسرے کو اس وقت بھی نہیں چھوڑا تھا جب اس نے نا بھی میں اپنا کمرہ جلا لیا تھا اپنے ارد گرد پھیلی آگ کی دہشت سے اس کا بہت بڑا نقصان ہو گیا تھا اس کے شوہر کو اپنے بچے کے ضائع ہونے کی تکلیف ہوئی تھی مگر اس خوشی سے غم کس کی بیوی بال بال بچ گئی تھی۔ وہ کسی کو کیا بتاتی وہ بھڑ بھڑ جلتے کمرے سے زندہ سلامت نکل آئی تھی مگر ایک پرانی آگ نے ان کے رشتے کو جلا کے رکھ دیا تھا۔

صام اور ایللی دونوں مہم جو جب اپنے ہٹ کے اندر داخل ہوئے تو سامنے بیٹھے دو افراد کو دیکھ کر حیران رہ گئے وہ دونوں وہاں کیوں آئے تھے، وہ اس سفید برف دار میں ان کا قیام سیاہ کرنے آئے تھے پسیدہ اوراق کی خوشبو بتا رہی تھی کہ دور کہیں کسی بڑھیا کے جھونپڑے میں داستان کھل چکی تھی۔

☆☆☆

ریمبر آج کل یکے میں شواف کر رہی تھی کہ ان میاں بیوی کے آپس میں تعلقات اس حد تک خراب ہو چکے ہیں کہ لوبت خلع پر آ چکی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس لوبت پران کے خاندان پر انگلیاں اٹھیں

رہی اس کی ماں تو وہ کوسنوں اور طعنے تقویٰ کی صورت بات کرتی تھیں، وہ بھی اپنے شوہر اور سر کو سنا نہیں جو صباہ جیسی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال کر خود اللہ کے پاس بہت آرام سے تھے۔ ماں بھی کبھار جب وہ دونوں کے پلاؤ یا پھر بے موسم کی شاپنگ پر خرچا کرتیں تو اس کے کوسنوں کا رخ صباہ کی طرف مڑ جاتا تھا لیکن آج کل جس طرح وہ مانی کے آگے اپنی نند کی ناکام شادی کے دکھڑے روٹی تھیں تو اس موضوع نے پہلی بار بدرا کی توجہ مبذول تھی۔

اس وقت وہ نئی سبک اب کٹر کو اپنے سامنے کھولے ہر ایک چیز کا شید بھی چہرے تو بھی ہاتھ پر لگا کر چیک کر رہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً آنی پر بھی نظر ڈال لیتی جو اس وقت ایک سفر نامہ میں غرق تھی، وہ اس شوق کی خاطر کڑے وقت سے بھی وقت نکال لیتی تھی۔

”آپ اتنی اچھی اتنی پیاری ہیں پھر آپ کے کمر ٹوٹنے کی وجہ کیا تھی۔“ اس نے اچانک پوچھا۔

”صام اور ایللی ایک لقمہ درد برف دار کے اس راستے پر تھے جہاں برفیلی زمین چٹان کی طرح سخت تھی پھر اچانک وہاں کی برف نرم کیسے ہو گئی۔ مطالعہ کرتی وہ آنکھیں اٹھیں جملوں پر ساکن ہوئیں، آگے خطرناک برفانی شکاف تھا وہ دونوں شاید بچ جاتے۔“

اس سوال نے رات کے ایک بجے صباہ کو برفیلے کڑھے میں پھینکا جب بدرا جیسا بے نیاز بندہ اسے سوال کرنے لگا تو جان لینا چاہیے کہ دور کہیں داستان کھل چکی ہے۔

”کچھ خاص وجہ نہیں تھی۔“ اس نے سفر نامے پر گرفت پکڑتے اسی صنفی کو پھر سے کھولا۔ ”آپ وہاں بھی ننگے پاؤں پھرتی ہوں گی۔“

سوال کرنے والی نے جھینپ کر اپنے پاؤں دیکھے یہ بری عادت تھی مگر چھوٹی ہی نہیں تھی۔

”میں نے جوتا پہننے کی عادت ڈالی تھی۔“ وہ کہہ نہیں سکی آنکھیں کھلے صنفی پر مرکوز تھیں جہاں ایللی اور صام نے برفانی شکاف پار کر لیا تھا۔

کی تو ان کے باپ کے دل پر کیا گزرے گی۔ شہود اپنی بہن کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا کہ وہ اس کے ہر فیصلے میں اس کے ساتھ کھڑا ہے، یا قوت نے اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا تو وہ رئیسہ کی کسی بات پر چونکی نہ کسی رد عمل کا اظہار کیا۔

ایک جواد تھا جسے بہن کے فیصلے اور ماں کی خاموشی نے بے چین کیا تو اس کی وجہ اس کا باپ تھا، وہ اپنے باپ سے ایسے فٹنی اٹیچڈ تھا وہ اس کا مزاج سمجھتا تھا اس نے باپ کے دتار کی خاطر بہن کی سے اپنے طور پر مل کر ان دونوں میاں بیوی کے درمیان مصالحت کی کوئی راہ نکالتا چاہی تو اس کا بہن کی جبران، جواد کے منہ سے علیحدگی کی بات سن کر حق دق رہ گیا۔

جبران کی فیملی میں رئیسہ کے حوالے سے جو بھی چہ منگوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ شک یا مفروضوں کی بنا پر نہیں تھیں پھر بھی وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے اس کے ساتھ نباہ کرنے کو تیار تھا، ابھی دو دن پہلے ان کے درمیان والی ایک سچ و سرور جگت کے نتیجے میں اگر وہ دو دن سے عالم دلا میں تھی تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، ان کے درمیان ہونے والا جھگڑا بھی کوئی پہلا جھگڑا نہیں تھا وہ اپنے میکے میں جا کر خلع کی بات کر رہی تھی تو وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا اب بھی سمجھ نہ پاتا کہ رئیسہ علیحدگی کیوں چاہتی ہے۔

اسے یہ خوش چنبی نہیں تھی کہ اس کی بیوی وقت کے ساتھ بدل جائے گی، وہ مجیب قسم کی خواہش پرست عورت تھی پھر بھی جبران نے جواد کی باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ سوچا، وہ اسی وقت اپنی شام کی معروضیات ترک کر کے جواد کے ساتھ ہی آ گیا تھا۔

جبران کو اس گھر میں ہر رشتے کا لحاظ اور پاس تھا مگر سرپرست جلال عالم تھے جن کی شخصیت کی پختگی اور خاندانی رکھ رکھاؤ کے چرچے کی بنا پر ہی اس کی فیملی نے اس کا رشتہ اس خاندان سے جوڑا تھا، ان میاں بیوی کی ابتدائی مقابلہ بازی کے بعد جب رئیسہ کی من مائیاں بڑھنے لگیں تو اس بات کا اظہار

جبران کی می نے یا قوت اور جلال سے کئی بار کیا تھا، اس سے پہلے کہ جلال ڈرائنگ روم میں آتے ایک کام جو مشکل تھا وہ جواد نے کیا، اس نے باپ کو رئیسہ کی ضد سے آگاہ کر دیا تھا مگر اسی بھرم اور اسی لحاظ کے ساتھ جو جبران کے ماں باپ ایک باپ کو بیٹی کی غلطیوں سے آگاہ کرتے ہوئے رکھتے تھے جو اس وقت سر سے بات کرتے ہوئے جبران نے بھی قائم رکھا تھا۔

داماد کی پوری بات سننے کے بعد انہوں نے بیٹی کو استفہامی نظروں سے دیکھا۔ وہ نگاہ جمائے گی، پھر جھکائے گی، پھر آئینہ خیال رکھوں گی۔ جیسے الفاظ کے ساتھ ان سب کو چائے پیش کرے گی۔

”میں فیصلہ کر چکی ہوں اور اس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں۔“ یہ پہلا موقع تھا جب وہ نگاہ جھکانے کے بجائے باپ کی آنکھوں میں دیکھ کے مخاطب ہوئی، اس کی بات کے بعد ڈرائنگ روم کچھ دیر خاموشی میں ڈوبا رہا۔ وہ باپ کو دونوں بھائیوں کو اور ماں کو دیکھ رہی تھی، ان سے اپنی مرضی کے جواب کی منتظر تھی وہ نگاہ جھکائے گی پھر اپنے باپ سے سوری کرتے ہوئے ان کو چائے سرو کر رہی ہوگی۔

جلال کے لیے اس تخیلاتی سحر کا ٹوٹنا ایک مشکل مرحلہ تھا جسے اس نے کڑے ضبط سے پار کیا۔

”ہمارے جیسے گھرانوں میں خلع کی بات سوچنی بھی نہیں جاسکتی۔“ وہ پروتار انداز میں گویا ہوا۔

”اس نے مجھ سے کہا ہے میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“ اس کی ادھوری بات نے وہاں موجود ہر بشر کو گھما ڈالا لیکن جس کی پلک پلک ساکن ہوئی وہ جبران تھا، دو روز قبل کی بدترین بحث کے دوران وہ غصے میں ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی، کیا رئیسہ اس وقت وہ بات دہرائے گی، اس بات کو دہرانے کا مطلب تھا، وہ اس باہمی کوراستہ دیکھنا چاہتی ہے جو جبران کی فیملی کی بنیادیں ہلاکتی تھی۔

وہ بے چینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”انسان جب غصے میں ہوتا ہے تو بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ تم اسی وقت اپنا اور کسی کا سامان پیک کر دو اور شوہر کے ساتھ اپنے گھر جاؤ۔“

انہوں نے مستحکم انداز میں فیصلہ سناتے ہوئے ایک بار پھر اپنی شریک حیات کو دیکھا جس کی جامہ خاموشی سمجھ سے ہا ہر گئی۔

”میں ایک ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی جو میرے بھائی کا گھر توڑنے کی بات کر رہا ہے۔“ وہ تنفر سے بولی، اس نے کچھ ظاہر کیا کچھ پیٹنگ میں رکھا۔

”کون سا بھائی؟ کس کا گھر؟“ سب نے چونک کے اسے دیکھا یہ الزام اس کے لیے شاکل تھا اس کا پارہ سیکنڈز میں چڑھا۔

”تم جھوٹ بول کر اور مجھ پر الزام لگا کر بدلے میں اپنا مطلب نکالنا چاہتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے اگر پیش میں آ کر میں نے کچھ کہا تھا تو تمہیں اس تکلیف کا احساس دلانے کے لیے جو تمہاری وجہ سے میری بچا زاد بہن اور میری فیملی کو پیش آ سکتی ہے۔“

جب رئیس نے خود یہ بات چھیڑی دی تھی تو وہ اس کی فیملی کو مناسب الفاظ میں تصویر کا وہ رخ دکھا رہا تھا جو اسے خوفزدہ کر رہا تھا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کاس کی آواز سننے لگی اور وہ کیا کہہ رہا تھا۔

اس کے تمام فیملی ممبرز رئیس کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ بات کر کے پچھتاہی، اسے توقع نہیں تھی کہ یہ راز اتنی جلدی کھل جائے گا، وہ بھی جبران کی زبانی اور اس کے باپ کی موجودگی میں وہ خود کو بچانے کے لیے بات کو اسی جگہ لے آئی جہاں سے اس نے شروع کی تھی۔

”تم کیا سمجھتے ہو تم مجھ پر فرد جرم عائد کر کے خود پاک صاف ہو کے یہاں سے چل دو گے۔ میں مینی جی قسم کھا کے کہتی ہوں اس نے مجھ سے کہا۔ جواد صباہ کو میری خاطر چھوڑ دے تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا ورنہ نہیں۔“ اتنی بڑی بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کسی لحاظ، حرمت یا رکھ رکھاؤ کا نام و نشان

نک نہیں تھا وہاں ہر کوئی پکا پکا تھا کہ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے یہ چھٹی ہو گئی، جس نے ان سب کو چھوٹا کر جواد کے احساسات سب سے الگ تھے، وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن جذباتی ہے۔

”میں بھی مینی کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے وہ سب اسے احساس دلانے کو کہا تھا۔“ اس نے یہ بات صرف جواد کو دیکھ کے کی تھی۔

”ٹھیک ہے میں تمہاری بات پر یقین کر رہی ہوں کہ صباہ سے تمہارا تعلق نہیں، تم نے یہ بات مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے کی تھی، ہم بھی ابھی یہیں سب کے سامنے مان لو کہ میرا بھی تمہارے بہنوئی سے التعلیق نہیں صرف سوشل لنک ہے۔“ وہ اس کے گھر میں جو چڑیا جیسی رئیس کی جو باپ کے سامنے ادب سے تیز سے بات کرتی تھی۔ وہ کہاں گئی وہ کون سی بھاری چیز تھی جو اس نے اپنے باپ کے سر پر نہیں گرائی تھی وہ کون سا بلکا پھلکا تھا جس نے یا قوت کے دل کو چھو اس کا شوہر کیا اس سے زیادہ قابل تھا، یا قوت کو دیوار کے ساتھ لگا کر اپنی مرضی اور اعتبار کے استعمال کے بعد سمجھتا تھا کہ اس کی باقی زندگی سکون سے گزر جائے گی۔ خاموشی سے تماشا دیکھتی یا قوت نے اس پر قاتمانہ نگاہ ڈالی۔

”مجھے سوچنا بھی مت کہ تم مجھے ریس کر کے مجھ سے اپنی مرضی کے فیصلے کروا سکو گی اور میں تمہارے التعلیق کو سوشل لنک سمجھوں گا۔“ وہ ٹھنڈے لہجے میں ہنسا۔

”میں ہر سوشل لنک کی ایک ایک شکل سے واقف ہوں۔“ اب وہ ان شکلوں پر روشنی ڈال رہا تھا کہ شہود نے جیسے جست لگا کر نا صرف اس کا گریبان پکڑا بلکہ ایک پتھر بھی جڑ دیا وہاں اب کچھ بھی مہذب نہیں تھا نہ ماحول نہ نگہداشت اور براڈ لباس، کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

”میرڈیجورٹ جب غلطی کرتی ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا وہ غلطی سرالینوں کے رویے، ان کے

ماحول یا پھر شوہر سے ضد اور متاثرے کا اہتمام ہے صرف اس کے والدین کی تربیت پر آتا ہے، اگلی بات اس کے خون پر ہوتی ہے گھٹیا خون، ہانسی خون فلاں فلاں۔ تیسری بات تمہارا خاندان ہی ایسا ہے۔ بے نسل بے غیرت۔“

اس وقت عالم دلا کے پر قہش ڈرائنگ روم میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا اندر سے ابھرتے شور پر ملازمین نے صرف کان کھڑے کیے تھے اس گھر کی بیہوش سنگ ایریا کے آرام دہ صوفوں پر پار پار پہلو بدلتے ہوئے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

جواد باپ کا اشارہ پاتے ہی شہود کو زبردستی وہاں سے باہر لے گیا شہود نے باہر آتے ہی صباہ پر کھورتی ہوئی نگاہ ڈالی وہ پہلے ہی اعجاز نہیں لگا رہی تھی کہ اندر اس کے نام کی گردان ہو رہی تھی تو گیس ہو رہی تھی۔ اس گھر کا سربراہ ذلت اور توہین کا سامنا کرتے ہوئے بی بی داماد کی زبان نہیں بکڑنا چاہتا تھا۔ آج وہ سب کچھ سننا چاہتا تھا۔ بی بی تو اسے زندہ درگور کر رہی تھی مگر وہ ماں جس کی تربیت پر انگلی اٹھ رہی تھی، اس کا سپاٹ چہرہ اس سربراہ کو زیادہ ڈسٹرب کر رہا تھا۔

”آج کے مظاہرے کے بعد ہمارے درمیان کچھ نہیں بچا تم بھی یعنی سے ملنا چاہو تو اسے گھر بلا لیا کرنا۔“

جب وہ کمرہ چھوڑ رہا تھا تو وہ اپنی پوری آواز کے ساتھ چلائی۔ وہ وہیں رکا۔

”آج کے اس تماشے کے بعد بھی اور تمہارے تمام کرتوتوں کے باوجود بھی میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہوں، میں تمہیں طلاق دوں گا۔ بھی سوچنا بھی مت۔“ وہ محل سے بولتا ہی اس نے اپنے نیچے کا غم و فہم ظاہر ہونے سے روکا۔

”تم طلاق نہیں دو گے تو کیا میں پھر کے زمانے میں بیٹھی ہوں میرے پاس خلع کا حق ہے۔“ اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا اس نے صوب سے ابھرتی آواز پہ پلٹ کے اسے دیکھا۔

آز تہوارے خون میں جلال عالم کی غیرت یا شناخت ہوگی تو تم کورٹ کچہری کا رخ نہیں کروگی رئیس جبران احمد۔

وہ پھٹکار کے چلا گیا اپنے الفاظ وہیں چھوڑ گیا۔ ان الفاظ نے جلال کے چہرے کو پھٹروں کی طرح چھوا۔

”کورٹ کچہری تو میں جاؤں گی۔“ اور۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسے باپ کی تکلیف کا اعجاز ہی نہیں تھا۔

”آج کل یا پرسوں تم صرف اپنے گھر جاؤ گی۔“ وہ مہذب شائستہ اور رئیس انسان اپنے چہرے پر بڑنے والے پھٹروں میں سے بہت سارے اپنی بی بی کو دان کرتے ہوئے بیانی اعجاز میں چیخ رہا تھا۔ ”جس دن تم نے کورٹ کچہری سے رجوع کیا تو اس دن یہاں سے دو جنازے نکلیں گے ایک تمہارا اور میرا۔“

اگر جواد اور شہود بروقت پہنچ کر انہیں نہ سنبھالتے تو وہ شاید مار ہی ڈالے، رئیسہ کی چیخ و پکار پر جب دونوں بھائی ڈرائنگ روم کی جانب بھاگے تھے تو نگار اور صباہ بھی خود کو روک نہیں پائیں۔

گھر کا ہر فرد ادھر ادھر ہوا تھا سوائے یاقوت کے وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی بی بی کے آنسو گھٹتے ہوئے سوچ چکی تھی کہ اسے اب کیا کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

عالم دلا پر اترنے والی وہ رات ہی ہر بشر پر بھاری نہیں تھی کہ جس کے گزر جانے کے بعد گھر کا سابقہ ماحول بحال ہو جاتا۔ اگر جلال عالم گھر میں کسی سے بات نہیں کر رہے تھے تو یاقوت کا بھی یہیں حال تھا۔ رئیسہ اور زارا کی بات صباہ کے ذکر سے شروع ہو کر اسی پہ ختم ہو رہی تھی اور بلا تفریق ہر ایک کے سامنے ہو رہی تھی جواد اپنی بیوی سے بدگمان نہیں ہوا تھا اس کی بیوی لمبی چوڑی صنائیاں دینے کے بجائے ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی۔ ”کہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔“

وہ جبران کو نہیں جانتا تھا مگر اپنی بیوی کو واقعی جانتا تھا اس لیے کسی کی بات پر اعتبار نہیں کرتا چاہتا تھا، وہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ جبران نے اس کی بیوی کو شعلوں میں گھرے کرے سے کسی انوالومنٹ کے نتیجے میں بچا لیا تھا، وہ اس بات کو بھی جھٹلاتا تھا کہ صبا کا مس کیرج کسی پلان کا حصہ تھا۔

کہنے والے کہہ رہے تھے کہ وہ بھی بچی نہیں تھی کہ ریشمی پردے کے ساتھ جلتا چراغ رکھ کے غافل ہو جاتی۔ اس کے پاس بیوی کے حق میں بولنے کے لیے الفاظ کی دیکھلری ایک دن میں ہی ختم ہو گئی تھی اب وہ خاموش تھا، ہرگز ریتے دن کے ساتھ یہ ہو رہا تھا کہ بات پھلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتا تو ایک جملہ اس کے تعاقب میں ہوتا۔

”سنا ہے جبران نے تمہاری مسز کی وجہ سے تمہاری بہن کو چھوڑ دیا ہے۔“ یہ جملہ اس کے ساتھ اس کے گھر اس کے کمرے تک چلا آتا۔

ان دنوں کسی کو سکون کی ضرورت تھی تو وہ جواد تھا اسی ضرورت کے تحت جب وہ پیننگ کر رہا تھا تو یہ بھول گیا کہ ان حالات میں صبا کو اس کی بہت ضرورت تھی وہ حیران تھی کہ اس پر اعتبار کرنے والا اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

رئیس کی ادھوری خواہش اور اس کے سالم و ثابت دکھ کو قرار آیا تھا اور نہ ہی شوہر کی روادگی کے بعد صبا کے آنسو خشک ہوئے تھے مگر سب نے دیکھا عین کی اجابک آمد سے اس گھر پر گزرنے والے ہر شخص حادے کو بھری چیزوں کی طرح سمیٹ کر عالم ولا کے سابقہ ماحول کو بحال کر دیا گیا تھا۔

ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کا پوتا گھر کی فضا میں کبھی کسی ادھورے پن کو محسوس کرتا وہ ایک مستند انتہائی عملے کی طرح اس کے ہر کام کے لیے پیش پیش رہتی تھی۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ عین نے اپنی دہلیز میں ماحول میں ایک ہلکی سی بے چینی کی بوسہ بھیجی جیسے

پس منظر میں کچھ خراب ہو چکا تھا اگر اس کی ماں کی آنکھوں میں کی تیرتی تھی۔ رئیس آنٹی کے پارہ صفت مزاج میں برہمی تھی۔ عینی کے گنگو میں اپنے پیرش کے خلاف ڈھیروں شکایات تھیں۔

جواد انکل کی مسز غلطی سے اپنا پروردہ اڑا بیٹھی تھی شاید اس لیے اس میں درندہ جس بھرپور طریقے سے ہنستی تھی تو عین کو وہ عینی کی اتج فیلوگتی تھیں، اس نے گھر والوں کے یہ موڈ، یہ ایسوشن اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔

”تمہارا وہم ہے سویٹ ہارٹ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایک ایسی بات چھیڑ دی جو عین کو پسند تھی اور جس پر وہ گھنٹوں بول سکتا تھا وہ بالکل خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

لب بنانے کی دیر ہوتی ہے پھر بات پرانی ہو جاتی ہے گنگو بھر چالی ہے ادھر ادھر بٹ جاتی ہے، وہ عورت اور اس کی پرنسپلشن خاموشی کی طرح قائم و دائم رہتی تھی۔

☆☆☆

عین کی چھٹی ختم ہونے میں دو دن باقی تھے، جلال عالم کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ عین کا جہاز اڑنے کے بعد گھر میں کوئی نہ کوئی تماشا تازہ ہونے والا ہے۔

ان کی چھٹی حس نے پہلی بار انہیں دھوکا دیا اس کی فلائٹ سے ایک دن پہلے عین کو شاپنگ اور پھر ڈنر کے بعد جب وہ گھر آئے تو لان میں ملازمین کا مجمع سا لگا تھا صبا جمولے سے گری تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی۔

وہ اکثر باغبان کی بیٹی کے ساتھ اونچی اڑان کی ریس لگاتی تھی۔ آج دوسری بار وہ جمولے سے گری تھی پہلے جب عین موسم گرما کی چھٹیوں میں آیا تھا پہلی بار گرنے کے بعد اس نے ریس لگانا چھوڑ دیا تھا نگار سے ہاسپٹل لے جا چکی تھی۔

جلال عالم نے ہاسپٹل آنے کے بعد جواد کو کال کی تھی جو اینڈ نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ اسے دتا

ہو چلا جو غلط ہو چکا ہے، وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔

☆☆☆

یا قوت عشاء کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتی تھی، جلال کو اس کے خوب صورت چہرے کے گرد حجاب کی صورت لپٹا دو پشائی تمام دولت سے زیادہ قیمتی محسوس ہوتا تھا۔ نماز مکمل کرنے کے بعد اس نے رخ بدلا، کمرے میں ادھر سے ادھر ٹپکتے جلال کو آرام و سکون سے دیکھا جو اسے ہی گھور رہا تھا۔

اس نے تسبیح کو ہاتھ میں لیا ہی تھا جب وہ بولے

”نیاز صاحب کو تم نے بلوایا تھا؟“

”ہاں!“ وہ اس ایک لفظی جواب کے بعد ورد میں مصروف ہوئی۔

”کیوں؟“ انہوں نے تڑخ کے وجہ پوچھی۔

تسبیح کے دانے گرنے بند ہوئے اس نے شوہر کی طرف دیکھا۔

”رئیسہ پر صرف الزام لاگو ہوا تھا، ثابت تو نہیں ہوا تھا ایک باپ ہونے کے ماتے آپ نے اس سے باز پرس کی اس پر تشدد کیا ویسا ہی الزام صباہ پر لاگو ہوا ہے، اس کے باپ کو بھی اس سے باز پرس کرنے کا اتنا ہی حق ہے۔“

وہ کیوں کا جواب دینے کے بعد دوبارہ سے ورد میں مشغول ہوئی، وہ بے حرکت ہوئے بالکل کسی مردے کی طرح، وہ بولنے کے قابل ہوتے تو کہتے۔

”یہ الزام نہیں کسی بے گناہ پر بہتان ہے۔“ وہ کہتے تم خدا کو خا ضرر و ناظر ہو کر ایک بے قصور بیٹی کے برابر کھڑا کر رہی ہو۔“

وہ بولنے کے قابل ہوتے تو بہت کچھ کہتے وہ بے جان آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھے جارہے تھے۔

سیاہ چہرے کے گرد اس کا دوپٹہ اب دو گواڑی کا بھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

یعنی اس وقت آن لائن تھی، وہ جان چکی تھی کہ اسکرپٹ سین ہو چکا ہے۔ اسے سین کرنے والا اس

فوتاً کال ملاتے رہے۔ صباہ پر یکے بعد دیگرے اس کی خبر ہوئی چاہیے تھی۔ اگلے دن جواد نے اس وقت کال بیک کی جب شہود اور جلال یا قوت کو ہاسپٹل ڈراپ کرنے کے بعد عموں کو ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہے تھے۔

اس کی بیوی کے متعلق سب کچھ بتانے کے بعد وہ اس سے زیادہ دیر بات نہیں کر سکے تھے۔ اسے واپس آنے کو کہا تھا کہ صباہ کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے جواب میں کال کٹ گئی تھی۔

پوتے کی موجودگی میں وہ جواد کو اور کیا کہتے۔ انہوں نے نے سوچا تھا کہ ایئر پورٹ سے قاریغ ہو کر وہ اس سے دوبارہ ہاسپٹل میں بلکہ صباہ کے روم میں بات کریں گے ایک کھنٹے بعد جب وہ دوبارہ ہاسپٹل آئے تو انہیں ریسیپشن سے ہی پتا چل گیا کہ آپ کی پیفید ڈسچارج ہو چکی ہے اس کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ ڈسچارج ہو جاتی۔

انہوں نے چکراتے سر کے ساتھ نگار کو فون کیا نگار نے انہیں جو بتایا وہ سن کے سناٹے میں رہ گئے۔

”وہ جہاں سے بھی گری ہے اس کے ماتھے پر کئی ٹانگے لگے ہیں اس کا بازو بھی فریکچر ہے اس کا بہت زیاں ہوا ہے تو کیا اس وقت میں اپنی بیٹی سے ملنے نہ آتا۔“

صباہ کو نیاز اپنے ساتھ لے گیا تھا یہ سن کر دینے والی خبر تھی، جلال فون کرتے ساتھ ہی اس سے الجھ پڑے نیاز کے جواب نے انہیں اور الجھا دیا۔

”ملنے سے کون منع کر رہا ہے مگر اس طرح ایمر جنسی میں اسے ساتھ لے جانا۔“ اس کی حالت سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی یا، کوئی انہونی تھی جو ان کی جانب رہتی تھی آ رہی تھی، وہ خود کو باور کروا رہے تھے جیسے وہ راستہ بدل لے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

دوسری جانب ان کے دوست نے جب ایک گہری سانس کے ساتھ فون بند کیا انہیں یقین

وقت صرف پریشان نہیں تھا۔ اس خاندان کے جتنے مہرے تھے حیران پشیمان، بدگمان وہ باری باری ان سب سے فائر ہوا تھا۔

پھر گہرے گہرے سانس لے کر کافی دیر باہر گلی میں ٹپٹنے کے بعد، دو تین گلاس پی کر وہ ان مہرہوں سے باری باری نیچے آتا گیا اب صرف بدگمانی رہ گئی تھی، وہ بھی اس رائٹر کے لیے۔ وہ دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کاس کی باتوں میں آ جاتا۔

”اگلے منٹ وہ اسے کال پہ لے چکا تھا۔“ صرف اپنی می کو نچا دکھانے کے لیے تم گریٹی کو جس طرح کی عورت ظاہر کر رہی ہو تو اس پر افسوس کیا جاسکتا ہے۔“

کال کے پک ہوتے ہی وہ بنا کسی ہیلو ہائے کے براہم ہو کے بولا اس کی آواز خشک سج اور زہریلی تھی۔

”جسہیں صرف اس بات پر افسوس ہے، جسہیں صرف گریٹی کی فکر ہے۔“ اس کے حلق میں آواز بھیگ کے رہ گئی۔

”اور باقی۔“ وہ کیسے جانتی باقی بھی کچھ تھا جو اس لڑکے کو بے چین کر رہا تھا۔

صباح کے ماضی سے جھانکنا وہ کردار جس کا نام ابھی بھی ریسیہ کے نام سے جڑا تھا ایک راز جو اس کے حلق میں گم تھا ایک پیغام جو ابھی اس کو سونپا ہی نہیں گیا تھا وہ کس کے لیے تھا۔

ایسی بھگی ہوئی سوچوں کے ساتھ وہ کس کو گناہ کا زخمیہاتا۔

”مجہ جو بھی ہو لیکن میں جسہیں تمہارے گھر پہ تازہوں میں یا قوت عالم کو کھینے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ بے دردی اور سرد مہری سے گویا ہوتے یا قوت کے اس مرید نے یعنی کو جسے ایک اشتعال میں پھینکا۔

”میں اسے کیسے نہ گھسیٹوں یہ یا قوت عالم ہی تھی جو اپنی اولاد کو جتاتی رہی کہ یہ پوری دنیا اصل میں تم لوگوں کی ہی ہے۔ باقی سارے انسان قبضہ مافیا

ہیں۔“ اس کے لہجے میں کیا ایسا تھا کہ وہ ہر گئی بھلا کر گئی تاپے تک اور تا دیر خاموش رہا۔

یعنی اب تیس سال کی ہو چکی تھی، وہ پچھلے کئی سالوں سے جس شخص کی محبت میں اپنی عمر ضائع کر رہی تھی وہ نیلی وژن انڈسٹری کا ایک ایکٹر تھا جبکہ اس کی ماں نے اس کا رشتہ جس سے طے کر دیا تھا، وہ ایک مل اڈر تھا۔

”تم ایک دن میں اپنے لٹج، ڈنر شاپنگ اور سوشل ورک پر لاکھوں خرچ کرتی ہواتا تو وہ سال میں بھی نہیں کھاتا ایک اداکار کو اگر کام نہ ملے تو اس کی جیب میں کچھ نہیں ہوتا۔“

کچھ دیر کو ان دونوں کے درمیان سے ماضی اور اس سے منسلک حقیقتیں کسی پردے کے پیچھے چھپ گئی تھیں ان کے بیچ وہ بچپن لوٹ آیا جب وہ اس سے شکایتیں لگاتی تھی اور وہ خاموشی سے سنتا تھا۔

”شادی اگر اپنی کلاس میں ہو تو ہزار گنجیوں کے بعد بھی گزرا ہوا ہی جاتا ہے۔“

”عورت گزرا کرنا چاہے تو ہر حال میں کر لیتی ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کے برجستہ بولی۔ ”ہم لوگیاں اگر چاہیں تو ہر حال اور ہر قسم کے حالات میں گزرا کر گئی ہیں۔“

وہ اس جملے پر دوسری بار ساکت ہوا اگر وہ ذکیہ کا بیٹا ہوتا تو جادو گر بن جاتا اور جہان بھر کی لڑکیوں کے ہاتھ میں ایک گلابی پھول رکھ آتا۔

”اور اگر گزرا نہ ہو سکے تو پھر واپسی کا سفر طے کرنے کے بعد عورت صباہ بن جاتی ہے پھر وہ ہر نعمت کا اصل ذائقہ بھول جاتی ہے۔“

وہ جادو گر نہیں بن سکتا تھا اس نے اسے حقیقت دکھانے کی کوشش کی۔

وہ اس کی بات پہ ہلکی پھر سیدھی ہوئی وہ اس سے کیا پوچھ رہا تھا اس نے سنای نہیں حتی کہ اس کے موبائل سے خاموشی پھوٹنے لگی۔

وہ میٹر پہ رہن ہانڈے جیسی بات تھی اگر نشانی

مل جائے تو راستے تلاش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

وہ سمجھتا تھا کہ اس دنیا میں ایک چیز نایاب تھی،
ناپید تھی وہ تھی لاکھی، بے فکری جو مون نے اپنے بعد
بدرا کے پاس دیکھی تھی۔

یہ آج ہی ہوا تھا جانے کون سے لمحے میں اس کا
دل پھٹا شاید اس وقت جب باہرگی میں اس نے
پرانی دین سے اترتی صباہ کو دیکھا تھا اس کی نگاہ
جو بھل ہوئی صباہ سے یہ سب کیوں چھین لیا گیا۔

بدرا کی ہنسی سننے سننے اس نے اس عورت کے
وجود کا مردہ پن محسوس کیا جو بھی ان کے گھر کا فرد تھی۔

اس لمحے اس نے تہیہ کیا تھا اس پہ لگا الزام
ثابت ہو بھی گیا تو وہ اس کے ساتھ کھڑا ہوگا آج
گھر میں پہلی بار ڈھونڈ رچی گئی تھی۔ بدرا محلے کی
لڑکیوں کے ساتھ حلق بھاڑ کے گاری تھی۔

”سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا آج بھی ہے
اور کل بھی رہے گا۔“

وہ اس کے سامنے سے گزرا، وہ اس پر نگاہ
ڈالے بنا آگے بڑھ جاتا کہ اسے بروقت یاد آیا
چشم کو تیار ہو کے وہ با آواز بلند اپنی تعریف کر رہی
تھی۔

اس وقت سڑکیاں چڑھتے مون نے پلٹ
کر نہیں دیکھا تھا اب وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دنیا کی
سست ترین لڑکی آج ہال سنوا کر اور منہ ہاتھ دھو کر کیسی
لگ رہی ہے۔ اس نے رخ موڑا دونوں نے ایک
دوسرے کو دیکھا۔ نگاہ ملی اور سو سال پہلے کے زمانے
میں بھٹک کے واپس آ گئی پھر سیدھا ہو گیا تھا پھر اس
نے برآمدے کے ستون سے لگی صباہ کو دیکھا۔

”سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا۔“ اس کے
لبوں نے لڑکیوں کی آواز کے ساتھ بس گیت کے اسی
بول تک ساتھ دیا تھا پھر وہ خاموش ہوئی، لب باہم
پیوست۔ وہ جانتی تھی محبت کے گیت کو کسی بول تک
بھی چھوڑ دیں پھر اسے سانس مکمل کر سکتی ہے
پھر اسے دل گنگنا لیتا ہے۔ وہ اس شور اور گہما گہما سے

بچتا بچتا نا قافر کے کمرے میں آیا جہاں ٹیبلر پردوں کا
ناپ لے رہا تھا۔

”طول و عرض میں بیشی کی خیر ہے مگر کی نہیں
ہونی چاہیے۔“

وہ ٹیبلر کو ہدایت دے رہا تھا۔ جب جواد کی کال
آئی، رچی علیک سلیک کے بعد جب اس نے بات کی
تو وہ کرنٹ کھا کے اچھلا، اسے اپنی اور بیٹی کی گنگو یاد
آئی۔

”اوشٹ ا“ اسے اپنی بے اختیاری پہ تپ
چڑھی۔

بس نشانی ملنے کی دیر تھی پھر بیٹی کے لیے نگار
سے کچھ بھی اگلو نامشکل نہیں تھا۔

اب جواد اسے کوئی پیغام دے رہا تھا۔ پیغامبر
سنائے میں اترے۔ کیا محبت ہمیں اتنا اختیار دیتی ہے کہ
چھڑے ہوئے لوگوں کو جب بھی بے قرار کجوں میں
پکارتیں تو جواب میں انہیں پلٹ کر دیکھ لیا جائے گا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکا تھا کہ جب بات آج
اور کل پٹائی تھی تو اس نے اپنے لب ہی لیے تھے۔

اس شوقیہ اداکار کو وقت نے پیغامبر کا عہدہ
سونپ دیا تھا تو وہ اس اتنے پتے کا خنجر تھا جہاں اسے
پہلا پیغام پہنچانا تھا۔

☆☆☆

اس وقت جب دن کا دوسرا پہر روشنی میں ڈوبا
ہوا تھا وہ تینوں اندر دو لہا کے کمرے میں دیواروں کی
آرائش کو آج قائل بچ دے رہے تھے، بدرا بطور
فرمائش کے خرید والی گئی بینکنگز کو۔ کھیتی تو منہ بنا کر
ایک ہی جملہ بولتی۔

”اس سے اچھا تھا میں ساتھ چلی جاتی۔ تم
دونوں یہ کیسی رنگ برنگے پھولوں کی، تازہ پانیوں
اور جنگلوں میں ہنستی مسکراتی لڑکیوں کی بینکنگز اٹھا
لائے ہو۔“ وہ منہ بسورتی ہوئی بولی تو چوگی اور آخری
تصویر کے آگے کھڑا قافر ہلکا سا ہنسا۔

”یار اب ایک دولہا اپنے کمرے میں برا سرار
نیلگوں رنگوں کے پس منظر میں ساطوں سے ملی خالی

کشتیاں اور وحش کے بچے جیسے اداس شکل والے
چاند کی تصویریں کیوں لگائے گا۔" وہ تہہ لگا کر بڑا
بڑا ہنسی تھوڑی لگتا ہے۔ جیسے دیکھ دیکھ کے وہ
مسکراتا سکھ لیتا ہے۔

اس کے لبوں سے بے ساختہ سرکینے والی ہلکی سی
آہ میں کیا کچھ نہیں تھا کہ دیوار پر چوگی اور آخری
پینٹنگ کو سیٹ کرتے عون کے ہاتھ رکے، بدرا کے
چہرے نے بھی رنگ بدلا شاید وہ کچھ کہتی۔ تب ہی
زرگس دروازہ کھول کر اندر آئی اس کے ہاتھ میں کچھ
خالی کارڈ تھے۔

"تمہاری وہ سہیلی جس کے بھائی کی شادی پر تم
نے میری پوری کمیٹی تھیلیاں تھی یہ کہتے ہوئے کہ
بڑے امیر لوگ ہیں اس سے دگنا لوٹا میں گے اپنی
اس خاص الخاص سہیلی کو تم نے شادی کا دعوت نامہ
ابھی تک نہیں بھیجا۔" اس بات پہ بدرا کا رنگ اڑا۔
"اچھا وہ نیلم ا" اس نے وہ کولیا
سکینچا۔ "انہوں نے تو گھر بدل لیا ہے، اماں اب وہ
بہت دور رہتی ہے۔"

اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا اس کی توجہ
اسی ناپسندیدہ سینیئر پر بھی جو اس وقت اسے اچھی
خاصی لگ رہی تھی۔

"کان کھول کے سن لو ابھی تمہاری سہیلی ہنزہ
جا بسی ہو اگر وہ شادی پر نہ آئی تو پھر اپنا حشر دیکھنا
، عجیب لڑکی ہے۔ دیتے وقت حاتم طائی بن جاتی
ہے جب وصول کی باری آئے تو بادشاہ زری لیکن
میں عام سی بندی ہوں جس جس کو جو کچھ دیا
ہے، وصولیاں کر کے رہوں گی۔ سارے کام چھوڑ کر
تیاری پکڑو۔ میں عون سے کہتی ہوں رکشہ پکڑ
لائے۔"

اس نے پلو سے سو کے دلوٹ کھول کر اس کے
ہاتھ پر رکھے۔

عون نے اچھی خاصی دیکھ دیکھ کر پینٹنگ سے
نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔ آج پہلی بار وہ اس کا چہرہ اترا
ہوا دیکھ رہا تھا جس کی ماں اسے حاتم طائی کہہ رہی تھی

جبکہ وہ اسے چورنی کہہ سکتا تھا۔
☆☆☆

"تمہارے سر پر بدرا کے رشتے کا جنون سوار
ہے تو دور پار دیکھنے کے بجائے اپنی آنکھیں کھولو تو
اچھا خاصا رشتہ گھر میں موجود ہے۔"

عون اور بدرا کے گھر سے نکلے ہی مانی کو بات
کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس بات پر ان کی سازشی
کو تہہ لگانی زرگس چہرہ اٹھا کے استفسار یہی ہوئی۔
"یہ گھر سے آپ کی کیا مراد ہے؟" وہ واقعی
کچھ نہیں سمجھتی تھی۔

"ارے نادان میں عون کی بات کر رہی ہوں۔
ایک دفعہ کاٹھ کا پڑھا لکھا، تیز دار بچہ ہے، نوکری بھی
جلدی لگ جائے گی ان شاء اللہ تو اپنا دامغ سیٹ کر
میں تو آج کل میں یہ بات قاخر کے کان میں بھی
ڈالنے والی ہوں۔"

مانی جو آج کل ہر وقت عون کو تاڑتی رہتی تھیں
برجوش سی ہو کر بولیں۔ "آپ کا مطلب ہے یہ عون،
یعنی رکیہ کا بیٹا۔" اس نے پھٹی آنکھوں سے پوچھا پھر
لفی کی صورت سر کو جھٹکا۔

"کمال کرتی ہیں اماں! جہاں سے ایک بار
رشتہ ٹوٹا تھا، اب دوبارہ وہاں کیسے بات چلاؤں۔"

"رشتہ ان لوگوں نے نہیں تیرے خاوند نے
توڑا تھا بی۔"

زرگس نہیں جانتی تھی کہ مانی اس رشتے کے متعلق
کس قدر سنجیدہ تھیں۔

"باپ کا سایا اس کے سر پہ نہیں، دکان کا جانے
کب ہو ارا ہو گا نہ تو بدرا اتنی ذمہ داریاں اٹھاپائے گی
نہ ہی میں ایسے شخص سے بیٹی بیاہوں گی جو ذمہ
داریوں میں گمراہ ہو۔"

وہ تہہ شدہ پکڑے اٹھا کر اندر کمرے میں گھس
گئی۔ مانی نے سوچ لیا تھا کہ جب رکیہ شادی پر آئے
گی تو وہ اس سے خود بات کرے گی۔

☆☆☆

رکشہ لال بتی پر رکا تو کوفت میں جلا عون نے

فون کھول کے وقت دیکھا جب وہ گھر سے نکلے تھے تو شام اتر رہی تھی ابھی واپسی کے راستے پر رات کے آنکھ تپتے تھے مٹیوں پر جگہ جگہ پرین پڑی تھیں تو اسے احساس ہوا جیسے وہ آنسو پونچھ رہی تھی اب اس نے غور کرنے والے انداز میں دیکھا، سوس سوس کی آواز واضح تھی ان لودلوں میں اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں بھی آنسو آسکتے ہیں، وہ ملکا سا کھٹکھٹا رہا۔

”اگر تمہاری دوست سمجھتی ہے کہ نیا منزل میں رہنے والی اس کی سہیلی اب امیر ہو چکی ہوگی اور رکشے کے بجائے اپنی گاڑی پر آئے گی اب اگر وہ غلط اندازے لگا کے بیٹھی تھی تو یہ ایسی بات نہیں کہ اس پہ رویا جائے۔“

عون کی اس بات نے اسے سرائٹھانے پہ مجبور کیا وہ رونا بھول گئی اگر غنیم کی آواز بیشک تک جا رہی تھی تو پھر ان سہیلیوں کی بانی کھنگو بھی محفوظ نہیں تھی۔

”تمہارے کپڑوں کی چوڑائی میں ذرا تفاوت نہیں آئی اور تمہارے بال ویسے ہی جنگل نما یہ بات بھی بیشک تک گئی ہوگی۔“ اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اس سے اگلی بات کی فکر میں جھٹا ہوئی۔

”تمہارے لباس سے اٹھتی خوشبو بہت عمدہ ہے۔“ عون نے یہ جملہ بھی تو سنا ہوگا، ہائے اللہ نہ کرے کیونکہ وہ پر فیوم۔

رکشے میں اس کے قریب بیٹھی وہ اس راز کو چھپانے کی فکر میں تھی حالانکہ وہ پیاری اور قیمتی خوشبو رکشہ ڈرائیور کو بھی محفوظ کر رہی تھی اب وہ کمر کی سے باہر جھانک رہا تھا سہیلی نے یہ بھی تو پوچھا تھا۔

”تمہارے ساتھ یہ چنڈ سم لڑکا۔ کون ہے؟“ کافی دیر تک جب اس نے کوئی اور بات نہیں جتنائی تو اس نے سر جھکا کر آنسو بہانے کا سلسلہ دوبارہ بحال کیا۔ یہاں تک کے گھر آ گیا۔

”اماں پوچھیں تو کہہ دینا کہ ہم ڈنر میں پلاؤ، کباب اور قورما کھا کر آئے ہیں۔“

گھر کا داخلی دروازہ پار کرنے سے قبل آنکھوں

کو دوپٹے سے رگڑتی ہوئی وہ رندھی آواز میں بولی تو اس آسودہ حال شخص کا سر کھوما، ایک تو پیٹ بالکل خالی تھا، اوپر سے قورمہ پلاؤ جیسا جھوٹ اس نے بے اختیار ہی کبر اسانس لیا وہ گھر کا داخلی دروازہ پار کر رہی تھی اور وہ باہر کھڑا بند دروازے کو گھور رہا تھا، وہ خیالی پلاؤ پہ گزار نہیں کر سکتا تھا گلی کر اس کر کے مین روڈ کی طرف بڑھا وہ نوجوان نہیں جانتا تھا کہ اس شہر میں یہ اس کی آخری رات ہے۔

☆ ☆ ☆

”غلام بے چاری کے حالات تو بالکل بھی اچھے نہیں ہیں وہ دن بزار کہاں سے لائے لی اور یہی حال بشری کا ہے اگر وہ دونوں شادی اٹینڈ نہیں کرتیں تو اماں ان کے گھروں تک پہنچ جائیں گی بالقرض وہ آ بھی گئیں تو اماں کو تو تم جانتی ہو۔ آج کل آلی بھی میری کچھ مدد نہیں کر سکتیں تو میری آخری امید تم ہی ہو۔“

صوفے پہ سوتے جاگتے عون نے اسے کمرے میں آتے دیکھا تھا شاید وہ کسی کو اپنے حالات بتا کر اس سے ادھار مانگ رہی تھی تو اس وقت عون پہ خند غالب آ رہی تھی لائٹ گئی ہوئی تھی مگر کمرے میں لائٹیں جل رہی تھی جب پہلی ہی ادنگہ میں اس کی نیند ٹوٹ گئی تو وہ سمجھ نہیں پایا کہ آگھ مٹنے کی وجہ کیا تھی۔

چند سیکنڈ تک اس نے محسوس کیا جیسے وہاں کوئی رو رہا تھا اس نے کروٹ بدلی اور دم بخود رہ گیا لائٹیں کی زبردروشنی میں وہ ہچکیوں کے ساتھ دلی آواز میں رو رہی تھی۔

”اوہ، مائی گاڈ!“ وہ حیران ہوا پھر اسے یاد آیا وہ کمرے میں آئی تھی اس کے ہاتھ میں (حق) لائٹیں تھیں، وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ کیا بات کر رہی تھی اس کا رونا دھونا ظاہر کر رہا تھا کس کی آخری امید بھی دم توڑ چکی ہے۔

وہ جب کھانا کھا کر واپس آیا تو قاف خروک سے دہن کا سامان اتر رہا تھا، وہ بطور ہلپر کمرہ سیٹ

کروانے تک بری طرح تھک گیا تھا۔ اسی دوران
ماں کی کال اور مٹی کے کچھ آتے رہے تھے وہ وحشی
طور پر بھی اپ سیٹ تھا۔
اس پینا مبر نے سچ سچ پر بھی جانا تھا۔

”اس خدمت گار سے انکی کیا خطا سرزد ہوئی
ہے کہ آدھی رات کو اس کے کمرے میں آ کر اس کی
نیند خراب کی جا رہی ہے۔“ وہ اسے چڑانے کی غرض
سے نہیں سچ سچ بھنا کر بولا۔

”میں آتی یا اماں کے کمرے میں اپنا دکھ کیسے
نکال سکتی ہوں اور کمن میں مجھے پھر کاٹ کھا نہیں
گے، پلیز تم چپ کر کے سو جاؤ۔“ اس نے صوفے
سے نیچے لٹکتے دوٹے کو اٹھا کر اس کے پلے سے ٹاک
پوچھی پوچھی گزری تو وہ بولا۔

”تمہارے پاس تو ہمیشہ پلان ہوتے ہیں اگر
اے لیل ہو چکا ہے تو پلان بی کا سوچ۔“

وہ سیدھا ہوتے ہوئے ہلا خراشہ کر بیٹھ گیا وہ
چوکی اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔

”میرے پاس کچھ سیونگ ہے تم چاہو تو میں
تمہیں ادھار دے سکتا ہوں۔“ وہ ٹیبل کے نیچے مٹی
چٹل کا ایک پاؤں اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا، ارادہ
کمن میں جانے کا تھا۔

وہ سار کا بیٹا تھا سار کا بھائی تھا کبھی کبھار تو اس
جیولری شاپ پر بیٹھتا ہی ہوگا۔

”مجھے اب تم سے یا کسی سے بھی ادھار نہیں
چاہیے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“
وہ ون سٹر صوفے سے اٹھتی ہوئی ایک دم ہی تھری
سٹر صوفے پہ آئی۔

”میں اپنی یہ سونے کی بالیاں بیچ دوں گی۔“
اس نے بالیوں کو چھوا۔ ”آئی اس کام میں میری
ہیلپ نہیں کریں گی۔ اس کے لیے مجھے تمہاری ہیلپ
چاہیے، یہ بالکل اصلی سونا ہے چالیس ہزار تک تو بک
جائیں گی؟“ ٹیبل سے لائین اٹھا کر چہرے کے
قریب لاتے ہوئے وہ سار کے بیٹے سے بالیوں کی
قیمت پوچھ رہی تھی، اپنی سہیلیوں کی بے بھری

پر خوفزدہ ہو کر رونے والی ان کی عزت نفس، ان کی خود
داری کو بچانے کی خاطر اپنی قیمتی چیز نیام کرنے والی
وہ لڑکی یکدم ہی اس کے لیے بہت خاص ہو گئی تھی۔

کوئی کیسے بہوت ہوتا ہے۔ کوئی کیسے اسیر ہوتا
ہے عون نے اس ایک لمحے میں جانا بظاہر اس میں کوئی
خوبی نہیں تھی لیکن ضرورت مندوں کے لیے پلان بی
پر جانے والی وہ لڑکی اصلی سونے سے کہیں زیادہ قیمتی
تھی۔ اس کے چہرے اس کی آنکھوں میں کھمرے
پانی نے اس کو کوئی گہرائی تک اپ سیٹ کیا لائین کی
زرد لوہا پڑنی جا رہی تھی شیشے میں جو چمک رہا تھا وہ
اس روتی بسورنی لڑکی کا چہرہ تھا، لو تو عون شہود کے
انداز بھڑک اٹھی تھی یکدم، اچانک۔

☆☆☆

”علی الصبح کی ایسی مصروفیات صرف آپ جیسے
مستقل مزاج ہی بحال رکھ پاتے ہیں۔“

صباح کے سامنے کمرے عون نے اس کے
معمول کو آج پھر سراہا جبکہ نگاہ اس کے ہاتھوں پر تھی،
اس کے ایک ہاتھ میں تہہ شدہ کاغذ تھا دوسرے میں
ایک چھوٹا بے نما چیز تھی جو شاہ پر تھی۔

”یہ مصروفیت نہیں پرندوں سے محبت کا اظہار
ہے یہ عادت مجھے اپنے باپ سے ترکے میں ملی
ہے۔“

وہ معمول کے حساب سے مسکرائی اس نے شاہ
عون کی طرف بڑھایا۔ کمن میں کھڑا وہ لوجوان آج
اعتراف کر سکتا تھا کہ وہ نگڑ والے کمرے کے جالی
دار دروازے کی کھٹاک کا شکر تھا۔

”اور جب آپ یہاں سے چلی جائیں گی۔“
شاہ پکڑتے ہوئے اس نے موٹے بھدے کوٹے
سے نظر ہٹائی اور کمنی کا بھنا دانہ ایک معصوم چڑیا کی
طرف اچھالا۔

”مجھے کہاں جانا ہے؟“ اس نے گردن موڑ کے
اسے حیرت سے دیکھا جو چڑیا پھنسا رہا تھا یہ منظر مدرا
بھی کھڑکی سے دیکھتی تو ہنہ کے ساتھ سر جھٹکتی
(ہرجائی) وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے

جس پر ایک ایڈریس درج تھا۔
 وہ تہہ شدہ کاغذ ابھی مباحہ کے ہاتھ میں ہی تھا
 آپ تعلیم یافتہ ہیں تو ان کی نسل کی خاطر ہی ان
 فرسودہ روایات کو ختم کر سکتی ہیں۔ اب بھی کورٹ سے
 رجوع کریں اور صلح کے بعد ایک نئی زندگی کی
 ابتدا کریں۔“

وہ لڑکا جو بات کرنے اور ہنسنے مسکرانے کے
 معاملے میں اس کی بھانج کی کنجی کو بھی مات دیتا
 تھا۔ وہ اس کی بات پر ششدر رہ گئی جو دوسری شادی
 کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔

وہ ان کی برادری کا دوسرا سرد تھا پہلا قاخر تھا۔
 ”ارے یہ تو اوپر کاٹھ کیاڑ میں پڑی ہوئی تھی
 یہ بدرا کے ہاتھ کا کمال ہے دیکھو تو رنگ دار ہو کے
 پہچانی ہی نہیں جا رہی۔“ اس نے بات بدلی کل زنگ
 نے اسے کاٹھ کیاڑ میں سے کام کی چیزیں الگ
 کرنے کو کہا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ان میں کام کی
 چیزیں کون سی ہیں پھر بدرا آگے بڑھی گئی۔ بجلی کی
 تاریں، لوہے کے کچھ ٹکڑے، رانے چنگ کے ٹوٹے
 گول ستارے لکڑی کی خستہ حال چوکی، اس نے ان
 کام کی چیزوں کو الگ کیا تو عموں کو اس کی دماغی حالت
 پر شبہ ہوا۔

وہ ان ٹوٹی چیزوں کو الگ کر کے کیسے خوش ہو
 رہی تھی۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ
 دوبارہ اسی موضوع پر جاتے ہوئے بولا اس نے رنگ
 دار چوکی سے نگاہ ہٹائی تھی وہ اس وقت بدرا کے کمال
 پر سوچتا تو باقی ہر بات اپنا منصب کھودیتی۔

مباحہ نے جیسے ہتھیار ڈالے ”اب وہ بات نہیں
 رہی جب عورت کو تر کے میں صرف رسم و رواج سے
 حصہ ملتا تھا اب کی وفات کے بعد یہ ممکن تھا مگر زندگی
 آپ کو توڑ کے دوبارہ سے جوڑ دے تو پھر زندگی کو
 ویسے ہی کسی دوسرے تجربے کی نذر نہیں کرنا چاہیے۔“
 اس نے تہہ شدہ کاغذ عموں کی جانب بڑھایا،

جب اس کی زندگی دوسرا تجربہ کی نہیں کرنا چاہی کی تو
 پھر اس پورے شہر میں عموں وہ پہلا شخص کیوں تھا جسے
 اس نے رازدار بنالیا تھا۔

اس نے کاغذ پکڑا تو نگاہ اس کی خالی کلائیوں پر
 پڑی۔ اس سے کہنا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے کچھ لوگ اسے
 پھینک دیتے ہیں۔ کچھ سنبھال کے اپنے اندر رکھ لیتے
 ہیں۔“

اس کے لہجے میں کڑواہٹ ہی نہیں غصہ بھی تھا
 ویسا غصہ جس کے بعد ہم چیزوں کو دور اچھال دیتے
 ہیں، وہ حیران ہوا جب وہ زہانی کلائی پیغام بھیج رہی
 تھی تو پھر اس کاغذ میں کیا تھا۔

قاصد نے تہہ شدہ کاغذ کھولا۔
 ”تمہارے یہ دو قیمتی تحفے میرے پاس تمہاری
 امانت تھے۔“ دوسری لائن پہ عالم دلا کا ایڈریس درج
 تھا۔

وہ جس کی کلائیاں آج خالی تھیں۔ وہ پھر بھی
 قیمتی تھی، خاص تھی۔

وہ رشتہ سنبھالنے والوں میں سے تھی یا دوسری
 کھٹکری میں آئی تھی وہ بھی نہ جان پاتا مگر اس نے
 جان لیا تھا۔ اس عورت نے پرانے چنگ کے ٹوٹے
 گول میناروں جیسے رشتے کو سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔

وہ وہاں سے جا چکی تھی وہ وہیں کھڑا تھا۔ چڑیا
 نے اس سفید پڑتی رنگت والے لڑکے کو ناراض
 نظروں سے دیکھا جو کئی کے دانے اب مونے کوے
 کو ڈال رہا تھا۔

”تم ان ٹوٹی چیزوں کا کیا کرو گی؟“ کل اس
 نے بدرا سے پوچھا تھا۔

”آئی کہتی ہیں ٹوٹی ہوئی چیزوں کو یا تو امدھے
 کنویں میں پھینک دیں یا انہیں اسکی جگہ رکھ دیں
 جہاں ان کے حریف ٹوٹنے کا امکان نہ ہو لیکن میں ایک
 تیسرا کام کروں گی میں انہیں بیچوں گی۔“

وہ بھی کچھ جاننے کی خاطر یہاں آیا تھا وہ
 عورت زمانے کی نظر میں جس کی حق کشی ہوئی تھی اب
 وہ کس مقام پر کھڑی تھی۔ اس وقت آم کے پلڑے کے

نیچے کھڑے حون کا مطلق ٹکین ہوا، آج پہلی بار صباہ اور جواد عالم کا گھر ٹوٹے پر اس کا مطلق ٹکین ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ کچن میں آیا تو بریج ٹائم بھی گزر چکا تھا وہ چوہے کے آگے کھڑی کپ میں چائے نکال رہی تھی، اس نے آہٹ پہ سر اٹھا کے دیکھا پھر معمول کا جملہ دہرایا۔

”تمہارے لیے بھی بنائی ہے۔“ وہ چوکھٹ سے ذرا آگے کھڑا تھا۔

”تم صبح سے جس طرح غائب تھے میں تو ڈر گئی تھی واقعی اگر تم چلے جاتے تو میرے کام کا کیا ہوتا۔“ وہ جب اس کی طرف آ رہا تھا تو وہ تیزی سے بولی وہ جیسے غم سا گیا۔ آصف کے بیٹے کو پردہ دار چائے سے مستفید کرنے والی اسے ایک ٹوٹ چکے رشتے کے پچھتاوے میں دیکھنے کی طالب خود دیکھا ہی ہے بے فکر بے نیاز تھی۔

وہ اس کے پیچھے آ رکا۔ ”میں واقعی چلا جاتا تو تم صرف اپنے کام کی وجہ سے پریشان ہوتی؟“ یہ کیا سوال تھا وہ چوک کے مڑی وہ کاؤنٹر سے چائے کا کپ اٹھا کر لیوں سے لگا چکا تھا۔

اس نے اس کی آنکھوں کو دیکھا پھر آنکھوں میں دیکھا پھر نظر چڑالی، وہ رات کو سیاہ تارکول کی سڑک پر متوحش سا پھر تار ہا تھا، اس کے ساتھ یہ کیا ہوا تھا وہ ایک دم سے اس قدر رشید فیلسفہ کا شکار ہوا تھا، وہ خود سے ہی اپنا حال پوچھتا رہا، کیا اس وقت جب اس نے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ذرا سادا کیا تھا اور وہ دروازہ قد فص جیسے پورے کا پورا اس خلا میں سما گیا تھا۔

اس نے کینٹ سے گنگ نکال کے اپنے سامنے کیا پھر اس میں سے بالیاں اٹھا میں اب وہ انہیں ایک کپڑے میں باندھ رہی تھی وہ دیکھے جا رہا تھا یہ کون سا ہمکٹ تھا، کانوں پہ گرتیں، کندھوں پر چھوٹیں شالوں سے نیچے کمر کے ہر زاویے کو چھوٹیں ان بالوں کی ہر لٹ سائز میں دوسری سے الگ تھی۔ وہ پہلا دن نہیں تھا جب اس نے اس کے

ہمکٹ پہ غور کیا تھا مگر یہ پہلا دن تھا جس پر اسے لگا اس نے بالوں کے اس بے ترتیب جنگل سے بھی پتاہ مانگی ہی نہیں تھی۔

”بدرا اذرا دیکھنا حون کہاں ہے اسے اماں بلا رہی ہیں۔“ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی زگس نے ہانک لگائی۔

”میں چائے پی لوں تو۔“ جواب کا اگلا حصہ منہ میں ہی رہ گیا اس نے برق رفتاری سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ایک تو کچن کا دروازہ کھول دیتے ہو اوپر سے اعلان کرتے ہو۔“

وہ اس کے لیوں سے ہاتھ ہٹا کر خنگی سے بولی تو اس نے ہاتھ پکڑ لیا ایک عادی چور ایسی چیز کیسے چما سکتا ہے جو ہوا میں بکھر کر دوسروں کے حواس چھو لیتی ہے وہ جتنی ہو یا کلون کی مہک، اسے رکشے کا سفر یاد آیا اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

اسے نیلم کی بیشک تک جانی ہا میں یاد آ میں۔ حون کے پورے وجود میں ایک تبدیلی تھی جو بدرا نے پہلی بار محسوس کی تھی تو میرا خواب سچ ثابت ہوا اس لیے ہاروؤں والی گڑیا نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اس تک سے نئی صراحی میں بند کر دیا تھا۔

وہ کیا کہہ رہا تھا وہ اٹھار غیر متوقع تھا وہ بات ناقابل فہم تھی۔ اک ٹوٹا ہوا رشتہ اتنی جگہوں سے اور کہاں کہاں سے جڑ گیا تھا وہ گنتے نہ سکتی تو کن نہیں پائی۔ یہ تو سمجھ میں آ گیا تھا کہ ابتدا تو ہولی ہے آواز تو ہوتا ہے، کیا دنیا میں کچھ آخری بھی ہوتا ہے۔ آخری بات، آخری نظر، آخری قدم۔ آخر کار، آخر کار۔

☆☆☆

وہ انہیں دیکھ کے چوٹکانہ ٹھکانا بس برآمدے کی پہلی سیڑھی پر رک کے انہیں دیکھا ایک سرد پاٹ نگاہ کے ساتھ، پھر جیسے اس نے خود کو پکڑ کے ان کے سامنے پیش کیا، وہاں اس وقت چار لوگ موجود تھے دو افراد وہ تھے، جنہیں وہ بچپن سے جانتا تھا۔

وہ ان سے نظر ملائے بنا آگے بڑھا۔ اس نے خود کو ان دو کے سامنے پیش کیا جن کو وہ شعوری عمر میں

آنے کے بعد پچھلے لوگوں سے جانتا تھا تو گویا انہوں نے ان لوگوں میں ذکیہ کے بیٹے سے محبت کی تھی۔ اب ان کی آنکھوں میں اجنبیت تھی، غیرت تھی، غصہ، صدمہ جانے کیا کیا۔

”آئی ایم ویری ویری سوری۔“

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی جرم نہیں کہ وہ نظر جھکا کے معافی مانگتا۔ ان کی ٹھوس خاموشی، ان کے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ عمن کے آنے کے بعد یہاں جو بھی اور جس غلط فہمی کے نتیجے میں ہوا۔ وہ سب کچھ ان کے علم میں آ چکا ہے۔

”میں نے حقیقت بتانے کی کئی بار کوشش کی لیکن میری قسمت میں تھا کہ میں نے جو محبت آصف کا بیٹا بن کے پائی۔ عمن عالم کو یہاں ٹوٹ بھی نہ سکتی۔“

وہ محسن اور یحییٰ کی جانب دیکھے بتا ان دونوں کو خدا حافظ کہتا ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا۔ اس نے وہاں اپنی تمام چیزوں کو سمیٹا پھر کمرے میں نگاہ دوڑائی کیا اس نے سب کچھ سمیٹ لیا تھا۔ اس نے بیک اٹھایا۔ ثانی اندر کمرے میں سوری تھیں وہ صرف خدا حافظ کہنے کے لیے ان کی نیند خراب نہیں کر سکتا تھا، نرگس آنٹی کب کی بازار گئی ہوئی تھیں وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر گئی میں آ گیا۔

سامنے دو گاڑیاں کھڑی تھیں وہ دونوں ہی اسے جانتے تھے کہ ایسی صورت حال میں جب وہ اس کی مرضی کے خلاف یہاں آئے تھے تو وہ ان کے ساتھ سفر کرنا تو دور کی بات انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ وہ گاڑی کے پاس آیا تو ڈرائیور نے مستعدی سے دروازہ کھولا، عمن اسی وقت اس تازہ چنٹ شدہ عمارت کے سامنے رکشہ رکھا، اسے یاد آیا وہ نرگس آنٹی کے ساتھ جو تازہ خریدنے گئی تھی جب بحری جہاز مرشے کے ساتھ لگ چکا تھا تو نقارہ بجا۔ مٹی کی قوت گویا کی واپس لوٹ آئی ہے، وہ جاسکتی ہے کہ اس کے جوتے کا دوسرا پاؤں کس سمت میں گم ہوا تھا۔

رکشے سے سامان نکالنے کے بعد اس نے رخ پھیرا وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا، وہ ماں کے ہاتھ سے شاپر پکڑتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔ خالی رکشہ گاڑی کراس کر گیا۔ جوتی کا جوتا ڈھونڈے گا، وہی تین سو پینسٹھ موسموں کا حق دار ہوگا۔

”ارے مالالقی تو ادھر منہ اٹھا کے کھڑی رہ حیرا جو تارکشے میں رہ گیا ہے۔“

یہ کھلائی ہوئی نرگس نے رکشے کو تارنا چاہا تو نگاہ خون پر پڑی۔

”دیکھ تو عمن اس کا اتنا مہنگا جوتا کم ہو گیا۔ ذرا رکشے والے کو تو پکڑ۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے وہ تین سو پینسٹھ موسم پانے کی شرط پوری نہیں کر سکتا تھا اس کے ماتحت اسے لینے آ گئے تھے۔ وہ جزیرے میں شناخت ہو چکا تھا وہ ساٹھ لاکھ کی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

ایک ہلیر کی حیثیت سے وہ مٹی کے جوتے کا دوسرا پاؤں کیسے تلاش کرتا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تھا مسن کی ایک الگ دنیا تھی، وہ اس جزیرے میں کیسے ٹھہر جاتا۔

گاڑی بہت آگے نکل آئی تھی اس میں روتھ بی کی آواز گونج رہی تھی۔

میں گل قاصدی کے میدان میں ہوں ہر ایک گل کی خواہش ہے کہ آپ میرے ہوں گے آپ میرے ہوں گے

اور میں تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے دیکھتا ہوں اور وہ کہتا ہے جب میں تمہیں سکرانے دیکھتا ہوں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔

وہ گل قاصدی کے میدان سے بھاگ آیا تھا۔ ہندوانہ طرز تعمیر پر بنا وہ محلہ بہت پیچھے رہ گیا تھا وہ گل میں کھڑی لڑکی کی ان حیران آنکھوں میں کیسے جھانک سکتا تھا۔ اس نے سیٹ کی بیک سے سر نکا کر آنکھیں زور سے میچ لیں۔

☆☆☆

نرگس کو اس وقت صرف جوتے کی فکر تھی اسے

اتنا چاہتا تھا کہ اگلی گاڑی میں بیٹھے حون کو اس نے رکشے کے پیچھے لگا دیا ہے، وہ بے خبر تھی کہ دوسری گاڑی میں بیٹھنے والا مرد اور لڑکی کس کے گھر سے نکلے تھے مگر بدرا کو جو بتا دیا تھا نہ رکشہ، اسے اتنا چاہتا تھا کہ وہ جس گاڑی میں بیٹھا تھا وہ اوپر نہیں تھی۔

وہ یقین سے کہہ سکتی تھی سلور گاڑی والوں کا اس سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ گھر میں آئی اور پہلا سوال ان چپکتے دیکھتے مہمانوں کے متعلق کیا اس کی تمام تر توجہ اپنے سوال کے گرد گھوم رہی تھی، اس نے آئی اور قاخر کے چہروں پر غور ہی نہیں کیا۔ بے جان پیلے چہرے جیسے کوئی بم بلاسٹنگ ایریا سے بال بال نکلنے کے آتا ہے، اس کا سوال ماں کی شور مچانی آواز میں کہیں گم ہو گیا جس کے دو ہزار ضائع ہو چکے تھے۔

اس وقت ایک دوسرا شور اس گھر کی کماؤ دستیوں کی برداشت سے باہر تھا، ان دونوں نے مل ملا کے نرگس کا نقصان پورا کر دیا۔ ماحول کے سیٹ ہوتے ہی بدرا کو وہ مہمان یاد آئے۔ ان کے گھر آنے والے پہلے ماڈرن مہمان تھے مرد نے شرٹ کے ساتھ ہلکی لٹکی ہوئی سیلیولیس اسٹاکس لباس میں تھی۔

قاخر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اس وقت جب شادی قریب تھی تو اماں سے اس نئی صورت حال پر بات کرنا گویا اس نایک کو پوری برادری کے سامنے پلیٹ میں رکھ کے پیش کرنے جیسا تھا اب اس معاملے کو شادی کے بعد ہی انجام پذیر ہونا تھا۔

دو تین گھنٹوں کے صبر کے بعد دونوں جب کمرے میں آئیں تو بدرا نے آتے ہی سوال دہرایا۔ "مرد پروڈیوسر تھا، لڑکی ڈاکٹر تھی دونوں ایک اداکار کی تلاش میں آئے تھے جو ان کی میریل ادھوری چھوڑ کے یہاں بھاگ آیا تھا۔"

صباح نے صرف جواب ہی نہیں دیا اس نے اسے اس ماڈل کی دو تین ویڈیوز بھی دکھائیں جو اس نے پچھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھیں۔

"لیکن یہ ہمارے گھر کیوں اور کیسے آیا۔" اس کی آواز میں صرف حیرانی نہیں تھی بہت کچھ تھا صبا نے اسے مختصر بتایا یوں کہ کچھ بتا دیا۔ کچھ چھپا لیا۔ راز داری کی تلقین کے ساتھ۔

"اس وقت جب شادی قریب ہے تو بھابھی کو اس معاملے کی ہلکی سی جھجک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔" اسے ہر بات سمجھانے کے بعد اس نے دیوار کی جانب کروٹ بدل لی۔

اس کروٹ بدلتی عورت نے آج پہلی بار چاہا تھا کہ کاش اس کا کوئی الگ کمرہ ہوتا وہ بھی ساؤنڈ پروف وہ اس میں پھوٹ پھوٹ کے رو سکتی۔

اس نے اچھا کیا جو کروٹ بدل لی اور بدرا کے چہرے پر غور نہیں کیا۔ بے جان، زرد چہرہ جیسے کسی بم بلاسٹنگ ایریا سے بال بال نکلنے ہو۔

☆☆☆

جب وہ اپنے شہر سے قریب تر تھا تو اٹھ سڑی کے ایک بے تکلف کولیگ نے جو بات کو ادھر سے ادھر پھیلا نا اپنا فرض سمجھتا تھا اسے مسج کیا۔

"ڈراما اعزازہ لگاؤ محسن کے سسرال میں تمہارا چھوڑا ہوا رول اب کون پلے کر رہا ہے؟" یہ وہاں مسج تھا جسے سن کر اس نے بے اختیار ہی ایک سرد آہ بھری وہ اسے رہنمائی نہیں کر سکا، حالانکہ وہ کہتا چاہتا تھا کہ۔

"میں اپنا چھوڑا ہوا رول پلے کر کے اب واپس آ رہا ہوں مگر خالی ہاتھ نہیں۔"

ایک پروے دار چائے کی پراسرار لذت کے ساتھ، ایک رسوائی شدہ پتی کی حواسوں پہ غالب مہک کے ساتھ۔

☆☆☆

سننے سے گھٹنے جوڑے اس نے ہی بازوؤں کے حصار میں گری پر خاموش بیٹھی وہ لڑکی اب بھی ہوئی تھی نہ اب حیرت میں تھی، اسے غصہ بھی نہیں تھا وہ اس بھی نہیں تھی۔ وہ ان گزرے لوگوں کے ایک ایک منہ کو ذہن میں دہرائی گئی اور ہر سکون ہوئی تھی۔ بالآخر یہ

سب کچھ غلط جیسی کی بنا پر ہوا تھا پھر بھی کھائے میں کون رہا، وہی جو خدمت گار کے منصب پر رہا، وہ رکس تھا تو اپنے گھر میں، اس وقت وہ صدے کی حالت میں تھی تو اس لیے کہ ایک خدمت گار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

وہ تو شکر ہے کہ اس نوجوان نے صرف خواب کی بات کی تھی۔ کسی زبان میں کوئی وعدہ کیا نہ ہی اردو یا انگریزی میں اظہار محبت کیا، اور وہ خود کون سا اس کی محبت میں گرفتار تھی۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی وہ موقع ملتے ہی حسین لڑکیوں کی تصویریں دیکھتا ہے ان کو بیچ بھی کرتا ہوگا ہنہ ہرجائی تھوں میں چھپی چپا کی آواز نے اسے چوٹکایا یہ جواب بھی تک جاگ رہی تھی، بدرا نے کئی بار دیکھا تھا وہ خانہ خراب اسے دانہ ڈالتا تھا، وہ اپنی رقیب چپا کو بتا رہی تھی۔

”میرے رشتے ماتے تو خالہ ذکیہ کے سیدھے سادھے بیٹے کے ساتھ تھے۔ عموں عالم کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ اگر چلا ہی گیا ہے تو ہم دونوں کو اس شادی والے گھر میں یوں بچے چہرے کے ساتھ بیٹھنا زیب نہیں دیتا، میں تو خیر اس وجہ سے پریشان ہوں، میں نے تسلیم کو بتایا تھا کہ وہ میرا فیا کی ہے۔“

تسلیم کو یاد کرتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ انف اس کا دل بیٹھا۔ ہائے وہ اماں کی دھولیاں وہ ہازوؤں کا حصار توڑتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

”میں اماں کے ساتھ جا رہی ہوں آج بالیاں بچ دینا جو گم میں پڑی ہیں۔“

اس نے بازار جانے سے پہلے اسے ٹیکٹ کیا تھا اس نے کینٹ کھول کر وہ گم اٹھایا تو رقم دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ایک چھتا ہوا سا بس بھر کے رقم اٹھائی۔ خدمت گار کو حکم سے سر تابی نہیں ہوئی۔ وہ جو بار بار اور ہر بات میں اس کی بات کرتا تھا اگر یاد رہا تو اس کام پر اس کا شکریہ ادا کر دوں گی۔

وہ اپنا کام ہو جانے پر اتنی خوش تھی کہ رات کے اس پہر اس کا ڈھولکی رکھنے کو دل چاہا۔ چھوٹی سی

بالیاں اور اتنی زیادہ رقم یعنی نفع ہی نفع۔ کمرے میں واپس آ کر رقم محفوظ کرنے کے بعد بستر پر لیٹنے اور نیند آنے سے پہلے اس کے ہر احساس پر متابع غالب تھا بس دل عجیب سا ہورہا تھا۔

منافع کے باوجود بھی کوئی نقصان تو ہوا تھا ایک چڑچڑاہٹ کہاں کہاں سے ٹوٹ گیا تھا وہ گنتے بگنتے تو گن نہیں پاتی۔

☆☆☆

آج عالم دلا میں واپس آ کر وہ تسلیم کر سکا تھا کہ اس پیش کل جیسے گھر میں ان کرداروں کا عکس ہونا ہو کے جھلک رہا تھا جو بھی اس کے لیے قد آور تھے۔ آج وہ ماں سے سامتا ہوتے ہی ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ ان کی گود میں سر چھپاتے ہوئے اور کچھ بھی نہیں کہہ پایا وہ ہر اس موقع کو سوچ کر آبدیدہ ہورہا تھا جہاں اس کی ماں کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ جب اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ نگار نے اسے فون پر بتایا تو صرف ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے مخصوص آرام دہ لہجے میں کہا تھا۔

”ڈونٹ وری ماں مردانکی شادیاں کرتے رہتے ہیں۔“

اس نے وہی جواب دیا جو عموں کی اس بات پر یا قوت نے دیا تھا وہ اس وقت کیوں نہیں سمجھا کہ ہائی مردوں کی اور باپ کی شادی میں فرق ہوتا ہے۔ اس وقت جو عورت ٹوٹی بھرتی اور تنہا ہو جاتی ہے وہ اپنی ماں ہوتی ہے۔

قدموں میں بیٹھے بیٹے کو اپنے حصار میں لے کر اس کے سر پہنا تا تھا نکاتے ہوئے وہ سمجھ رہی تھیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے وہ کس بات پر آب دیدہ ہے۔

”صرف آپ جانتی تھیں کہ اس گھر میں سب اچھا ہے جیسا کھیل کھیلا جا رہا تھا اور بس منظر میں سب کچھ خراب ہو چکا تھا۔ آپ کو مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔“

اس نے سرسختی اسوں سے معاملہ میں ایک
گھڑ کیا، اس گلے کے جواب میں اس نے مسکرانے کی
کوشش کی اس کی خاموشی ثابت کر رہی تھی کہ وہ اب
کسی کا بھرم توڑنا نہیں چاہتی۔
”تمہاری دادی بہت اچھی عورت تھیں مگر خود کو
کمل سمجھتی تھیں۔“
اس نے یاقوت کی تعریف اور بد برائی کا سفر
ایک ہی جملے میں طے کرنے کے بعد اس طویل بحث
کو ہمیشہ کے لیے سمٹ لیا تھا۔
وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا بھی اپنے دادا کی
طرح پس منظر میں جھانکتا جھانکتا سانگیو پیٹہ ہو
جائے۔

☆☆☆

دو تین دنوں کی مسلسل مصروفیت کے بعد دوپہر
کو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا وہ بین کمر لے کر سو گیا تو
پھر شام کو ہی آنکھ کھلی۔
جب وہ نیچے لاؤنج میں آیا تو ٹار پریشان
چہرے کے ساتھ جیسے اس کی ہی منظر تھیں۔ ”رہبر اور
زارا آئی تھیں۔ وہ بہت اب سیٹ تھیں۔“
”میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔“ اس نے دھیما
سا جواب دے کر ماں سے کچھ اچھا سا کھانے کی
فرمائش کی۔ ان کے پاس ساری خبریں تھیں۔
”پہلے جو اد اور پھر یحییٰ کے متعلق مجھے اتنا کچھ سنا
کے گئی ہیں، اگر میں تفصیل میں چلی گئی تو تمہاری
فرمائش رو جائے گی۔“ وہ پیکا سا مسکرا کے کہن کی
طرف چلی گئیں۔

جو اد کی حد تک تو ٹھیک تھا وہ ماں بیٹا اس کے
معاملات میں انوالوڈ تھے مگر یحییٰ کے لیے وہ جس
طرح اس کی ماں کا گریبان پکڑتی تھیں وہ ان پر واضح
کرنا چاہتا تھا کہ یحییٰ اپنے فیصلوں میں مرضی کی مالک
تھی۔

اس نے ریوٹ اٹھا کر ایل ای ڈی آن کی اور
ایک نیوز چینل کا انتخاب کیا۔ ٹی وی اسکرین پر چلتی
پنی پر اس کے اور تمام کے حوالے سے ایک خبر تھی۔ وہ

ان کی بدولت دیرپے سن سن کر مر گئے ہوں
فون لیے وہ میسج چیک کر رہا تھا ایک میسج پر وہ سیدھا
ہوا۔

وہ گزشتہ تین روز سے محسن کی کالز اور میسجز اکتور
کر رہا تھا۔ وہ اس سے ناراضی کا اظہار تھا۔ اس کے
منع کرنے کے باوجود وہ دونوں اچانک وہاں جا کر
جیسے اسے پہنچنے کے واسطے لائے تھے۔ وہ اس کے تازہ
ترین میسج پر الجھا وہ ایک انتہائی ضروری بات کے لیے
اس سے کہنے پر اصرار کر رہا تھا۔

”آپ کا کھانا تیار ہونے تک میں آ جاؤں گا
ماں!“ وہ کہن میں جھانک کے بولا۔ اب وہ پورج کی
طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ محسن کے آفس میں
تھا۔

”آپ اس وقت کیا لیں گے مسٹر محسن چائے یا
کافی؟“ دو انگلیوں سے آفس بھل بجاتے ہوئے اس
نے اپنے دوست کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہ رہا
ہو۔

”بھئی اس وقت منہ اٹھا کر کیوں چلے آئے ہو،
جب میں کام میں بیڑی ہوں۔“

عون نے سنجیدگی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے
اپنی جیب ٹٹولی۔

اس وقت محسن کی مہمان نوازی کا گراف نیچے
اور خوش مزاجی کا ادا پر تھا۔ وہ ایک نامور اداکارہ سے
ڈرامے کے کچھ سین ڈسکس کر رہا تھا جب اس نے
عون کو سگریٹ سلگاتے دیکھا تو وہ جھٹکا کھا کے چونکا
اس نے بات کرتے کرتے اب عون کو بغور دیکھا اس
کے دماغ نے سائن دیا اس کے چہرے پر ہلکی سی بڑھی
ہوئی داڑھی کے علاوہ بھی تبدیلی تھی جو اس کی آنکھوں
کی حد تک تھی اس نے اپنی توجہ کام پر مبذول رکھنے کی
کوشش کی۔

وہ دونوں ڈرامے کے کسی سین کو لے کر بس
رہے تھے جب عون نے دوسرا سگریٹ سلگایا محسن نے
ایک شدید قسم کا پہلو بدلتے ہوئے محسوس کیا کہ اب

اس کے لیے بات چیت کو مزید جاری رکھنا مشکل تھا تو باقی ڈسکشن آئندہ پر چھوڑتے ہوئے وہ الوداعی رسومات کے بعد جب اس کے سامنے آ کر بیٹھا تو بات کا آغاز ہی سگریٹ نوشی سے کیا۔
 ”آخراے ہوا کیا ہے؟“

”یار ہونا کیا ہے۔ جب میں نے سمجھا کہ میری فیملی میں اب ہر چیز اچھے سے سیٹ ہو جائے گی تو ہوا یہ ہے کہ ہر چیز اب سیٹ ہو کے رہ گئی ہے۔“
 وہ سگریٹ نوشی والی بات کو ٹالنے کے چکر میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ یہاں محسن کی بات سننے آیا تھا۔
 وہ ریسہ آئی کا ہنگامہ اور باقی فیملی کے آرگومینٹس سے رابطہ موجودہ حالات اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس سے مشورہ طلب کر رہا تھا کہ بتاؤ اب میں کیا کروں؟ محسن نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اسے کیا مشورہ دیتا۔ وہ اس کے لیے ایک بری خبر لے کے بیٹھا تھا۔ اس خبر کو سننے کے بعد اسے چند لمحوں کے لیے یقین نہیں آیا یا اس نے کتنا ہی نہیں چاہا۔ یہ سب کچھ ایک ماہ پہلے ہوا ہوتا تو وہ ایسے شاک کے عالم میں نہ جاتا۔

اس وقت جب عینی کی شادی طے ہو چکی تھی تو اس نے کورٹ میرج کر لی تھی، جانے کیوں اس لمحے اسے قافریا دیا جو اپنا مردی کرہ جانے کے لیے کچھ بیشنگز خرید لایا تھا جس کا کہنا تھا کہ انہیں دیکھتے دیکھتے وہ مسکرائے گا۔

اگر عینی کی شادی بھی اس کے ہیرٹس نے طے کر دی تھی تو وہ بھی ویسی ہی بیشنگز انورڈ کر سکتی تھی پھر فرق کہاں تھا۔

”سے لی یہ بنو کل سوشل میڈیا پر ماؤنس کر دی جائے۔“ محسن کی آواز دھیمی تھی۔ محسن نے بس ہنہ جیسے لفظ پر اکتفا کیا، وہ جانتا تھا کہ اگلے چند دنوں تک اس کی ماں سمیت سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ان چند دنوں کے دوران کا ہنگامہ پھر ریسی آئی کی اس کی ماں پر گولہ باری، یہ سب برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔
 ”میں بس اتنا جانتا ہوں یار! یہ رشتے، یہ

چیزیں یہ فیملنگ ان کی شینگ ہماری نظر کا دھوکا ہوتی ہے، ہر چیز اب سیٹ ہو کے بھی زندگی کو ایک جگہ پر نہیں ہے۔“

محسن نے کیسی گہری بات کی تھی، وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ رشتوں کو لے کر اتنا حساس نہیں تھا جیسی جس لبرل فیملی سے تھی وہاں محسن یا کسی دوسرے کزین کو لوگوں سے منہ چھپانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی بس ایک موازنہ تھا جو اسے لڑکھڑک کر رہا تھا۔

”یہ جو تم منہ بنائے پھرتے ہو کیا تمہیں واپس نہیں آنا تھا۔“ وہ ایک دم سے دوسرے موضوع پر آیا۔ ”وہ میرے لیے یہ خوش خبری کیسی بات ہے کہ محسن عالم اپنی شناخت کے حوالے سے بھی گلٹ میں بھی جلا ہو سکتا ہے جیسے رنگ۔“
 وہ کندھے جھپکا کے مسکرایا۔

”ایسا کچھ نہیں یار بس!“ وہ دل ہی دل میں جھنجھلایا۔

”تو بس پھر ان نوڈوں میں ان کا بھی مطلب نکل گیا، تمہارا بھی، بات ختم۔“ محسن نے کس قدر آرام سے بات ختم کر دی تھی۔ وہ اس کو دیکھ کے رہ گیا۔

بات ہی تو ختم نہیں ہو رہی تھی۔
 ”باقی ساری باتوں کو چھوڑو، مجھے وہ بات بتاؤ جس نے تمہارا حال خراب کر رکھا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کے بولا۔

اس کا دوست اس کی آنکھوں کا ایک ایک رنگ پہچانتا تھا جہاں اب ایک رنگ اضافی تھا۔ اس اضافی رنگ نے اس کی طبیعت کو بے قرار سا کر رکھا تھا اس نے نگاہ چرائی۔

”یہیشن گویا کہاں کہیں اور آؤ۔“ آریوشیور کہ تم ٹھیک ہو۔ وہ واقعی ماننے کو تیار نہیں تھا جواب میں کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ محسن پر گہری نگاہ ڈال کے بنسا پھر گہرائی میں اتر کے بولا۔

میں نے کہا خراب ہوں گردش چشم مست سے اس نے کہا رقص کر سارا جہاں تراب ہے

یہ شعر سنانے کے بعد اس نے ہاتھ ہلا کر محسن کو کسی اور جانب متوجہ کرنا چاہا مگر وہ ناکام رہا اسے شک تھا اگر وہ ایسے ہی اسے دیکھتا رہا تو وہ جان لے گا پھر اس کا مذاق اڑائے گا۔

”اوہ گاڈ!“ مومن شہود ایک پرانے جالی دار دروازے کی کھٹاک کا شہر رہتا تھا۔

☆☆☆

بے یقینی کی ایک عجیب کیفیت تھی، جیسا کہ اس نے اپنے ایریا کے اندر جاری تھی۔ جہاں وہ پہلے سے موجود تھا۔

”جو آدمی سے ملنا چاہتا ہے۔“ یہ غیر متوقع بات تھی۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر اور حیران ہو کے اسے دیکھا، اتنے بے شمار سالوں کے بعد قاخر اس کا نام اس قدر تازہ انداز میں لے رہا تھا۔ اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی مگر وہ لب ہلا سکتی تھی۔

”کڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ۔“ آستین کی کف میں اسٹنڈ لگاتے ہوئے وہ چونکا۔ شادی کے بعد آج وہ پہلی بار سسرال جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

”کئی سال پہلے تمہاری ایک بات میں نے مانی تھی فائدہ مند تو وہ بھی نہیں تھی۔“

اس نے اسے کیا بتایا تھا وہ کیا چاہتا تھا پارک کے اندر آنے کے بعد بھولوں کی بھیل بھاڑ سے ہٹ کر جسے وہ ڈھونڈ رہی تھی اسے ڈھونڈنا اب اس کی اپنی خواہش نہیں تھی۔

وہ اسے دوسری جانب تلاش کر رہی تھی وہ مخالف سمت سے ایک دم سامنے آ گیا اس نے رخ بدلا اور وہ ساکت ہو گئی اپنے بالوں میں جھپٹتی چاندی سمیت وہ زمین سے آسمان جتنا بدل چکی تھی، اندر کو ڈوبی آنکھیں لٹھے جیسا چہرہ پھر بھی وہ اسے پہچان کر ہی سامنے آیا تھا۔ وہ اسے کیسے پہچان گیا۔

اپنے ایریا کی سرخ و بنزدیوار کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے وہ پہچان کے مراحل سے گزر چکے تھے، اس کے سر میں بھی جا بجا سفید بال

تھے، وہ آج بھی پرانے خوش رو اور تپتی دکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں کا خاکی رنگ اب گہرا خاکی ہو چکا تھا۔ وہ آج بھی عام سی تھی۔

”میرا اتنا پتا جاننے کے باوجود اتنے سالوں تک تم خود کو مجھ سے اس طرح کیسے چھپا سکتی تھیں کیوں؟“ وہ جیسے مٹ مٹ کے بولا۔

وہ یہ سامنا اب بھی نہیں چاہتی تھی مگر وہ خاموش رہی۔

”تم مجھے ابھی طرح جانتی تھیں۔ میں تم سے بدگمان نہیں ہوا تھا۔ مجھے لوگوں کی باتوں کی پروا ابھی نہیں تھی۔ میں ریسر اور ماں کے دباؤ سے خوف زدہ ہو کر صرف وقتی طور کے لیے او بھل ہو گیا تھا۔“ اس نے خود کو مضبوط رکھنے کے لیے رخ بدلا، وہ پھر سے سامنے آ گیا۔

”جس شام تم لوگ غائب ہوئے تھے، میں اسی رات واپس آ گیا تھا۔ تم نے مجھے ایک ایسے پچھتاوے میں جلا کیا تو کیا مگر میرے باپ کا کیا قصور تھا جو تم لوگوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے نیم پاگل ہو گیا۔ سارا قصور ان لوگوں کا نہیں تھا۔ اس غلطی میں نیاز داد ابھی برابر کے شریک تھے انہوں نے سہیں اور خود کو صرف رسم و رواج کی خاطر روپوش کر لیا تھا وہ بھی طلاق کے خوف سے۔“

اسے قاخر کی بات یاد آئی قاخر کی ہر بات سنی جا سکتی تھی مگر ان خاکی آنکھوں کا مالک حساب دینے کے بجائے جواب مانگ رہا تھا، وہ حیرت کے گھیرے میں کھڑی تھی۔ وہ اس کی معافی ملانی کو آگ لگا کر عالم واد کو جلا آتی تو پھر بھی کم تھا۔

”میں یہاں قاخر کی مرضی پر آتی ہوں۔ مجھے تمہارا حال دل سننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تمہیں جو بھی کہنا ہے قاخر کو۔“ اس کا جملہ کاٹ لیا گیا۔

”میں تمہارے حصے کی باتیں کسی اور سے کیسے کر سکتا ہوں۔“ وہ اس بات پر مل نہیں سکی، قاخر کی ہی کہنا تھا قید تنہائی تو اس نے بھی کائی تھی وہ جتنا بھی پاس آ جاتا

”تم سے بچنے کے بعد میں تمہارا محبوب بن گیا تھا جنوری کی تمہیں سردیوں کو بچنے لان میں جا کر میں نے کھڑکی پر اڑتے ان پرندوں کو سالوں دیکھا پھر آدمی مر گزر جانے کے بعد یہ جان ہی لیا کہ تم نے جو پیٹ کیس وہ بلبلیں تھیں۔“

اس اعتراف نے اس کی ڈوبی آنکھوں کو نم کیا۔ ایک جلا ستارہ سا کر دیا اسے الہام تھا کہ جیسے قاخر کا فیصلہ جو اد عالم کے حق میں ہوگا۔

جب اس نے ہاتھ پکڑا تو وہ چھڑا نہیں سکی۔

☆☆☆

اس وقت جب شام گہری ہو چکی تھی ایک پوش سوسائٹی کے نئے غور بننے کے اندرونی اور بیرونی حصے میں ایک پر رونق اور مہذب قسم کی ہڑبونگ سی ہجی تھی۔ سرسراتے رنگی لباس، میک اپ کٹس سے اڑنی میک اپ آنکھوں کی مخصوص خوشبو مردوزن کی ملی جلی آوازیں ان سب کا ثمامہ اور مون کے پہلے پر سرکشیاں نہ گسپ، برمانڈا پر فوجی مہک ہر جگہ دم ہو رہی تھی۔

یہ عمارت کے اندرونی حصے کا منظر تھا وہاں کیمرے سیٹ تھے کیمروں کی آنکھ کا فوکس شیشے کی دیوار کے دوسری طرف کا منظر تھا، باہر سیٹ پر موجود ثمامہ ہلکی زرد روشنی کے ہالے میں تھی۔

مون اپنا پہلا شاٹ اوکے کروا چکا تھا، دوسرے کا منظر تھا۔ تیسرے شاٹ میں ان دونوں کی پرکار منس ایک ساتھ تھی۔

ٹھیک اسی وقت ایک دوسرے شہر میں بھی شام اتر چکی تھی، نیاز منزل میں کوئی سرسراہٹ بھی نہ خوشبو نہ خوشبو جیسی کوئی بات تو وہاں اتری شام کا فوکس وہی ایک لڑکی تھی جو اپنے سب پر سلاٹ چہرے کے ساتھ میچ ٹائپ کر رہی تھی اسے میچ مکمل کرنا تھا اس کے بعد سینڈ کرنا تھا مگر اس سے ایک غلطی ہوئی۔

دوسری طرف ٹھیک اسی جگہ جہاں ایک ویڈیو میوزک کی شوٹ جاری تھی۔ میک اپ مین کے

”میں نے ذکیہ کے بیٹے سے وفا کی امید رکھی ہے۔ وہ میک اپ مین کو معذرتی تاثر دے کر سر جھکا تا ہے۔“

”میں نے ذکیہ کے بیٹے سے وفا کی امید رکھی اور اس نے وفا بھائی ہے۔ وہ جو ایک.....“

اس کا شاٹ ریڈی تھا ماحول مکمل تھا میچ ادھورا تھا اگر وہ ایک ماہ سے اس کے میچ کا منظر تھا تو کیا یہ جاننے کے لیے کہ وہ اسے ایک چیٹر یا اداکار کہہ سکتی ہے یا پھر ذکیہ کا بیٹا۔

اس نے چہرہ اٹھایا اس کے لبوں کو چھوتی مکمل سی مسکراہٹ اسے نیاز منزل میں لے گئی۔ میچ پر لہراتا سفید ربن، مرغیوں کا ڈربہ، لاٹھری باسکٹ میں چھپائے گئے انڈے، اس کے حواس اڑالی چائے کا آخری کپ، جب وہ اس کا بریسلٹ چھو رہا تھا جب وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا، وہ سب خواب سا لگتا تھا، وہ سب خواب تو نہیں تھا، وہ اسی مکمل مسکراہٹ کے ساتھ سیٹ پر کیمروں کی زد میں آیا اب وہ ثمامہ کے قریب تھا کہ اس بارہ رنگی لباس مون کو بچ کر رہا تھا۔

”ہر بار تمہاری پلکوں کی میں کتنی بھولی سا جاتا ہوں۔“

جب انت تلک گن پاتا ہوں پھر صفر پہ واپس آتا ہوں۔

”اس بار مکمل ہونے دے اسے یا مکمل ہونے دے۔“ وہ ان گانوں پر صرف لب بلار رہا تھا۔

نگاہ اداکارہ کی پلکوں پر جمی تھی کہ وہ یک لخت چوٹا وہ ذکیہ کے بیٹے سے وفا کی امید کیسے رکھ سکتی تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کے ماحول میں تھی سیٹ نہیں ہو سکتے تھے۔

”قاخر کہتا تھا، محبت جب آپ سیٹ ہو جاتی ہے تو اس کا عروج دھندلا جاتا ہے۔“

اس نے ایک گہرا سانس لیا، یہ ایک الگ دنیا تھی ایک دوسرا ماحول تھا۔ یہاں مون شہود کے پاس فیم تھا، وہاں حیدر آباد کے محلے میں رہنے والی بدرا کے

وہ غلام بھی ہوتے ہیں جن کی ڈیوٹی صرف چراغ جلانا ہوتی ہے۔“

☆☆☆

”تمہاری ماں بے عقل ہے جو بات کو سمجھ نہیں رہی مگر تم تو سمجھ دار ہو۔ لڑکا اچھا ہے، باپ کی دکان سنبھال رہا ہے۔“

نانی کا لبس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آن کی آن میں فیصلہ سنا دیں، حالانکہ قاخر نے نانی اور ماں کو محوون کے متعلق تمام حقیقت حال سے اس وقت آگاہ کیا تھا جب رکیہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ شادی سے ایک دن پہلے اچانک آگئی تھی۔

اپنی آمد کے چند گھنٹوں بعد اس نے یہ بات خود ہی چھیڑی تھی۔ اس کا بیٹا پڑھا لکھا تھا، خوش شکل اور کماؤ تھا، وہ بچپن کے رشتے کو پھر سے جوڑنا چاہتی تھی۔

قاخر خاموش تھا زمرس رضامند نہیں تھیں۔ نانی دل و جان سے تیار نہیں تھیں۔

”شکر کر، تیری نند کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ یہ دور دیکھ پھر اپنی بیٹی کی طبیعت دیکھ، رکیہ کی طبیعت دیکھ، یہ تو گھر سے گھر تک جیسی بات ہے۔ یہ رشتے مٹاتے اپنے جیسے لوگوں میں ہی ملے کرنے چاہئیں۔“

ان دنوں ایک صاحبہ گی جو خاموشی سے بدرا کا چہرہ بھیجی تھی۔ وہ لڑکی جتنی کی مہک اور چوری شدہ خوشبو کو برقع پہنا کر جھکتی تھی کہ وہ محبت کو بھی برقع پہنا سکتی ہے، محبت وہ سفید پرندہ ہے جو بے احتیاری کے عالم میں بنزد درخت پر بیٹھ جاتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔

اس نے شوہر کے ساتھ روائی سے مل اسے بتایا کہ وہ شوہر کے ساتھ یہاں پاکستان میں رہنے کے بجائے یو کے کیوں جا رہی ہے، اس نے بدرا سے مکمل کے بات کرنے کے بجائے اپنے اور جواد کے حوالے سے طبقاتی فرق کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا تھا۔

صباح کے جانے کے بعد بدرا نے اس رشتے سے حلق ہاں کہہ دی تھی۔

☆☆☆

اس ایک شفاف ہنسی تھی۔ وہ لڑکی نایاب تھی، آج شام، کل کوئی اور اس کے بعد کوئی اور۔

وہ ایک سادہ کار تھا، شامہ کی زلفوں کو نرمی سے اس کی آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے اس نے حقیقت کو صباہ نیاز کے انتظار اور جواد عالم کے سفر تک دیکھا۔ ایک دم سے اس کی مسکراہٹ کٹی اسے اچانک یاد آیا وہ ذکیہ کا بیٹا نہیں تھا۔

”میں نے ذکیہ کے بیٹے سے وفا کی امید رکھی اور اس نے وفا نبھائی۔ کل شام ہمارا نکاح ہے، جو اک جیسی ہے جو بے نیاز ہے اس اداکار کو بتادینا کہ کل رات میں نے تمک سے بنی صراحی کو بارش میں رکھ دیا تھا۔ اس سے کہنا، مجھے بتائے صراحی کا قیدی آزادی کی خبر سن کر مسکرایا تھا یا ادا اس ہو گیا تھا۔“

اک خیال دل کے سلامت رہ جانے کا، اک خواہش محبت کے قائم رہ جانے کی، اپنے سبیل میں موجود سبج کو پورا پڑھنے کے بعد وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس سبج میں اسے کس چیز نے زیادہ ڈسٹرب کیا تھا، سارا کچھ تو اس کے کچھ پوچھنے اور محوون کے کچھ بتانے میں تھا اس نے ہر ایک حساب کتاب کو محفوظ کر لیا تھا۔ ہجر بھی تو کامل ہونا چاہیے۔ دلی سلامت رہے، محبت قائم رہے، آم کے درخت پر لہراتے سفید رنگ کی طرح۔

اس رات اپنے کمرے کی کبڑکی کھول کر سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے اس نے اپنی ایک ایک چاہت یاد کی، وہ ایسی ٹینگلو کے ساتھ کسی میں بھی انٹرمیڈ نہیں رہا تھا، اب تو اس کا یہ حال تھا کہ ایک دشمن وار روپے کی دل لگی نے اس کے اندر آگ سی لگائی ہوئی تھی۔

اپنی ٹینگلو کو جج کرتے کرتے وہ دھک سے رو گیا۔ یہ بھید تو ابھی کھلا تھا وہ اپنی ٹینگلو میں اس مقام پر تھا کہ وہ محوون عالم کو رکیہ کے بیٹے میں چھپا کر نیاز منزل میں اک مرکز ارسکتا تھا۔

”محبت ایک غلط کرن ہے اگر یہ راستہ محل کی طرف لے جائے تو کوئی بادشاہ نہیں بن جاتا۔ محل میں

اس نے مسیح کے آخر میں اس اسٹیشن کا نشس سے ایک سوال پوچھا تھا۔ اک امید دل کے سلامت رہ جانے کی، اک خوف قائم رہا۔ کیا وہ آزاد ہو کے مسکرایا ہوگا۔ جیسے سارا کچھ تو اس کے سوال اور ہرجائی کے جواب میں تھا سچ سین ہو چکا تھا وہ دن میں کئی بار دانیس ایپ کھولتی، پھر گھنٹوں بعد، پھر بات منٹوں پر آگئی تھی پھر سیکنڈز.....

وہ آن لائن ہوتا تھا اس نے جواب دیا سندو بارہ اس نے کچھ سوال کیا۔

بلا خر نکاح کا وقت آ گیا، قبولیت کے بعد اس نے پلکٹس جھپکیں۔ اتنے آنسو گرے وہ کہنے لگتی تھی تو کن نہیں پاتی تو آج اس نے یقین کر لیا کہ گلی میں کمرے کمرے وہ چہرہ اس نے آخری بار دیکھا تھا ایسے سامنے روید۔

وہ وقت بھی آ گیا بلا خر اس نے جان لیا، دنیا میں کچھ آخری بھی ہوتا ہے، آخری بار، آخری نظر، آخری قدم، آخر کار وہ ہنسا سیکھ ہی جائے گی آخر کار، آخر کار۔

☆☆☆

چودہ سال بعد۔

”اماں دیکھیں تو آپ کے فیورٹ اداکار کی نئی ویڈیو ریلیز ہوئی ہے۔“ مہنی بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔

یہ جنوری کی ایک سہ پہر تھی وہ چھت پر جندلے سے کمرے میں دور کا منظر کینوس پر اتار رہی تھی۔

”کیا بتاؤں اماں! ابھی اسے ریلیز ہوئے چند گھنٹے ہوئے ہیں اور اسے کئی ملین لوگ دیکھ چکے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے مہنی نے موبائل اس کے ہاتھ میں دیا اسکرین روشن ہوئی۔

”ارے آرام سے۔“ اس نے تیزی سے میز صفاں اترتی مہنی کو پلٹ کے لوکا پھر اسکرین پر نگاہ ڈالی اسکرین پر جو کمر اور جو چیزیں نظر آ رہی تھیں وہ

سب سیٹ کا حصہ تھیں۔ اس سیٹ میں جس گھر کی شہادت جھٹک رہی تھی۔ وہ وہ بدرا کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ گرین کرسی، گول ٹیبل، آگے مرفیوں کا ڈربہ۔ آگے لاٹری باسکٹ، آگے آگے۔

وہ ارد گرد چھائے دھندلے کمرے میں تحلیل ہوتی گئی۔

اب بیک گراؤڈ میوزک کے ساتھ لڑکی نمودار ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں سفید ربن ہوتا ہے۔ وہ بال لہرائی ہے، وہ کون سا ہیئر کٹ تھا کالوں پر کرتے شالوں کو چھوٹے، کندھوں پر جھولتے بال جن کی ہرلٹ دوسری سے جدا تھی۔

چھت پر کھڑی کسی بت میں ڈھلی، وہ عورت جانتی تھی کہ وہ ہرلٹ سرکش تھی اور وہ ہرلٹ کی بغاوت کو سمجھتا تھا۔ تب ہی تو، تب ہی تو۔

اب اسکرین پر وہ چہرہ روشن ہو رہا تھا جسے وہ روز اسی اسکرین پر گھنٹوں، پہروں، دیکھتی تھی جسے وہ یاد دیکھے چودہ برس گزر چکے تھے۔

سارے روز وہی تھے گل کے روید کرتے

یہ کس کی آواز تھی

ہم اور بیل بے تاب کنگو کرتے

وہ کس سے مخاطب تھا وہ جسے آنسو کہتے ہیں اس کی آنکھ سے وہ پانی بہا۔

ویسا ہی گریس فل، خورد، کپٹیوں میں جھلکتی چاندی کے ساتھ وہ ایک سفید سرمئی میدان میں کھڑا تھا ہر ایک جذبہ عیاں کرتی لالی سے بھری آنکھوں کے ساتھ کے کمرے کی آنکھ میں دیکھا ہوا۔

نہیں ذکیہ کے گھر کی چھت پر کھڑی بدرا کی آنکھوں میں دیکھا ہوا۔

نور اس کی آنکھ سے بہتا پانی اچانک سے جم گیا۔ وہ اس کے سوال کا جواب دے کر اداسی کا اعتراف کر لیتا تو وہ سوچ کے بیٹھی تھی وہ اسے بغاوت پر اکسائے گی۔

کیا وہ جانتا تھا کہ اس کی ہرلٹ سرکش تھی۔ کیا

وہ جانتا تھا کہ اس کے باغی لب و لہجے پر ہر ذی شعور کو پتا مانگنی چاہیے تھی۔

پہری طرح سے ہیں مہر و ماہ بھی آوارہ کسی حبیب کی ہیں، یہ بھی آرزو کرتے اس کی خاموشی نے آرزو بچالی تھی اس کی خاموشی نے بدرا کو بچا لیا تھا۔

برسین میں وہ اس کی ماڈل کے لباس کے ساتھ حیران ہوئی جیسے وہ اس کے ملیو سات چرائے گیا تھا۔ اس کا ہمہ سلسلہ اس کے لاکٹ، اس کے کان کی بالیاں ہاں وہی بالیاں ہستی ہوئی، بلبل اڑاتی ہوئی سارے سخن کو اپنی فراق کے گھیر گھیرتی ہوئی ننگے پاؤں گھومتی اس ماڈل کے ساتھ۔

وہ ایک دم سے ہنس دی تھی پھر سانس بھی بجالا ہوئی پھر آنکھ میں جما پانی بھی بہہ گیا۔ وہ جو گل قاصدی کے میدان سے بھاگ گیا تھا، وہ اس کی ایک ایک چیز ایک ایک ادا سنبھال کے رکھے ہوئے تھا، وہ اسی کا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ خواب نہیں تھا وہ بات کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ ہر حال میں بات کرے گی۔ اس کا یقین سچ ثابت ہوا۔

”کیسی ہو تم؟ اور تمہاری اس گڑیا کا کیا حال ہے۔“ سلہویوں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ میں کھڑے اس مرد نے لندن کی آسمان کو چھوتی عمارتوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ وہ جو زندگی بھر بے تحاشا بولتی رہی تھی، یہ نین لفظ ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے جھکے جڑوں کو دہرایا۔ اس نے جھوٹ جو بولا تھا۔ وہاں خاموشی چھا گئی، ایسی خاموشی جس کو ان دونوں نے جی جان سے سنا۔

”پوچھو گی نہیں کہ میں نے تمہارے مسیج کا جواب کیوں نہیں دیا تھا؟“ اس لہجے کے ٹھہراؤ میں بے قراری بھی تھی جیسے وہ وضاحت دینا چاہتا تھا۔ ”اب نہیں پوچھوں گی۔“ وہ سہولت کے ساتھ

بولی مگر اترا کے، اٹھلا کے نہیں ایک عجیب سی شرمندگی کے ساتھ، وہ لڑکی عجیب تھی سر پھری، راہ میں ست رنگے پر عموں کو بلاتی تھی پھر اڑا دیتی تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

”تم نے جھوٹ بولا تھا تم نے تمک سے بنی صراحتی کو بارش میں نہیں رکھا تھا۔“

وہ کھڑکی پر ہاتھ رکھ کے گویا ہوا۔ ایسا کہ کھڑکی سے باہر لندن کی سردی فٹا ہوئی۔

”ہاں میں نے جھوٹ بولا تھا۔“ وہ ہنسی، کی ہنسی کی آواز دور تک گئی۔

ایسی ہنسی صبا سے چھن گئی تھی۔ ایسی ہنسی اب، یعنی کے پاس بھی نہیں تھی۔ اس لی وی اشار کی محبت اب یعنی کے وجود میں دم توڑتی جا رہی تھی۔ ایسی ہنسی رئیسہ جلال عالم اپنے لاکھوں کمانے والے باپ کے گھر میں چھوڑ گئی تھی۔

وہاں دور لندن میں بیٹھے اس شخص نے اس ہنسی کو ایک بار پھر اپنے اندر محفوظ کیا۔

اس نے اس ہنسی کو بچانے کی کوشش کی تھی اور وہ کامیاب ٹھہرا تھا۔

”تم بہت بڑے اشار بن گئے ہو مگر ایک وقت میں تم میرے ساتھ زمین پر بیٹھتے تھے۔ تم تب بھی اشار تھے مجھے دیر سے پتا چلا۔“ ان کے رابطے میں ایک بار پھر خاموشی حائل ہوئی گہری خاموشی۔

”تمہارے ساتھ زمین پر بیٹھے بیٹھے میں نے آسمان چھو لیا تھا۔ مجھے بھی دیر سے پتا چلا۔“

ایسا جواب، ایسا کامل جواب، خاموشی کا وجود بکھرا یہاں وہاں دور دور تک، پرخندوں کے ڈربے میں اپیل سی ہوئی، پنجرے میں اونگھتی بلبلوں کی نیند ٹوٹی۔

یہ کیسا اعتراف تھا، کال کٹ گئی شاید نیٹ ورک پر ابلم تھا۔

اسے دولت، طاقت اور شہرت نے چھوا تک نہیں تھا پھر بھی وہ ایک عروج کی زد میں آ گئی تھی۔

☆☆

حورِ حیاتِ حسین و حسنین

”آپا! لڑکی کم از کم بارہ جماعت پاس تو ہونی چاہیے۔ کسی ان پڑھ کے شے نہ مار دیتا مجھے۔ ایویں عذابی عذاب بن جائے گی۔ اپنے یار بیلوں کی ان پڑھ، انکوٹھا چھاپ بیویوں کا حال میں دیکھ چکا ہوں۔ گھر جہنم بنائے ہوئے ہیں انہوں نے۔ میں نے تو یہ کر لی ہے کسی ان پڑھ لڑکی سے شادی کرنے سے، کوئی کبھی ہوئی پڑھی لکھی لڑکی کی تلاش کرو۔ جو میری خون پسینے کی کمالی کو اللوں تللوں میں بہانے کے بجائے سلیقے طریقے سے استعمال کرے اور میرے گھر کو جنت کی طرح مہکا دے۔“

فراز نے اپنے تیل میں ڈوبے بالوں کی ٹیڑھی مانگ نکالتے، تقریریں جھاڑ دی گئی سچہ کچے کرے کی مثالی دیوار پر ننگے شے کے سامنے کھڑا کھی کر رہا تھا۔ آپا نے اسے گھور کے دیکھا تھا۔ ”اور تم خود کتنا پڑھے ہو۔“

”مجھے سب کچھ آتا ہے۔“ فراز نے لکھا چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ بے نیازی سے۔ آپا جھٹ سے اپنے چھوٹے بیٹے کے بیک سے کاپی منسل نکال لائیں۔

”مجھے اپنے بھائی جان کا نام لکھ کر دکھاؤ۔“ فراز نے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد ٹیڑھا میڑھا سا عبدالقدوس لکھ دیا۔ آپا نے آنکھیں سکڑ کر پڑھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک لکھا ہے، اب میرے چھوٹے کا نام لکھ کر دکھاؤ۔“

فراز نے پھر ذرا سی سوچ بچار کے بعد محمود الحسن

لکھ دیا۔ ”ہوں! چلو لکھ پڑھ تو لیتے ہو مگر میں چار جماعت پاس کے لیے بارہ جماعتیں پاس لڑکی کی ڈیماڈ کس منہ سے کروں۔“

فراز نے منہ بتایا تھا۔ ”آپا! اسی منہ سے جو آپ کا ہے، اور یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں ہوگی۔ ہزاروں مثالیں موجود ہیں کم پڑھے لکھے لڑکوں کی زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے ساتھ شادی کی۔ ویسے بھی آج کل تو لڑکیوں کے رشتوں کا ویسے ہی کال پڑا ہوا ہے۔ والدین، شریف لڑکوں کی آس میں بیٹھے بیٹھے سوکھ رہے ہیں۔“

”ہوں، کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ سخی لڑکیاں ہیں تمہارے بھائی جان کے دور، نزدیک کے رشتہ داروں میں، ایک سے ایک حسین اور پڑھی لکھی۔ مگر مجھے ہی جھجک محسوس ہو رہی تھی رشتے کی بات کرتے، اور یہ جھجک آج تم نے دور کر دی۔ دور کی کوڑی لائے ہو فراز میں تو تمہیں سیدھا سادہ سا جھجکتی تھی۔“ آپا کہہ کر خود ہی ہنسنے لگیں۔ فراز مغرور سا ہو گیا۔

”واہ آپا! آج کا تیز طرار زمانہ ہے بھلا سیدھے سادے لوگوں کا دنیا میں گزارہ ہے ہی نہیں ہے۔ کوئی خال خال ہی سیدھا بندہ نظر آئے گا آپ کو آج کے زمانے میں۔“

”اچھا اب زیادہ باتیں مت بکھاؤ۔ اور مجھے سبزی لا دو، اپنے بھائی جان کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ ذرا دیر ہو جائے مات کے کھانے میں تو طوفان مچا

آپادانت کچکا کے رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

آپا پورے طعراق سے صوفے پر براجمان
تھیں۔ سہانے ہی تعمیری سطر صوفے پر لڑکی کی ماں اور
خود لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کم عمری تھی۔ خوب صورت بھی
تھی۔ شرمیلی سی بیٹھی تھی۔ آپا کو وہ پہلی نظر میں ہی
اچھی لگی تھی۔

”خالہ! آپ کی بیٹی نے کتنی جماعتیں پڑھی

دیتے ہیں۔“

آپا نے قدرے اکٹا ہٹ سے کہا تو فرار آپا
کے ہاتھ سے پیسے لے کر جوتے گھسیٹا سبزی لینے چل
دیا۔ ساتھ ہی بڑا ہٹ بھی جاری تھی۔

”بھالی جان خود کسی طوقان سے کون سا کم
ہیں۔ چنانچہ ابا مرحوم کو عبد القدوس صاحب میں کون
سے سرخاب کے پر نظر آ گئے تھے جو آپ کو ان کے
پے ہاندہ دیا۔“



ہیں؟“ آپا کو فراز کی ڈیمائڈ یاد آئی تو اچانک پوچھا تھا۔
لڑکی کی ماں آپا کے انداز پر چونک سی گئیں۔
پھر سنبھل کر بولیں۔

”پوری بارہ جماعتیں پاس ہے میری فردا، کہو تو
سند دکھا دوں؟“

”آں..... ہاں دکھائی دو خالہ!“ آپا نے کچھ
سوچ کر کہا تھا۔ لڑکی کدیاں پھرتی سے اٹھیں اور
جھپاک سے اندر غائب ہو گئیں۔

”بیٹا! سلائی کڑھائی کرسکتی ہو؟“ آپا نے نری
سے پوچھا تھا۔

”کڑھائی تو نہیں، سلائی کر لیتی ہوں، ابھی دو
ماہ پہلے ہی سلائی سینٹر سے سیکھی ہے۔“

فردا نے ہموار لمبے میں بتایا تھا۔ آپا سر ہلا کر
لاؤنج کا جائزہ لینے لگیں۔ سلیتے، قرینے سے کی گئی
سادہ سی سجاوٹ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ایک بات
آپا نے بطور خاص نوٹ کی تھی کہ فردا کے چھوٹے سے
گھر میں صفائی کمال کی تھی۔ ایسی صفائی جو نہ دیکھی نہ
سنی، ایسے چھوٹے سے گھر میں۔

”یہ لو فردا کی سند۔“ فردا کی امی نے مسکراتے
ہوئے آپا کے سامنے پیش سند کی تھی۔

آپا کو آتا جاتا تو کچھ بھی نہیں تھا بس ایسے ہی
آنکھیں سکوڑ کر دیکھتی ہیں پھر مطمئن ہو گئیں۔

”خیر سے میرا بھائی فراز بھی پوری دس
جماعتیں پاس ہے خالہ!“

آپا نے سفید جھوٹ بولا تھا اور ذرا بھی نہ
ہٹلائیں۔

”میش کرے گی فردا! نہ کوئی سند نہ دیور۔ میرا
ایک اکلوتا بھائی ہے فراز۔ اور میں تو بارہ سال پہلے ہی
اپنے گھریار کی ہو چکی ہوں۔ دو چار دلوں کے بعد
مہمانوں کی طرح جالی ہوں مے کے میں۔ حالانکہ قرچی
گاؤں میں ہی ہوں۔ اور کوئی بہن ہے نہیں میری۔
فردا کو ہی بہن سمجھوں گی۔ ابا کو تو مرے بھی سات
سال ہو گئے ہیں۔ پیچھے میری اماں رہ جاتی ہیں جو
شوگر کی مرینہ ہیں۔ سارا گھر فردا کے حوالے ہی ہوگا،

سفید کرے، سیاہ کرے اس کی مرضی۔“
فردا کی امی کے چہرے پر خوشیاں جگمگا اٹھی
تھیں۔ یعنی اس کی بیٹی کو قبولیت کی سند مل گئی تھی۔
ورنہ تو لوگ ان کا چھوٹا سا گھر اور تنگ گلیاں اور فردا کی
کم تعلیم جان کر ہی انکار کر دیتے تھے۔ فردا سر
جھکائے بیٹھی تھی۔

آپا نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔
ایسی لڑکیاں خال خال ہی دیکھی تھیں آپا نے

زیادہ تو پٹر پٹر بولتی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
ہات کر لی اور ٹھنڈے مار کر ہستی لڑکیوں سے واسطہ پڑا
تھا ان کا۔ جو فراز کی کم تعلیم اور نوکری کا سن کر ہی
جھٹ سے انکار کر دیتی تھیں۔

فراز ابا کا کریانا شور سنبھال رہا تھا۔

آپا فردا کے ہاتھ پر دو ہزار رکھ کر۔ دھوم دھام
سے منگنی کی خوش خبری سن کر وہاں کا قصد کر رہی تھیں
جب چھوٹے سے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک فردا کی ہم
شکل لڑکی کالج یونیفارم میں ملبوس گھر میں داخل ہوئی۔
اگر فردا، آپا کے سامنے نہ کھڑی ہوتی تو آپا بھی یقین نہ
کرتیں کہ آنے والی لڑکی فردا نہیں ہے۔ وہ شائستگی سے
سلام کر کے امداد گھر سے میں چلی گئی تھی۔

آپا کا حیران چہرہ دیکھ کر فردا کی امی ہنس پڑی
تھیں۔

”یہ میری بیٹی ہے فریا۔ فردا اور فریا بڑوں پیدا
ہوئی تھیں۔ بس ذرا سا فرق ہے جان میں۔ فریا کے گال پہ
گل ہے اور بال فردا کے بالوں سے چھوٹے اور ہلکے
ہیں۔ ان دو نشانوں سے ہی ہم ان دونوں کو پہچانتے
ہیں۔ باہر کے لوگ تو فرق ہی نہیں کر پاتے ان میں۔“

”اچھا، اچھا۔ میں تو ڈر رہی تھی۔ کہ فردا تو
میرے سامنے کھڑی ہے یہ باہر سے نہیں اس کا
بھوت تو نہیں آ گیا۔“

آپا بھی ہنس پڑی تھیں۔

☆☆☆

”آپا! امیرا ڈھونڈا ہے آپ نے تو امیرا بس
ایک غلطی کر دی، سند دیکھنے کی۔ اب اگر ان لوگوں

پانکوں کی جھنکار گونجتی، دیکھتے ہی دیکھتے وہ الجھا بکھرا
سامن و گھر فروا نے اپنے سلیقے طریقے سے ایسا
ستوارا تھا کہ دیکھنے والے انگلیاں دانتوں میں داب
لیتے تھے، کتنی عورتوں نے تو باتوں، باتوں میں اس کی
کسی چھوٹی بہن کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔
فروا مسکرا دیتی۔

”چھوٹی بہن تو کوئی نہیں ہے۔ ہم دو ہی بہنیں
ہیں، وہ بھی جڑواں، میری دوسری بہن فریا کو پڑھنے کا
جنون کی حد تک شوق ہے۔ وہ تو ابھی بہت سارا
پڑھے گی۔ اگلے پانچ سالوں تک تو وہ اپنی شادی کا
نام بھی نہیں لینے دے گی کسی کو۔ حالانکہ امی، ابو کو
بہت فکر رہتی ہے۔ اگر وہ بیان جاتی تو ہم دونوں بہنوں
کی انکشی ہی شادی ہوتی تھی مگر وہ مان کے نہیں دی۔“
عورتیں مایوسی سے انھ کے چل دیتیں۔

☆☆☆

فروا چھوٹے سے یاد رچی خانے میں کھڑی
سلیڈر پہ چائے پتار ہی تھی۔ آبا آئی ہوئی تھیں۔
بہت پیار سے رہتی تھیں آبا اس کے ساتھ۔ وہ بھی آؤ
بھگت میں کوئی کسر اٹھانہ رہتی۔

فراز اور آبا باہر محن میں بیٹھے تھے اور امی
چھوٹے سے برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔
”آبا! میں تو اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتا ہوں، کتنی
سکھڑ اور پڑھی لکھی بیوی دی ہے مجھے۔ میرا گھر جنت
کی بنا دیا ہے فروا نے۔ جب سلجھے ہوئے لہجے میں اتنی
تمیز سے بات کرتی ہے میرے یار بیلوں سے تو وہ تو
حسد کرنے لگتے ہیں مجھ سے۔ بار، بار کہتے ہیں۔
بہت اونچا ہاتھ مارا ہے فراز اتنی باری تو مالو لاٹری ہی
نکل آئی ہے۔ ہماری بیویاں تو بالکل ان پڑھ، پھوہڑ
اور جہالت کا نمونہ ہیں۔“

فراز کی سرگوشی نما آواز جو فروا تک آسانی سے
پہنچ رہی تھی۔ غر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فروا مسکرا دی۔
”دیکھ لو پھر، تم چار جماعت پاس کے لیے کیا
ہیرا ڈھونڈا ہے۔ احساس مالو میرا۔“ آبا کی سرگوشی
نے فروا کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

نے بھی میری سند طلب کر لی تو بتائیں میں سند کہاں
سے لاؤں گا۔ اب تو کسی اور کی سند دکھانے کے بھی
زمانے گزر گئے آبا! باقاعدہ تصویر لگی ہوئی ہے سند
پر۔ اور پھر نام پڑھ لیتے ہیں لوگ جھٹ سے۔ جب
فروا کی امی نے آپ کو خود ہی سند دکھانے کا کہا تھا تو
یقین کر لیتیں کہ پڑھی ہے تب ہی تو سند موجود ہے۔“
فراز جہاں خوش تھا وہاں سخت جھنجھلا یا ہوا بھی تھا۔
”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ لیکن اب تو غلطی
ہو گئی مجھ سے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔“ آبا کا لہجہ بے فکر
تھا۔

”اسی لیے کہا تھا میں نے کہ امی کو بھی ساتھ
لے کر جانا تاکہ جہاں آپ غلطی کریں امی وہاں آپ
کی غلطی سدھا دیں۔“
فراز کی جھنجھلاہٹ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔
آبا کو بھی اس کی تکرار پر غصہ آ گیا۔

”ایک تم خود کو ہی عقل کا پکٹ مت سمجھا
کرو۔ تھوڑی بہت عقل میرے دماغ میں بھی موجود
ہے۔ پہلی بات تو امی خود ہی نہیں کہیں۔ شوگر، یادہ
مسئلہ کر رہی تھی۔ بار، بار پیشاب آتا ہے۔

اور دوسری بات، امی کو سچ بولنے کی بیماری ہے،
جہاں میں تمہیں اونچا دکھائی، امی بغیر سوچے کچھ
میری بات کاٹ کر تمہیں نیچا دکھا دیتیں۔ فوراً سے
پہلے بتا دیتیں کہ تم چار جماعتیں پاس ہو۔ اور بیسویں
رہتے تمہیں ٹھکرا چکے ہیں۔“
فراز سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ بات کچھ ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

فراز، فروا کے والدین کو پسند آ گیا تھا اور
انہوں نے کسی سند کے بارے میں چھوٹے منہ بھی نہ
پوچھا۔ پھر چٹ مٹنی پٹ پٹا والا معاملہ ہوا اور فروا
اس چھوٹے سے سونے آنگن میں رونقیں بکھیرنے
آ گئی۔

فروا کے آنے کی دیر تھی۔ اس آنگن کا سونا پن
اور اداسیاں یوں اڑے تھے جیسے یہاں بھی ان کا بھیرا
ہوا ہی نہ ہو۔ ہر طرف فروا کی چوڑیوں کی چھٹک،

”فراز چار جماعت پاس ہے! آپا نے تو میٹرک بتایا تھا۔ میں کتنا خوش ہوئی تھی۔ کہ چلو زیادہ پڑھا نہیں ہے تو کیا ہوا، ان پڑھ تو نہیں ہے، درمیان میں ہی ہے۔“

وہ خود سے ہم کلام رو دینے کو تھی۔ تب ہی باہر صحن میں فراز کی سرگوشی ابھری تھی۔

”آپا! یہ طعنے بند کریں اور مجھے مشورہ دیں۔

اسٹور کا کام مندا چار ہا ہے، بہت پریشان ہوں میں، گا بکی تو مانو ختم ہی ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کسی کی نظر کا اثر ہے یا کچھ اور..... خیر!..... میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ فروا کو ساتھ والے گاؤں کے گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر بھرتی کروادیں۔ کلاس تو چھوٹی موٹی ہی ملے گی پڑھانے کو، مگر تنخواہ اچھی خاصی آجایا کرے گی۔ جب ہم دونوں کمائیں گے تو سارے کام ہی سنور جائیں گے۔“

فروا کا دماغ دوسری دفعہ بھک سے اڑا تھا۔ وہ چائے پکوں میں ڈالنا بھول گئی تھی۔ باہر آپا کی گھر کی ابھری تھی۔

”پاگل ہوئے ہو فراز! سال ہوا ہے ابھی تمہاری شادی کو اور تم نے اپنی پڑھی لکھی بیوی سے کہا کی کروانے کا بھی سوچ لیا، کیا سوچے گی فروا، کتنے لاپٹی لوگ ہیں۔ زندگی بڑی ہے۔ کچھ وقت گزرنے دو، پھر زیادہ ہی ضرورت محسوس ہوئی تو کوئی ایسا قدم اٹھا لیتا، ورنہ نہیں اور تمہیں یہ نادر مشورہ دیا کس نے ہے، تمہارے دماغ کا کاسٹو جیس لگ رہا مجھے؟“

فروا سانس روکے سن رہی تھی۔

”آپا! ایک دوست نے کہا ہے۔ میرے اسٹور کے حالات دیکھ کر۔“ فراز کی کھسپائی سی آواز ابھری تھی پھر صحن میں خاموشی چھا گئی۔ غالباً آپا اسے خاموش کھور پوں سے نوازی رہی تھیں۔

فروا گہرا سانس لے کر چائے پکوں میں ڈالنے لگی۔

☆☆☆

”سنو! اپنی میٹرک اور ایف اے کی سندیں تو دو مجھے۔“ کئی دن بعد ایک شام فراز نے اسٹور سے آتے ہی فروا سے کہا تھا۔

فروا پہلے تو ساکت ہو گئی پھر گھبرا کر فراز کو دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟ کیا یہاں نہیں ہیں، میکے میں ہیں؟“ فراز نے حیران ہو کر اس کی واضح گھبراہٹ کو دیکھا تھا۔

”جی۔“ فروا نے اسی گھبراہٹ سے بغیر سوچے سمجھے کہا تھا۔ فراز ہنس دیا۔

”تو بھئی! اس میں اتنا گھبرانے والی کون سی بات ہے۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ توڑی ہی ہے۔“

فروا اٹھکیوں کو مروڑتی خاموش کھڑی رہی۔

”کیا ہوا؟ پریشان کیوں ہو؟ تمہاری ڈگریوں کو بیچنے نہیں لگا یا؟ بس ایک دوست بار، بار کہہ رہا ہے کہ ایک بار کوشش کر کے دیکھوں۔ شاید تمہیں ٹیچر کی نوکری مل جائے قریبی گاؤں کے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“ فراز

کہہ کر خود ہی ہنسا تھا۔ وہ بھی زبردستی سکرادی۔

اگلی صبح، فراز اسے بتائے بغیر ہی اس کے گھر پہنچ گیا تھا اس کی سندوں کو لینے کے لیے پہلا سامنا

فریاد سے ہوا تھا۔

ساسو صاحبہ پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ اور

اکھوتا، دس سالہ سالہ فریاد کے پاس بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

اتوار کا دن تھا اس لیے فریاد گھر ہی گئی۔

”میں فروا کی سندیں لینے آیا ہوں۔“ سلام دعا

اور حال احوال کے بعد فراز نے کہا تھا۔

فریاد نے الجھ کر اسے دیکھا تھا۔

”فروا کی سندیں؟ فروا کی کون سی سندیں ہیں؟“

”وہ وہاں نہیں لے گئی۔ ادھر گھر میں ہی ہیں۔

میں اسے بتا کر آنا بھول گیا۔ کیا اس نے رکھی ہوئی ہیں؟“

فریاد ہنس دی۔

”بھائی! آپ سے کس نے کہہ دیا کہ فروا کی

ڈگریاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ کوڑھ مغز تو پانچویں کلاس

سے آگے اسکول ہی نہیں گئی۔ ٹیچرز نے کہہ دیا تھا کہ

یہ نہیں پڑھ سکتی، اس کا دماغ کورا ہے پڑھائی کے

معالے میں، وقت ضائع کر دانے والی بات سے اسکول میں۔ اسے گھر کا سلیقہ طریقہ سکھاؤ، تاکہ کوئی خرابی تو ہو اس میں۔

فراز بے چینی سے گھور رہا تھا فریا کو۔
”تم مذاق تو نہیں کر رہی؟“

فراز دور سے ہنس پڑی۔
”لو! میں کیوں کرنے لگی مذاق، آپ ای سے پوچھ لیں۔“ مگن کے دروازے سے اندر داخل ہوتی ای کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

ای نے پہلے تو چٹا چٹ کئی بو سے لے ڈالے فراز کے، پھر فریا کو ڈھٹا تھا۔
”بھائی کو بٹھایا تک نہیں۔ چائے، پانی تو پھر دور کی بات ہے۔“ فریا شرمندہ ہوئی۔

”اوہ! سوری بھائی! آپ نے بھی آنے کے ساتھ مجھے باتوں میں الجھا دیا بلکہ ادیدہ سندوں میں، اور میں بھی بھول گئی ادب آداب! آپ پلیز بیٹھیں۔ میں چائے بنا کر لالی ہوں۔“

فراز دانت پر دانت جما کر کھڑا رہا تھا۔
”کیا ہوا بیٹا! بیٹھو ماں۔“ اصل معالے سے بے خبر ساس، داماد پہ ٹار ہوئی جا رہی تھیں۔
”آپ نے ہم سے غلط بیانی کیوں کی کہ فردا بارہ جمعہ عیس پاس ہے۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساس کو جھوڑ کر رکھ دے۔

”جس؟“ ساس حیران! ”یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟“

”فردا ان پڑھ ہے آپ نے بتایا کیوں نہیں؟“ وہ دلی آواز میں چلا یا تھا۔

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ فردا ان پڑھ ہے۔ میں ابھی سمجھیں فردا کی سند دکھائی ہوں بارہویں جماعت کی۔“ ساس اچانک پر جوش ہوئی تھیں۔ اور فراز ہکا بکا سا بھی فریا کو دکھ رہا تھا اور بھی ساس کو۔
فریا حیرت سے ماں کی طرف پلٹی تھی۔

”ای! فردا کی کون سی سند ہے؟ یاد نہیں کہ فردا نے پانچویں کلاس میں ہی اسکول چھوڑ دیا تھا کوڑھ مغز

جو ہوئی۔“
”تم چپ ہوتی ہو یا میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں۔“

ای جان فریا پہ دھاڑی تھیں اور فریا حیران بھی اور پریشان بھی۔ ”یا الہی یہ ماجرا کیا ہے۔ جس کے بارے میں مجھے بتایا ہی نہیں گیا؟“

”میں سمجھ گیا ہوں ساری بات! آپ نے میری آپا کو فریا کا رزلٹ کارڈ دکھایا تھا۔ اور میری بدحو آپا آپ کے ہاتھوں آسانی سے بے وقوف بن گئیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کر پائیں۔“

اس نے ہاتھ نہجا کر کہا تو فریا تو ہکا بکا ہی رہ گئی تھی۔ اسے اس معاملے سے بے خبر رکھا گیا تھا کیونکہ اسے بھی فراز کی ای کی طرح سچ بولنے کی بیماری تھی۔ اور ای! ان کی تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب بولیں تو کیا بولیں۔ وہ غصے سے فریا کو گھور رہی تھیں جس نے سارا کچا چٹا فراز کے سامنے کھول کے رکھ دیا تھا۔

”مجھے اندازہ تک نہیں تھا کہ میرے ساتھ اتنی دھوکے بازی کی آپ لوگوں نے۔“ فراز شکستہ سا کھڑا جیسے رو دینے کو تھا۔ تب ہی اس کے دماغ نے کام شروع کیا تھا۔ وہ کمراری آواز میں بولی تھیں۔

”ارے بھئی، مجھے تو بھول ہی گیا تھا۔ دھوکے بازی میں تم لوگ بھی جیسے نہیں رہے۔ تمہارے بارے میں تو تمہاری آپا یوں گفتگو فرما رہی تھیں جیسے تم پڑھ لکھ کر مشرک گئے ہو۔ اور نکلے کیا؟ پوری چار جماعت پاس! خبردار! جو آج کے بعد میری اتنی سلیقہ شعار بیٹی کو ان پڑھ سمجھ کر کتر سمجھا تو۔ ہر طرح کی عقل تیز ہے میری بیٹی میں۔ تمہارے گندے سندے گھر کو چمکا کے رکھا ہوا ہے۔ اتنا اچھا سلوک کرتی ہے تم ماں بیٹے کے ساتھ۔ میری تربیت یہ عمل کر کے میری بیٹی نے ثابت کر دیا ہے کہ علم اور اچھائی ذکر یوں کے محتاج نہیں ہوتے، اور تم سے تو سو درجہ بہتر ہے میری بیٹی ہر معاملے میں۔ سمجھا کیا ہوا ہے تم لڑکوں نے خود کو آخر؟ کہ خود چاہے بندر نہجانے کا کام کرتے ہوں اور لڑکی

پڑھی لکھی چاہیے۔ واہ! بھی واہ! یہ کیا امداد ستور نکالا
ہوا ہے تم نے؟

امی جو یوں شروع ہوئیں تو بولتی چلی گئیں۔ فراز
کان دبائے کھڑا تھا اور دل میں اعتراف کر رہا تھا کہ
ساس جو کہہ رہی ہیں۔ سچ کہہ رہی ہیں۔

فریا کی ہنسی، منہ کی لاکھ کوششوں کے باوجود
فوارے کی طرح پھوٹی تھی۔

فراز نے اسے گھور کے دیکھا تھا اور امی سلتا کے
لپکی تھیں اس کی طرف۔

”نمبر وڈرا پہلے میں تمہارا اعلان کر لوں۔“ فریا
نے بھاگ کر باورچی خانے میں پناہ لی تھی۔

”ارے! اس فریا بد تہذیب سے تو لاکھ درجہ
بہتر ہے میری فروا، کیا خاک اثر چھوڑا ہے پڑھائی

نے اس کیسے پر۔ عقل تمیز کا نام و نشان نہیں۔ اور ایک
میری فروا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا اس میں تمیز نہیں

ہے۔ ارے یہ کتابیں تو فقط پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں
ان سے سیکھتا کوئی، کوئی ہی ہے یہ علیحدہ بات

ہے۔ انسان کو انسان، تربیت ہی بنانی ہے۔ بھی!
ارے ایسے، ایسے، پڑھے لکھے اونچے عہدوں کے

لوگوں کو میں نے جہالت کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے،
میری فروا کے متعلق کوئی کچھ ایسا، ویسا کہنے کی جرأت

تو کرے۔“
اس گھر میں فقط امی کی کمراری آواز کی گونج تھی

باقی ہر شے خاموش تھی۔
فراز یوں کھڑا تھا جیسے زبان گروی رکھ دی ہو۔

ساس کی زبان کے جوہروں نے اس کی بولتی بند کردی
تھی۔ گویا بدین واشک کر کے رکھ دی تھی۔ اتنی اچھی

طرح آئینہ تو آج تک کسی نے اسے نہیں دکھایا تھا۔
گویا آئینہ دیکھنے کی خواہش ہی مٹ گئی تھی۔

ساس صاحبہ نے لفظوں کے ہیر پھیر سے،
صاف صاف، اسے اپنے گریبان میں جھانکنے کو کہا تھا

اور وہ اپنے گریبان میں جھانکنے کی ہمت نہیں کر رہا
تھا۔ اس نے معذرت کے ارادے سے گہرا سانس

لے کر سر اٹھایا تھا کہ ساس جی پھر بول انھیں.....

”اگر اب گھر جا کر میری فروا سے کوئی اول قول
کہنے کا ارادہ ہے تو میری فروا کو خاموشی سے میرے گھر

چھوڑ جاؤ، بھاری نہیں ہے کچھ پہ میری بیٹی!“
وہ کہہ تو رہی تھیں ایسا، مگر یہ اور بات کہ دل ایسا

کہتے دائیں، بائیں لرز رہا تھا۔
اور دل تو فراز کا بھی دھڑک اٹھا تھا پوری رفتار

سے۔ ساس کے آخری جملوں پر۔ جو بھی تھا۔ وہ کچھ
ایسا ویسا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عمل کرنا تو دور کی

بات تھی۔
”معذرت چاہتا ہوں، میں ہی غلط تھا۔“ اس

نے دھیرے سے کہا واہسی کے لیے پلٹا، مگر راستے
میں ساس اور سالی اس تیزی سے حائل ہوئیں کہ وہ

حیران پریشان رہ گیا۔
”ارے، ارے، اب ہم اتنے بھی برے نہیں

ہیں کہ گھر کے اٹکوتے داماد کو اپنے گھر سے یوں
سوکھے منہ جانے دیں۔ بیٹھو بیٹا! مگر میں پہلے اس فریا

کی مرمت کر دوں۔ گھنہ بھر ہونے کو آبا ہے مگر اتنی
توفیق نہیں ہو رہی کہ مہمان کے لیے کچھ انتظام

کر دے۔ لگتا ہے کتابوں نے اس کی ساری عقل ہی
چاٹ لی ہے۔ میری فروا ہوتی ماں اس کی جگہ تو اب

تک کب کی، بغیر کبے ہی سب انتظام کر دیتی۔“
فریا ماں کو دوسری دفعہ اپنی طرف لپکتے دیکھ کر

جان گئی تھی کہ اب کے امی نہیں ٹٹنے والی۔ اسی لیے
غراب سے چھوٹنے سے باورچی خانے میں غائب

ہو گئی اور اماں مسکرا کر فراز کو لیے اندر بڑھ گئیں۔
فراز بھی مسکرا رہا تھا، ایک دم ہلکا پھلکا ہو کر، جی

ہاں!
☆☆

ناولٹ

بہن بھائی اس کے خدشے کے عین مطابق پھوپھو کی
گود میں گھسے ہوئے تھے۔

”لائیہ! سامرا! جلدی سے پھوپھو کو اللہ حافظ
بولو، پھر ہم چلیں۔ چھوٹے ماموں لینے آ گئے۔ گاڑی
کا ہارن بج رہا ہے۔“

”ہم نے نہیں جانا مانو کے گھر، مانو گندی ہے
ماموں مارتے ہیں مانا ابو ڈانٹتے ہیں۔ وہاں ہمیں
کوئی پیار نہیں کرتا۔ ہم نے اپنے گھر میں ہی رہنا ہے
تم جاؤ۔“

کرن کا خون غصے سے اٹنے لگا لیکن لہجہ اس

کرن نے دوپٹہ اوڑھ کر خود کو پھر سے شے
میں دیکھا تا کہ تیاری میں کمی بیشی دور کر سکے۔ لپ
اسٹک کا رنگ کچھ گہرا لگا تو لیوں میں نشوونما کرکھ لپ
اسٹک اتار دی۔ کھلتے رنگ کا سوٹ اس کی شفاف
چمکی جلد کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ تیاری سے مطمئن ہو
کر اس نے الماری کو تالا لگایا۔ چابی سوٹ کے ہم
رنگ کچ میں رکھی اور باہر نکل آئی۔ اس کی توقع کے
عین مطابق دونوں بچے نہ کمن میں تھے نہ پرانے
بم آگے میں، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے
بڑے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے اور پھر دونوں

شہانہ و لعباد

سرال گیترا پھول



نے نرمہ کہ کر عجبہ کرنی چاہی۔
 ”بڑوں کو تم نہیں کہتے۔ آپ کہتے ہیں اور نانو
 کے گھر میں سب ہی تو پیار کرتے ہیں جیٹا“
 حسب توقع لائبہ نے اس کی نصیحت کو اپنے
 مطابق لے کر مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

”مہاتم، تم، تم، مہاتم، تم، تم“
 اس کی دیکھا دیکھی میں سالہ اسامہ نے بھی تم
 تم کی گردان شروع کر دی۔ اب وہ سارے دہلی دہلی
 طہریہ مسکراہٹ سے کرن کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے کہ
 رہے ہوں۔۔۔۔۔ اب سناؤ؟؟

”لائبہ بھاگ کے دادی کی گود میں چھپ جاؤ
 تمہاری ماما بس اب تمہیں مارنے والی ہے۔“

سب سے چھوٹی تند کی گوہر افشانی پر بیشک
 کشتہ زعفران زار بن گئی۔ ساس، سر، دیور، تندیں
 اور اس کے اپنے بچے اس پر ہنس رہے تھے۔ کرن
 کے گلے میں آنسو پھٹنے لگے۔ اسے صبح سے یہ ہی ڈر
 تھا اسی لیے تو صبح سے ہی لائبہ کو سب سے چوری
 چوری گود میں لے کر پکا کر رہی تھی کس آج نانو کے
 گھر جانا ہے۔ بڑے ماموں، ممانی اور ان کے بچے
 کراچی سے آ رہے ہیں۔ خالہ بھی آئیں گی بہت
 سارے لوگ ہوں گے مزے کا کھانا ہوگا۔ ہم بہت
 انجوائے کریں گے۔ لائبہ مسلسل اس کی ہاں میں ہاں
 بھی ملائی رہی مگر لیکن تیاری کے بعد جوں ہی پھوپھو
 اور دادی کے پاس گئے تو نتیجہ اس کے سامنے تھا۔

بڑوں کو آپ نہیں تم کہتے ہیں۔ بڑوں کو آپ
 نہیں تم کہتے ہیں۔ ”لائبہ دادی کی گود میں بیٹھ کر
 اسے مسلسل چڑا رہی تھی۔ کرن سے برداشت نہ ہوا تو
 اس نے ساس کے پاس جا کر اپنے ہاتھوں سے کی گئی
 اپنی بیٹی کی پوٹی ہی نوج ڈالی۔

یہی وقت تھا کہ آفتاب بھی گھر آ گیا۔ بچوں
 نے اسے دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا۔ ”ہا ہا ماما مار
 رہی ہے۔“ آفتاب نے ماں کی گود سے جی کو اٹھالیا۔

”میری گڑیا کو ماما کیوں مار رہی ہے؟“

”ارے وہی آنے جانے کا مسئلہ، جب بچے
 مانی کے گھر جا کر خوش نہیں تو زبردستی کا ہے کوئلے کے
 جالی ہے۔ جب بھی یہ بچوں کو مارلی ہے، میرے
 گلچے پر ہاتھ پڑتا ہے۔ طیبہ تو اندر جا کر رو پڑتی ہے
 کہ لائبہ کو مارا ہے۔ آفتاب! بچے پیار کے بھوکے
 ہوتے ہیں وہاں ان سے کوئی پیار ہی نہیں کرتا تو بچے
 کیا کرنے جائیں۔ یہاں ہم سارے ان پر جان
 چھڑکتے ہیں ہماری تو جان ہے ان میں۔“

”بڑے بھائی! آپ کے بچے آپ نے
 زیادہ ہمیں پیارے لگتے ہیں۔ پہلے جتنا پیار ہم آپ
 سے کرتے تھے، اب آپ سے دو گنا ہم لوگ ان
 سے کرتے ہیں۔“

نند اور ساس نے چٹاخ چٹاخ دونوں بچوں کو
 پیار کرنا شروع کر دیا تو کرن کی جذباتی فطرت ان کی
 چالاکی پر مزید بھڑک اٹھی۔

”پتا ہے مجھے جتنا پیار تم لوگ کرتے ہو، میں
 سب جانتی ہوں، یہ دکھاوے کس لیے ہو رہے
 ہیں۔“

میدان بجاتا دیکھ کر ابھی ابھی دفتر سے واپس آیا
 آفتاب بھی بھٹا گیا۔

”بس کر دو کرن! اگر بچے تمہاری اماں کے گھر
 نہیں جائیں گے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ ان
 کے گھر بہت سے بچے ہیں ان کا بچوں کا شوق پورا ہو
 چکا ہے تب ہی ہمارے بچوں سے سختی کرتے ہیں اگر
 پیار کرتے تو بچے خود ہی بھاگ بھاگ کر جایا
 کرتے۔“

اس کی بھری آنکھیں دیکھ کر آفتاب نے باقی
 تقریر دل میں دہائی اور دادی کی گود میں بیٹھے اپنے
 بچوں سے پوچھا۔۔۔ ”ماما کے ساتھ نانو کے گھر جانا
 ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ دونوں نے یک زبان ہو کر
 انکار کر دیا تو بھاری دل کے ساتھ سب کو اللہ حافظ کہہ
 کر کرن گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ محل کی گاڑی کا
 ہارن وہ سن چکی تھی ویسے بھی دفتر سے واپسی پر وہ تھا

ہونے کے سبب اسے بیرونی گیٹ سے پک کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔
فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھی تو چلنے والی اس کی سرخ آنکھیں دیکھتے ہی جان لیا ہمیشہ کی طرح رو کر ہی لگی ہے۔

”روایت نہ توڑنا تم، جب بھی تمہیں لینے آؤں یا تم روٹی ہوئی گاڑی میں بیٹھتی ہو یا تمہارے بچے۔“

کرن بھائی کی سچ بانی پر بے دلی سے مسکرا دی کہ ہوتا ایسا ہی تھا بچوں کو نانی کے گھر جانا پسند نہیں تھا تو تیار ہو کر عین موقع پر جانے سے انکار کر دیا کرتے جیسے آج کیا تھا اور پھر کرن دونوں کو پھینکا لگا کر کھینچ کر گاڑی میں بٹھالی تو وہ دونوں روتے ہوئے نانو کے گھر پہنچا کرتے۔ چند گھنٹوں بعد اسے واپس آنا پڑتا اور آتے ہی زادی اور پھوپھو وغیرہ کے لاڈ شروع ہو جاتے۔ آج وہ نہیں تو خود کرن بھری آنکھوں کے ساتھ بھائی کے برابر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

کرن میکے میں سارے بہن بھائیوں سے چھوٹی تھی جب بڑے بھیا کی شادی ہوئی تو بمشکل گیارہ سال کی ہوئی۔ بڑے بھیا کے بعد بالترتیب بانی بہن بھائیوں کے گھر آباد ہوتے گئے لیکن کرن کی بار اماں نے ترتیب بدل ڈالی۔ چل کرن سے بڑا تھا پر اماں نے پہلے کرن کی شادی کرنے کا عندیہ دے دیا۔ اس کے سارے احتجاج پس پشت کر کے بی ایس کے فاسل ایئر میں رشتہ ڈھونڈ و ہم شروع کر دی گئی۔

ابا کی تائی کے توسط سے آفتاب کا پہلا رشتہ آیا تو کسی کو انکار کرنے کی وجہ ہی نہ ملی۔ صرف بڑی بھابھی نے ایک دو بار کہا کہ کوئی اور بھی دیکھ لیتے ہیں کیا ہا آفتاب سے اچھی آپشن مل جائے لیکن اماں ابا نے ان کی بات کو اہمیت نہ دی تو ہائی کسی نے کیا دیکھی۔

اماں کے پاس سب سے بڑا جواز تھا کہ دونوں

میں عمر کا تفاوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ کرن میں اکیس سال کی ہے تو آفتاب بمشکل چوبیس کا، یوں چنی ہم آجلی ہونے میں دشواری نہیں ہوگی۔ ابا کو کے پاس پلس پوائنٹ یہ تھا کہ پڑھائی میں خود کو ضائع نہیں کیا۔ لڑکا سمجھ دار لکھا ایف اے کے بعد اپنی زمین داری کا فائدہ اٹھا کر آڈیٹ مارکیٹ میں نوکری کر لی۔ اجناس کی خرید و فروخت سے تنخواہ دار سے دو گنا کماتا ہے۔

”لیکن وہ گھر کا سب سے بڑا بیٹا ہے اس لحاظ سے کرن کے لیے مشکل ہوگی بڑی بہو، بڑا بیٹا میرا مطلب ہے کہ.....“

بڑی بھابھی کے اس اعتراض کو سب نے خود پر تنقید ہی جانا۔ خاص کر اماں نے جن نظروں سے بڑی بھابھی کو دیکھا تھا، کرن کو آج بھی یاد تھیں۔

بڑے بھیا نے ماں کا موڈ دیکھ کر بیوی کو آنکھ سے اشارہ کر دیا تھا یوں ایک ننھا سا اعتراض اپنی موت آپ مر گیا اور کرن کی بی ایس کے احتجاجات کے بعد شادی طے پا گئی۔ ”شادی جلدی کرنی ہے اس لیے مگنی کے تعلقات کی ضرورت نہیں۔“ ابا کے بیان کو آفتاب کی ماں اور بہنوں نے خاطر میں نہ رکھا، وہ ہر چند وہ دن بعد کسی رشتے دار کو لے کر آئیں تو ساتھ ڈھیر ساری کرن کی چیزیں بھی ہوتی تھیں۔ کپڑے، جوتے، جیولری کے ساتھ ہم رنگ لپ اسٹک اور چوڑیاں تو لازمی ہوتیں۔

ان کے ہر چکر کے بعد سب بڑی بھابھی کو گہری نظر سے ضرور دیکھتے کہ اب کہو۔۔۔

کرن کی بڑی بہنیں تو اس کے سسرال سے آئے جسم جسم کے کپڑوں، جوتوں پر ہی فدا رہتی تھیں۔ آفتاب کے گھر والوں کو آفتاب کی شادی کا شوق و دلولہ ہی اتنا تھا کہ دوسری گلی والوں کو بھی ان کا جوش و خروش نظر آتا تھا۔

کرن بھی تو نرم و نازک احساسات والی الہ لڑکی، جلد ہی اسے سابقہ رویے سے تائب ہو کر آفتاب اور اس کے گھر کے سپنوں میں ڈوب گئی۔

اسے امتحان اب بوجھ لگ رہے تھے جیسے ہی بوجھ سر سے اترا آفتاب جینڈا باجے کے ساتھ اس کی ڈولی لینے آ پہنچا۔

شادی میں شامل مہمانوں کو بھی نظر آ رہا تھا کہ لڑکے والوں کو لڑکے کی شادی کا کتنا جاڑ ہے۔ گھر کی پہلی شادی کی وجہ سے ان لوگوں نے دل کھول کر پیسہ لگایا اور شاہی انتظامات کیے جبکہ کرنا سے پہلے اس کے بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں تو ظاہری بات تھی ان کی طرف لڑکے والوں جیسا جوش و خروش مفقود تھا۔ گوکہ سارے انتظامات بہترین تھے پر پھر بھی لڑکے والوں سے کہیں نہ کہیں دبے دبے ضرور لگے تھے۔

کرن کی سہیلیاں بھی دولہا بھائی کے بہن بھائیوں کی شاہ خرچوں سے شدید متاثر ہوئی تھیں۔ ان کے متاثر ہونے کے بعد کرن کا سر فخر سے کچھ اور اونچا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی خوش بختی پر اب کوئی شک و شبہ نہیں تھا لیکن اگلی صبح اس کی خوش قسمتی اور فخر گھر کے مشیر کے قتل خانے میں دھل گئے۔ حقیقی دھمکی رنگین نہیں صرف سیاہ و سفید تھی جب کہ اس کی چوٹس تو ہمیشہ سے اچلے، چمکیلے اور آنکھوں کو دور سے نظر آتے رنگ رہے تھے۔

”کرن بیٹی! گھر میں جوان لڑکیاں ہیں، اس لیے صبح اذان سے پہلے اٹھ کر واش روم سے قارغ ہوا کرو۔ ایک ہی واش روم ہے گھر کے افراد زیادہ ہیں لڑکے تو سارے صبح نہانے کے عادی ہیں۔ غسل خانے کے باہر کھڑے ہو کر بہو بیٹی کا انتظار کرتے اچھے نہیں لگتے۔ اس لیے میری اور بچیوں کی عادت ہے گھر کے مردوں سے پہلے اٹھ کر قارغ ہوتی ہیں، تم بھی یہی عادت اپناؤ۔“

گھر میں اکا دکا مہمان موجود ہی تھے جب اسے ساس امی نے اپنے کمرے میں بلا کر پہلی ہدایت دی۔ اس نے بھرپور آمادگی سے سر ہلا دیا لیکن یہ سب کتنا مشکل ثابت ہونے والا تھا۔ یہ اسے بعد میں اعمازہ ہوا تھا۔

”اور ہاں، جیڑ میں جواتا خوب صورت قران لائی ہو وہ بھی کھولا کرو، خرید کے بند کر کے رکھنے سے گناہ ہی ہوتا ہوگا۔ ایسا کرو، وہ بھی میرے اور لڑکیوں کے کمرے میں ہی رکھ لو۔ میں تو تہجد کے بعد سوتی ہی نہیں ذکر اور وظائف کرتی ہوں۔ تم بھی ادھر ہی آ کر بیٹھ کر پڑھا کرو، دونوں پڑھیں گے تو گھر میں برکت و اتفاق قائم رہے گا۔“

کرن کو شادی کے اگلے ہفتے ہی پتا چل گیا کہ ساس، برکت اور اتفاق صرف اپنی اولاد میں چاہتی ہیں۔ کرن باہر والی ہے اس لیے آفتاب کا اور اس کا اتفاق سے رہنا قطعاً ضروری نہیں اس مقصد کے لیے وہ آفتاب کو بھرپور طریقے سے سرال اور بیوی کے نادیہ عیب بھی دکھانے لگی تھیں۔

کرن ذہین اور سمجھ دار لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ بھرے پرے گھر سے آئی تھی ایسے گھر سے جہاں ساس اور بہو میں بھی موجود تھیں، بینش بھی شادی شدہ تھیں اور ان کے سرال کے بکھیرے بھی۔ بھابیوں کو بھی اس کی ماں سے مسئلے مسائل ہو جاتے تھے تو اس کی اماں کو بھی بہوؤں سے شکایت ہو جاتی تھی لیکن سب ایک دوسرے کا احترام کرتی تھیں اور منہ در منہ شکایتیں لگانے کا موقع بھی نہ آتا تھا۔ لیکن کرن کے سرال میں اس کے گھر سے تو کیا اکثر گھروں سے الٹ ماحول تھا۔

☆☆☆

”بڑے بھائی! کیا کھا کر آئے ہو سرال سے؟“ یہ اس کی بیوی تندگی جو اس کے اور آفتاب کے گھر واپس آنے پر پوچھ رہی تھی۔

”لو بھلا کون سا چھلایا اکلوتا جوانی ہے جو سات رنگ کے کھانے بنا میں گئے، خواجواہ بھائی، بھابی کو شرمندہ نہ کیا کرو۔“ کرن ہکا بکارہ گئی کہ شرمندہ بھی ہوتا ہے۔

”نہیں امی! بہت اچھا کھانا کھا کر آئے ہیں، بریانی، تورمہ، مشائی فروٹ سب تھا۔“

”سب مطلب کیا؟ باری کیو، افغانی پلاؤ، مٹن

روستہ؟“ اب کے چھوٹا دیوڑھی شامل ہوا تھا۔ کرن کو اندازہ ہوا اب واقعی وہ شرمندہ ہو رہی ہے، مگر وہ بلکہ آفتاب کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔“

”میں نے کہا بھی ہے، بڑے بھائی کو تنگ نہ کرو پھر بھی شروع ہو گئے تم لوگ، یہ سب تو ان گھروں میں ہوتا ہے جہاں داماد اکلوتا ہوا پھر سبلا، کرن کے تو پہلے ہی دو بہنوں ہیں، ان کی خد متھیں کر کے سارے چاؤچو نچلے ختم ہو گئے ہوں گے۔“

”نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں، آفتاب کی اپنی جگہ ہے ویسے بھی سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے مجھے گھر میں سب لوگ زیادہ پیار کرتے ہیں، اسی وجہ سے سب کو آفتاب سے بھی زیادہ لگاؤ ہے۔“

”لو وہ تو شادی میں بھی نظر آ رہا تھا، کتنا کرتے ہیں سووی لگا کر دیکھیں بھابھی! پھر پتا چلے گا پیار کسے کہتے ہیں۔ سارے انتظامات ہم نے بڑے بھائی کے شان شایان کیے تھے بری دیکھی ہے نا، آپ کی طرف سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں ان ہی چیزوں سے پیار اور اہمیت کا پتا چل جاتا ہے۔“

چھوٹی ننڈ کی گوہر افشانی پر ساس نے پھر سے لاڈ بھری سرزنش کی۔

”نہ کر طیب! بتایا تو ہے کرن سب سے چھوٹی ہے ایسے چاؤ، ولاڈ تو بڑوں کے حصے میں ہی آتے ہیں۔ آفتاب تم لوگوں کا بڑا بھائی ہے۔ میرا جیٹھا اور لاڈ لڑیٹھا ہے میری بات کان کھول کر سن لو، بھائی کے آگے بھی سر نہ اٹھانا، باپ کی جگہ ہے بھی جو اس کی عزت میں کمی کی تو میری قبر بھی نہ بچنے کی۔“

کرن نے بہت جلد جان لیا، چھوٹے دونوں دیوڑھی اور پڑھائی کے بہانے بتاتے اور ننڈیں خاندان کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں دو گنا جھنجھ جمع کرنے کی شوہن ہیں۔ سرساده مزاج شخص ہے اور ساس ضرورت سے زیادہ چالاک، اس لیے سارے گھر اور باقی اولاد کی خاطر وہ آفتاب کو صرف بیٹا اور بھائی بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔

شوہر بننا دیکھنے کا مطلب تھا کہ کرن کو شادی چاہئے، جب تک سارے بچے لھکانے نہ لگ جاتے وہ کرن کو کسی صورت آفتاب پورا نہیں سوئپ سکتی تھیں۔ اسی لیے وہ عام ساسوں کے برعکس تھیں۔ وہ بھی بیٹے سے اکیلے بیٹھ کر اس کی بیوی یا سسرال کی برائی نہ کرتیں بلکہ اکیلے تعریف کرتیں، ہمدردی دکھاتیں لیکن کرن کے سامنے وہ بیٹے کا ذہن بالکل اسی طرف لگا دیتیں جو وہ چاہتیں۔

کرن کمرے میں آفتاب سے لڑتی تو دیواروں سے کان لگا کر سستی ساس، اگلی صبح کرن کو انگاروں پر لٹا دیتیں اور بیٹا حریذ قبضے میں کر لیتیں۔ پھر دونوں ماں بیٹے کی فاتحانہ نظریں اسے اندر سے کاٹ ڈالتیں۔ نیچے میں اپنی ٹینشن بتاتی تو سارے کہتے۔ ”وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا باقی لوگوں کی شادی بولیںے دو۔“

”وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔“ میری ساس اب دوسرے بیٹے کی شادی تو ہر گز نہیں کریں گی۔ آفتاب کی پتہ نہیں کیسے کر دی۔“

رات کو گیارہ بجے ساس اور ننڈوں کے کمرے سے وہ ڈھیل بین کراٹھ کر آنے لگی تھی جس پر ننڈوں کے تہہ خا صے بدل گئے تھے۔ سراسیمہ بیرونی پھانک کے ساتھ بنے ڈرائنگ روم میں ہوتے تھے تو وہ رات کا کھانا کھاتے ہی سونے کے لیے چلے جاتے۔ دونوں دیوڑھی کی کرہ شیر کرتے تھے جبکہ ساس اور ننڈیں ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ یہ گھر کا سب سے بڑا کرہ تھا جو بیٹھک کے نام سے مشہور تھا جب سے شادی ہوئی تھی آفتاب رات بارہ بجے تک ماں اور بہنوں کے پاس وہیں بیٹھا رہتا۔

پہلے پہل تو وہ بھی خود پر جبر کر کے بیٹھ جاتی تھی، آخر ننڈ کے ہاتھوں تنگ ہو کر وہ اب اٹھ آتی تھی کیونکہ صبح اذان کے وقت پھر اسے اٹھ کر ساس کے ساتھ نماز اور تلاوت اسی کمرے میں جا کر کرنی ہوتی تھی۔ اس کی ننڈ پوری نہ ہونے کی وجہ سے سارا دن بخار جیسی کیفیت لگتی تھی۔ سرور و بھی ہو جاتا تھا۔

اپنی لیے وہ اب کبھی کبھار تھوڑی بے حس ہو کر جلدی اٹھ آتی تھی۔

”آپ کی اماں کو آپ کی ابھی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی ماما بوائے شادی جیسا تعلق بہتر نہیں تھا سمجھتے کیونکہ ان کی اماں انہیں خود بخار یا شوہر تو بننے ہی نہیں دیتی۔“

بارہ کے بعد وہ واپس آیا تو پیٹ کے درد سے لڑتی کرن ایک بار پھر سے بخ ہو چکی تھی۔ یا تو وہ اس کے اپنے سے پہلے سو جایا کرتی یا سونے کی ایکٹنگ کرتی تھی اس طرح روز رات کو ان کے درمیان تنگناں پنپ رہی تھیں۔ آج سوئی نہیں تو پیٹ درد نے گی پوری کر دی تھی۔

”کرن! تم کس قدر حاسد لڑکی ہو ہر وقت میری امی سے بدگمان، میری بہنوں سے تنگ، میرے بھائیوں سے ٹالاں۔ ایک وہ لوگ ہیں، انہوں نے بھی تمہارے خلاف بات نہیں کی۔ ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔ ایک تم ہوتھائی لٹے ہی چغلیاں اور غیبت سیشن شروع کر دیتی ہو۔ ان کے پاس اکیلے بیٹھوں تو ہزار باتیں، قہقہے اور تمہارے پاس بیٹھوں تو صرف شکایتیں۔“

”رات بارہ بجے کے بعد سو کر اذان کے وقت پھر ان کے کمرے میں بھاگو تا کہ ان کے ساتھ نماز ادا کی جاسکے، آپ کو یہ آسان لگتا ہے۔ چار گھنٹوں کی فینڈاس کے بعد سارا دن کمرے میں قدم نہیں رکھ سکتی کہ بڑی بہو ہوں۔ میرا بیڑا دم تمہاری بہنوں کے قبضے میں تا کہ وہ ڈرامہ یا فلم دیکھ لیں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتی کیونکہ بڑی بہو ہوں، میری خاموشی کا مطلب میں نے منہ بتایا ہوا ہے۔ اوٹ ٹانگ بولتے ہی رہتا چاہئے بس، دن میں بیس بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ بڑی بہو اچھی ہو تو گھر بڑا رہتا ہے ورنہ شیرازہ بھر جاتا ہے۔“

آفتاب نے کھٹاک سے ہاتھ اس کے سامنے جوڑے اور سونے کے لیے کراٹ بدل لی، اگلے دن اسے رات میں کی گئی باتوں کے جواب سب کے

سامنے سنا دیے گئے اور اسے پتا چل گیا کہ ان کی باتیں بھی سنی جاتی ہیں۔

”گاؤں سے زرینہ کا فون آیا تھا پہلے تو گلہ کیا کہ تیری شادی میں انہیں کیوں نہ بلایا پھر کہنے لگی، آفتاب کی شادی اتنی جلدی کیوں کر دی۔ پہلے بیٹیوں کی کرتی آفتاب کے ہم عمر تو ابھی پڑھائی کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ زرینہ میں بڑی انصاف پسند ماں ہوں۔ کماؤ بیٹے کی شادی اس لیے نہیں روک سکتی تھی کہ پہلے لڑکیوں کی کروں، مجھے اپنے بچے کی شادی کا شوق ہی بہت تھا۔ خواہ مخواہ بیٹے کو بوڑھا کرنا مجھے نہیں پسند۔ اس عمر میں شادی کریں تو خود بھی جوان ہوگا۔ اولاد بھی جوان ہو جائے گی۔ ایسا دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی ہوگی اگر زمرہ رہی تو۔“

☆☆☆

”آفتاب کو حقیقت نظر ہی نہیں آتی کہ اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پیار کے نام پر اور بڑے بھیا ہونے کی وجہ سے۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے اس وقت آتا ہے جب وہ کہتا ہے امی اور سب لوگ میرے اکٹڑ ہونے کے باوجود مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں میری عزت کرتے ہیں کیونکہ میں آفتاب دہلہ کی بیوی ہوں۔“ کرن جھلک کرنے کے لیے سسٹل میکے شفٹ ہو چکی تھی۔ اب ماں اور بہنوں کے ساتھ سسرالی مسائل کھل کر صبر کرتی تھی۔

”کرن! کوئی عقل کا ہاتھ پکڑو اگر تمہاری ساس نندیں ایسی ہیں تو تم کون سا کم ہو ہمیشہ ان کی امیدوں پر بھرا اترتی ہو۔ ہر مہینے ان پر رعب ڈالنے کو آ جاتی ہو محل کی آدمی تنخواہ تمہاری واپسی پر لگ جاتی ہے سال پہلے تو اتنا جھڑپا ہے، ابھی تو وہ ساری چیزیں بڑی ہوئی ہیں۔ تم نئی شاہنگ کر کر کے ان کا گھر بھری جا رہی ہو۔“

”آئی امیں کیا کروں جب بھی میکے سے واپس جاؤں حرے سے آفتاب کے سامنے پوچھتی ہیں کیا دیا میکے والوں نے؟ وہ گاؤں سے بھلے شہر

شفت ہو گئے ہیں رچے ابھی بھی گاؤں کے شرنیکے میں ہیں۔“

”اب گاؤں پر نہ شروع ہو جانا قصور تمہارا اپنا ہے اور سینسیو ہو کر سسرال میں نہیں بسا جاتا۔“

”آلی آپ کو اپنا وقت بھول گیا ہے جو مجھے

اور سینسیو ہونے کے طعنے دے رہی ہیں۔ بڑی

بھابھی کے ساتھ آپ اور اماں بھی یہی کیا کرتی تھیں

جب ہی وہ اکیلی اس رشتے کی مخالفت کر رہی تھیں

کیونکہ انہیں پتا ہے بڑی بہو بننا کتنا عذاب ہے۔ ان

لوگوں نے آفتاب کے دماغ میں یہی تو بھرا ہے کہ

بڑوں کی شادیاں کرتے اور رشتے نبھاتے ہمارے

گھر والوں کی ہمت جواب دے چکی ہے۔ میں تو

یونہی نامناسب سے انتظام کے ساتھ بیاہ دی گئی

ہوں کیونکہ چھوٹی ہوں آفتاب بھی چھوٹا داماد ہے اس

لئے اس کے حصے میں بھی وہ والی عزت و توقیر نہیں

آتی جو آپ لوگوں کے میاں کی تھی۔“

”وہ جو مرضی سمجھتے رہیں، تم پرواہ ہی کیوں کرتی

ہو؟“

اب چھوٹی بھابھی اور اماں بیٹھیں ساری ایک

طرف تھیں اور اسے ڈھیٹ ہونے کی پریشانی کرنے

کا کہہ رہی تھیں۔

”کیسے ڈھیٹ ہوا جائے جب گھر میں زندگی

شادی کی تیاری چل رہی ہو۔ ساس ہر وقت اپنے

بچوں سے یہی کہتی پائی جاتی ہو کہ داماد کی عزت فرض

ہے غیر خاندانی لوگوں کی طرح نہیں کہ داماد اور عام

مہمان میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ جب بھی وہ ”عام

مہمان“ کہتی ہیں ساتھ ہی میرا بچہ کہہ کر ٹھنڈی آہ

بھرتی ہیں کہ کسی نے داماد ہونے کے نام نہیں اٹھائے

۔ آفتاب میری دوائیاں بھول جاتا ہے بہن کے

سسرال کو ماں کے مطابق پروٹوکول دینے کے چکر

میں پھنسا رہا ہے۔

”وہ ایسی عورت ہے جو بیٹوں پر ایک دھیلا لگا

کر راضی نہیں لیکن بیٹی کے سسرال اور داماد کے نام پر

کل جمع پونجی لٹا رہی ہے یہی کچھ وہ مجھ سے چاہتی

ہے اگر شاہنگ کر کے نہیں جاتی ہوں تو آفتاب کے

سامنے یہی بات ہوتی ہے کہ مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا

۔ وہ اپنی بیٹی سے کرتی ہیں اور آفتاب اپنی بہن سے

پیار کرتا ہے تب ہی تو بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا ہے

خرچے سے پیار کا پتا چلتا ہے وغیرہ وغیرہ، میرا دماغ

پھٹنے والا ہو جاتا ہے۔“

”ایسی حالت میں فینشن نہیں لیتے۔“ سب

اسے تسلی دیتیں اور ہمت بڑھاتے۔

”دیکھو بیٹا! تمہارے ابو یا بھائیوں کو بتائیں تو

وہ کہتے ہیں کوئی ایسی قابل گرفت بات نہیں ہے جس

پر کرن کے سسرال میں جا کر عدالت سجائی جائے،

زبانی کھائی ان کی آپس کی باتیں ہیں، تمہیں

ڈائریکٹ تو کوئی کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے تم بھی

زیادہ سوچنا بند کر دو، سسرال والے ایسے ہی ہوتے

ہیں جگہ بنانے میں وقت لگتا ہے۔“

”میری تو بھی نہیں بنے گی، آفتاب یہاں آنا

چھوڑ چکا ہے کیونکہ اس کی امی نے غیر محسوس طریقے

سے اسے آپ سب سے بدظن کر دیا ہے۔ وہ سمجھتا

ہے اس کے آنے نہ آنے سے آپ لوگوں کو فرق

نہیں پڑتا کیونکہ آپ کے سارے ارمان بڑے

دامادوں کی وجہ سے پورے ہو چکے ہیں۔ بچے کو وہ

اٹھایا نہیں کرے گا کیونکہ اس کی ماں گھبرے گی

مرد بچے نہیں پالتے یہ عورتوں کا کام ہے۔“

”تو یہ ہے کرن! کس قدر بدگمان ہو چکی ہو۔“

سب ہی اس کی بات پر مسکرائی تھیں۔

”اڑالو میرے مسائل کا مذاق، پہلے میں بھگت

رہی ہوں، اب میرا بچہ بھی بھگتنے آ رہا ہے۔ مجھے تو

شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ اس گھر میں کسی تیسرے کی

معتناش ہی نہیں ہے، میری ساس کو صرف بیٹیوں کا

فرسٹ کلاس اور بہت زیادہ جھنجھ بٹانا ہے اور اپنے

سمہ صیانے پر بے تحاشا رعب جمانا ہے، ایسے میں

انہیں یہ بچہ بوجھ بڑھانے والا ہی لگتا ہے جس پر

آفتاب کی نکالی کا کچھ حصہ خرچ ہوا کرے گا جب کہ

اس کی نکالی کی ہی وجہ سے تو اسے حصار میں رکھا ہوا

تھے۔ وہ کبھی بھی بچے اور باپ کی بوٹنگ نہیں بنے دیں گی، کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ آفتاب اپنی ٹیلی میں اٹھ اٹھ کر ہمارے ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لے گا۔“

”ضروری نہیں ہے جیسا تم سوچتی ہو، ویسا ہی ہو، ہر وقت ان کے بارے میں بدگمان رہتی ہو۔ اس حالت میں اللہ کو زیادہ یاد کیا کرو۔“

ساری خواتین اسے باجماعت مشورہ دے کر اٹھ گئیں۔ پھر وقت نے بتایا کہ جو وہ سوچ رہی تھی اس کی ساس اور نندوں نے اس کی سوچ سے ایک سو اسی ڈگری کا ٹرن مارا تھا۔ لائبر کے دنیا میں آنے کے بعد اس کے سارے خدشے غلط ثابت ہوئے تھے۔ گیم اس کی سوچ کے بالکل الٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ساس نے پوتی اٹھا کر سب سے پہلے دی سی بیٹے کی گود میں لے لی۔ وہ سارے اس قدر پر جوش تھے کہ آس پاس والے بھی کرن کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ اعلا سے اعلا چیزوں اور کھلونوں کے ڈھیر سے ہسپتال کا کمرہ بھر دیا گیا۔ وہ سارا خاندان کرن کے بجائے آفتاب کو زچہ بنائے ہوئے تھا۔ بڑے بھائی اتھاری بیٹی کی ٹانگ اسکی، بڑے بھائی، اتھاری بیٹی نے ایک آنکھ کھولی ہے، بڑے بھائی تمہاری شہزادی اس دنیا کی ہے ہی نہیں۔“

کرن کے میکے والی خواتین نے ایسے جتنی نظروں سے دیکھا کہ ”اب بتاؤ تم تو کہہ رہی تھیں، یہ لوگ آفتاب اور بے بی کی بوٹنگ نہیں بننے دیں گے یہ تو زچہ بھی آفتاب کو بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔“ کرن بے بسی سے نظریں گھما سکی تھی۔

”بڑے بھیا! ہم لائبر کو اپنے گھر ہی لے جاتے ہیں۔“ طیبہ نے نہایت جوش سے بھائی، ماں اور پھر بھابھی کی طرف دیکھا۔ آفتاب بیٹی کو گود میں لیے بہن کی فرمائش پر چٹکیلی آنکھوں سے مسکرا دیا۔ ”بہن جی! وہ آپ کے گھر میں تو پہلے سے پوتے پوتیاں، نو اسے نو اسیاں ہیں تو آپ کو شاید اتنی

خوشی نہ ہو بلکہ ہم سب تو آپ کو پاگل لگ رہے ہوں گے۔“ کرن کی ساس اپنی بات پر خود ہی ہنسیں۔ ”لیکن وہ کیا ہے نا کہ ہمارے گھر کا تو پہلا بچہ ہے ہمارے تو چاؤ ولاڈ ہی اب شروع ہوئے ہیں اس لیے میں تو کتنی ہوں چھوڑیں رسم و رواج ہم کرن اور لائبر کو ہسپتال سے سیدھے اپنے گھر نہ لے جائیں۔“ کرن کے ابا نے ان کا جوش و خروش دیکھ کر اجازت دے دی یوں کرن کے بچوں پر سسرالی قبضے کا آغاز ہوا تھا۔ یہ قبضہ اگر بچوں سے پیار کی وجہ سے ہوتا تو اسے دل و جاں سے قبول تھا لیکن یہ غصب کی منافقت اس لئے اپنائی گئی کہ ”بڑے بھیا“ کلید کے تیل کی طرح ان کے حصے کا بھی کام کرتے جائیں اور اپنی جیب میں اپنی بیوی اور بچے کے لئے پھونی کوڑی نہ رکھیں۔ یہ اسکی جذباتی بلیک میلنگ تھی جو کرن کا رات دن خون چوستی تھی کہ ایک جیتے جاگتے انسان کو صرف ایک ”بڑا بھائی“ کے لقب اور منہ دکھاوے کی عزت و پیار سے بے وقوف بنائے رکھا ہوا ہے۔ اسے اس سارے عمل کی سمجھ آگئی تھی یہی بات ڈینی امیٹار میں جٹا کئے رکھتی تھی۔ اس نے جتنی بار ایکسپوز کرنا چاہا اتنی بار منہ کی کھال اور ساس اور نندوں کی جتنی نظریں برداشت کیں۔ وہ اب ماں جی تھی کہ اس کی ساس نندیں بہت ہٹ کر اسٹریٹی بنا لی ہیں۔۔۔ جب وہ کھیل کھینچنے کے قابل ہوتی ہے تب تک ساری بازی ان کی طرف جا چکی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خود سے ڈینی جنگ لڑتے وہ لائبر کا فیڈر پکڑا آتی یا ڈائیٹیر پکڑا آتی کہ وہ صرف گود میں لے کر بیٹھنے والا پیار کرنی تھیں باقی ساری ذمہ داری کرن کی ہی تھی۔

بیوی نند کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تو ایک مستقل ڈینی تقرر تھا جو اس پر رات دن ہوا، آفتاب کے سامنے ہوا اور اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ باتیں جو بیٹھے لہجے میں کی جا رہی ہیں میری بیوی کا کلیجہ پھلتی کرتی جا رہی ہیں، اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ کرن کے بارے امی اور بہنیں کبھی تمہاری میں اس کی

برین واشگ نہیں کرتی تھیں جب کہ کرن کا تو روز کا
و طیرہ تھا صرف شکایتیں اور اپنے رویے سے بھائی
بھی خراب کر دیتی تھی۔ شادی والا گھر تھا جو بات بھی
ہو رہی تھی ساتھ کرن کی شادی اور گھر والوں کا ذکر
لازم تھا۔ غزل کچھ اس طرح پھیڑی جاتی۔

☆☆☆

”آفتاب بٹا اہارے گھر تو پہلی لڑکی کی
شادی ہے مناسب نہیں لگتا، کرن سے پہلے اس کی
دوہوں بہنوں کی ہو چکی تھی اس لیے اس کے میکے
والوں نے ایسا نہیں کیا تو ضروری نہیں ہم بھی بچت
کرنے کے لیے ان کے نقش قدم پر چلیں۔ جیسے کرن
کا دل دکھا تھا میں ایسے ہی تمہاری بہن کا نہیں دکھانا
چاہتی۔“

شادی کے بعد دعوت تھی تو جب کرن کے میکے
کی طرح نہیں کرنی، ہمارا تو پہلا داماد ہے۔
کرن میکے اور اپنے دفاع کی بات کرتی تو وہ
سب ہنس پڑتے جیسے کسی بے وقوف کی بات پر ہنسا
جاتا ہے۔

”لو میری بیٹی تو برا ہی مان گئی کرن! میں نے تو
بات برائے بات کی ہے کوئی برائی نہیں کی۔ اللہ تمہارا
میکہ سلامت رکھے اتنا جذباتی نہ ہوا کرو ہم بھی تو
تمہارے بچے ہی ہیں یہ گھر تمہارا ہے۔ نند کا جتنا کرو
گی اس کے سسرال میں تمہاری اور آفتاب کی ہی
شان بنے گی۔“

کرن کا دل کراتا دھاڑ کر کہے نہیں چاہئے مجھے
یہ شان، جب میں اپنی پسند کا سوٹ نہیں خرید سکتی
اپنے بچے کی چیزیں خود نہیں لے سکتی تو مجھے شان
بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

نند کی شادی کے بعد حالات پہلے سے بھی بدتر
ہو گئے کہ اب سسرال یہ کہہ کر بیٹی بلائی جاتی، شاپنگ
کرنی ہے فلاں کی دعوت ہے وغیرہ وغیرہ۔ آفتاب
سے کہا جاتا ہے ہے پیار، اس سے تمہاری بہن کی
سسرال میں عزت بڑھ رہی ہے ان کو پتا چل رہا ہے
ہم اپنی بیٹی سے کتنا پیار کرتے ہیں کتنی اہمیت دیتے

ہیں۔ کرن کے والدین بھی پیار کرتے ہوئے لیکن
ہمارے جتنا نہیں، تمہیں تو سارا پتہ ہے آفتاب۔ وہ
ماما بوائے یوں سر ہلاتا جیسے اسے واقعی ہی سب کو پتا
ہو۔

اب تو اس کی اپنی اولاد لائے اور اسامہ بھی اس
کے پاس نہ آتے، ماموں، خالہ، ماما نانی کا گلہ ہی
کرتے کہ وہ ہم سے پیار نہیں کرتے تو ہم نے ان
کے گھر نہیں جانا۔ بچوں کے دماغ کو بھی بننے کے طرح
ان لوگوں نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ انہیں
صرف پھوپھو کے گھر جانا ہی پسند تھا اور پھوپھو کے
بچے ہی ان کے بہن بھائی تھے۔ بیٹی کی سسرال میں
برتری بنانے کے لئے آفتاب کی آدمی کمائی بہن اور
اس کے بچوں اور سسرال پر جانے لگی تھی۔ لائے اور
اسامہ سے پیار اب نوا سے اور چھ مہینے کی نوا ہی کی وجہ
سے زبانی گلہ ہی رہ گیا تھا۔ ساس، آفتاب کے
سامنے منہ بھر کر کہنے لگی تھی جیسے ہم نوا سے، نوا ہی کا
کرتے ہیں ہر شے اعلا سے اعلا لے کر دیتے ہیں
ایسے ہی کرن کے والدین نوا سے نوا ہی کا کرتے تو
آج آدھا بوجھ کم ہو جاتا تھا۔ وہ کرن کے میکے کی آڑ
لے کر بیٹی کا گھر بھرتی جا رہی تھی صرف بیٹی کے
سسرال کو مالی پریشی میں لینے کے لئے کرن کے میکے
کی توہین کرتیں جس کی وجہ سے آفتاب اپنی ساری
کمائی بھی بہن پر لٹانے کو تیار ہو جاتا تھا۔ اب نوا سے
نوا ہی پر جان چھڑکنے کا آغاز بھی ہو چکا تھا ساتھ ہی
آفتاب کے سامنے اس کے بچوں کے انھیال اور اپنا
موازنہ کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ اگر ہماری طرح اپنے
نوا سے نوا ہی پر شفقت لٹائیں تو بچے کیسے نہ نانی کے
گھر جانا پسند کریں۔

”ای! وہ لوگ تو لائے، اسامہ سے اتنا پیار
کرتے ہیں یہ تو جاتے بھی نہیں ہیں پھر بھی واہسی
میرے ہاتھ ہی سب اتنی چیزیں بھیجتے ہیں آپ کو پتا
ہی ہے۔“

”کرن بیٹی اپنے پیار کے بھوکے ہوتے ہیں
وہاں انہیں ہمارے جتنا پیار نہیں ملتا تو اس لئے

جاتے بھی نہیں ہے۔ نو اسے نو اسی کے معاملے میں
کنجوسی کریں تو وہ بدظن ہو ہی جاتے ہیں اسی لئے
میں حصہ کے بچوں کے ساتھ کنجوسی سے تم لوگوں
کو منع کرتی ہوں۔ ہم کریں گے تو وہ بھی ہمارے گھر
آنا پسند نہیں کریں گے۔“

☆☆☆

جب سے بڑے بھیا نو کرنی کے سلسلے میں
بچوں سمیت کراچی شفٹ ہوئے تھے چھ ماہ بعد ملنا
ملنا ہوتا تھا۔ اب بھی عید کے بعد وہ لوگ اب آئے
تھے، بھیا بھیا بھی بہت تپاک سے ملے اور حسب
معمول بچوں کا پوچھا تو اس نے بتا دیا تیار تھے لیکن
پھر سے وادی اور پھوپھو نے انہیں پی پڑھا کر رکھ لیا
تو اسے اکیلے آنا پڑا ہے۔ قسم قسم کے کھانے بلکہ لگ
دیکھ دیکھ کر اس کا دل بار بار لائبہ اور اسامہ کی طرف
جاتا رہا۔ ممتا سے مجبور ہو کر اس نے محل کو کھدیا
”مجھے گھر چھوڑ آؤ پلیز!“

”یہ کوئی وقت ہے واپس جانے کا؟“

”کیا رہے تو بچے ہیں، میرا دل بچوں میں اٹکا
پڑا ہے کچھا کچھا نہیں لگ رہا۔“

”صبح صبح چھوڑ دوں گا ابھی تم بھی سونے کی
کوشش کرو میں بھی سونے جا رہا ہوں۔“

ایاں عشاء پڑھنے لگیں تو بڑی بھیا بھی اس کے
باس آ گئیں۔ بڑے اہتمام سے بھیا بھی نے کمفرٹر
گھولا ٹانگوں کے اوپر اوڑھا، اپنے لائے ہوئے
ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی اور جم کر
بیٹھ گئیں۔

”اچھا تو ہماری اجلی کرن اپنے بچوں کی وجہ
سے بھی ہوئی ہے۔ تم کچھ وقت کے لئے بچوں کو
بھول کیوں نہیں جاتی ہو؟“

”لو بھلا اپنے بچوں کو بھی کوئی ماں بھولتی ہے
؟“ کرن نے برا متایا۔

دیکھو کرن! انہیں پتہ ہے یا تمہیں پتہ ہے کہ
لائبہ اور اسامہ کی وادی اور پھوپھو وغیرہ ان سے غلط
نہیں بس آفتاب کو قابو میں رکھنے کے لئے مختلف

ڈھونگ رچاتے ہیں۔ آفتاب اس بات کو نہیں سمجھتا
کہ اس سے غرض کا تعلق ہے آج گھر میں پیسے دینا
چھوڑ دے تو کوئی اس کے بچوں کو منہ نہ لگائے۔ تم یہ
حقیقت بچوں کے ذریعے ہی اسے سمجھانے کی کوشش
کر کے دیکھ لو۔“

بھیا بھی! میری ہر کوشش ناکام گئی ہے سچ تو یہ
ہے کہ باقی باتوں پر اب دل کو قرار آ گیا ہے اتنا
صدمہ نہیں لگتا واحد بچوں کا معاملہ ایسا رہ گیا ہے جو
مجھے رات دن تڑپاتا ہے۔

”میرے بچوں پر غاصبانہ قبضہ کر کے انہیں مجھ
سے اور مجھ سے منسلک باقی رشتوں سے جتنا متنفر کر
دیا گیا ہے آپ کی سوچ ہے۔“

”کوئی بات نہیں اتنی ٹینشن نہ لو جب بڑے
ہو گئے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خاک ٹھیک ہو گا بھیا اب تک لائبہ اور
اسامہ کی گندی خاتونیں ہوتے ہو جائیں گی۔ پھر اسی
ساس اور پھوپھو نے کہا ہے بیٹی ذات کو منہ
بھٹ بنا دیا ہے اسے ماں نے تیز تہذیب نہیں
سکھائی۔ ابھی تجھے نچا دکھانے اور آفتاب کو فریب
دینے کے لئے اس کی ہر الٹی سیدھی حرکت و شرارت
کو مکمل سپورٹ کرتی ہیں۔ لائبہ بچوں والی باتیں نہیں
کرتی کبھی عورتوں کی طرح چٹلی لگاتی ہے۔ اس کی
وادی نے سکھا سکھا کر اس کا ذہن اتنا نکا کر دیا ہے کہ
مجھے دشمن سمجھتی ہے اپنی پھوپھو اور اس کے بچوں کو کھیلی
۔ حالانکہ وہ مارتی بھی ہیں ڈانٹتی بھی ہیں لیکن اس کی
شکایت پر لائبہ کو بتایا جاتا ہے پھوپھو کام کر کے ٹھکی
ہوئی تھی پھوپھو ڈانٹنے سے زیادہ پیار کرتی ہے جبکہ
آپ لوگوں کی باتیں بچوں سے کرید کرید کر پوچھ کر
پھر سکھایا جاتا ہے بابا کو بتاؤ نا نو کے گھر سب مارتے
ہیں پیار نہیں کرتے ماما بھی مارتی ہے۔“

میں ذرا سا انگلی لگا دوں تو سارا گھر رونا پینا
ڈال لیتا ہے لیکن صرف منہ زبانی کیونکہ وہ چاہتی ہیں
بچے اور آفتاب ان کے مرید رہیں لیکن اخراجات
میں میکے سے لاؤں جیسے وہ اپنی بیٹی کو دیتی ہیں۔ خود تو

1122022 نومبر

Scanned with CamScanner

مستی ذہن کے تھے ہی اب میرے بچے بھی اسی لائن پر لگائے ہیں۔ "کرن اپنے بچوں کی ذہنی حالت پر بات کرتے کرتے بچ بچ رو پڑی۔

"جب تمہیں اتنی مینشن ہے اور یہ بھی کفرم ہے کہ وہ لوگ بچوں کے دل و دماغ میں تمہارے خلاف زہر بھر رہی ہیں تو تم بچوں سے ان سے دو گنا پیار کرو تا کہ وہ تمہیں بھی سننے لگیں۔"

"بھابھی! پیار اور مار دونوں ٹیکنیکس استعمال کر کے دیکھ لی ہیں بچے بری طرح سے مجھ سے متفر ہیں۔ بچ تو یہ ہے لائبہ کی جب میں اپنی ساس جیسی باتیں سنتی ہوں تو بی بی مائی ہو جاتا ہے خود ہی پھڑپھڑانے کو دل کرتا ہے کہ اتنی سی بچی اور اتنی بڑی بڑی اور لڑائی کروانے والی باتیں کیسے کر لیتی ہے۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا حالات اتنے بگڑ چکے ہیں۔" بھابھی نے افسوس کیا۔

"لائبہ بچی ہے مجھے اس کی زیادہ مینشن ہے بعد میں سارا الزام ماں پر آ جاتا ہے کہ بچی کی تربیت اچھی نہیں کی۔ ان لوگوں کے ہاں ابھی بھی گاؤں والے رشتے داروں کی سوچ چلتی ہے کہ لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہئے۔ اب لائبہ کی دادی بھی اس کے دماغ میں یہی بات ڈال رہی ہے۔ لائبہ اسکول میں بھی دلچسپی نہیں لیتی میرا دل تھا کہ آپ لوگ آئیں گے تو سب اکٹھے ہو گئے میرے بچے باقی کزنز سے کچھ اچھا ضرور سیکھ لیں گے لیکن وہ صرف پھوپھو کے بچوں کو ٹیبل سمجھتے ہیں۔ ننھیال کے بچے تو دشمن کہتے ہیں۔"

"کرن! تمہیں جب یہ تھا کہ بچوں کے ساتھ تمہاری ساس تندیں یہ کھیل کھیل رہی ہیں ابتدا ہی سے تم بھی بچوں کی ساتھ ساتھ برین واشنگ کر لی جاتی۔ لیکن تم نے تو چیزیں خرید خرید کر گھر بھرنے کو ترجیح دی۔ ایسے مادہ پرست لوگ مادی اشیا سے صرف وقتی طور پر خوش ہوتے ہیں کھل خوش نہیں رہ سکتے۔"

"بھابھی! یہ سب میں میکے سے اسی لئے

کر جاتی ہوں کہ مجھے حصہ ہے کم تر نہ سمجھا جائے۔ ان لوگوں کو جتانے کے لئے جمل پر بوجھ ڈالشی ہوں کہ میں بھی سب کی لاڈلی ہوں۔"

"انہوں نے مان لیا؟"

"کبھی نہیں مانا بلکہ وہ تپا دکھانے کے لئے کوئی اور کھیل شروع کر گئی ہیں۔"

"تم ان کے کھیل میں آتی ہو تب ہی تو نئے سے نیا کھیل شروع کرتی ہیں جب کھیل میں آتی جاتی ہو تو ہار لی کیوں ہو؟"

"بھابھی! وہ گیم روایتی طریقوں سے نہیں کھیلتیں اسی لیے میرے گیم سمجھنے تک وہ بازی ہی جیت چکی ہوتی ہیں۔"

"تو پھر میری مالتو تو اس جیتی ہوئی بازی کو ان کی آزمائش بنادو۔ لیکن اس کے لیے تمہیں دل سخت کرنا پڑے گا یہ متا کے ہاتھوں ہلک میل ہونا چھوڑنا پڑے گا۔ میکے سے بیک بھر بھر کر لے جانا بند کرنا ہوں گے۔ تمہارے بچے تمہاری متاع ہیں، ان کے معاملے میں دل سخت کرنا مشکل ہے، پر کرنا پڑے گا کم سے کم تب تک جب تک تم اپنے بچے ان کے حصار سے نکال نہیں لیتی ہو۔"

"وہ کبھی نہیں لگیں گے بھابھی! جوتے کھا کر بھی باپ کی طرح ان ہی کے گن گائیں گے۔"

"میری ماں کر تو دیکھو۔ وقت ضرور ملے گا تمہارا دل بھی دکھے گا لیکن نتیجہ اچھا نکلنے کے ساتھ فیصلہ چاہیے ہیں۔"

"فننی فننی چانس بھی ہوتے تو میں گیم آن ضرور کرتی۔" کرن نے بڑی بھابھی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"بھابھی! بڑی بہو ہونے کی وجہ سے اس گھر میں جو کچھ ہمارے آپ نے دیکھا۔ میں اس پر آپ سے معذرت کرتی ہوں۔"

"چلو ہم دعا اور کوشش کرتے ہیں کہ تمہارا مشکل وقت بھی جلد کٹ جائے۔"

"دیورانی کے آنے سے کٹ سکتا ہے لیکن

آپ سے چند قدم آگے ہوں۔“
جس جس نے سنا، کرن نے چند دن بچوں کے
بغیر یکے میں گزارنے ہیں۔ سب نے ہی اس بے
دقویٰ سے منع کیا لیکن وہ اپنی بات سے پیچھے ہٹے ہی نہ
ہئی۔

”بیٹی! خود ہی تو کہتی ہو، وہ بچوں سے بھی
صرف منہ دکھائے کا پیار کرتے ہیں، ان کے کھانے
پینے سونے جاگنے کی ذمہ داری تمہاری ہے تو پھر جاؤ
اور محسوم بچوں پر ظلم نہ کرو۔ ان کی ٹھیک دیکھ بھال نہ
ہوئی تو بیمار پڑ جائیں گے پھر تمہیں ہی دکھ اور دو گنی
مصیبت پڑے گی۔“ ابا نے وہی خدشے بتائے جو
حقائق تھے جن کی وجہ سے وہ کبھی سخت قدیم اٹھانے کا
نہ سوچ سکی تھی لیکن اب وہ دل سخت کر چکی تھی۔

”ابا! آفتاب کی آنکھیں کھولنے کے لیے اور
بچوں کو ماں کی اہمیت بتانے کے لیے دل کو تھوڑا
سخت تو کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کو تو پتا ہے میں تک
دل نہیں ہوں نہ ہی میرا مطالبہ ہے کہ آفتاب اپنے
خونی رشتوں کو چھوڑ دے۔ میرا تو بس اتنا سادہ دل کرنا
ہے کہ میری جگہ پر مجھے عزت سے رہنے دیا جائے۔
بے کار مخلوق نہ سمجھا جائے، میرے سیکے کا ہر وقت خود
سے تقابل نہ کیا جائے۔ بچوں کو اپنی تسکین کی خاطر
تنہائی رشتوں کے خلاف نہ کیا جائے۔ باقی ساری
باتیں برداشت ہو گئی ہیں، ان پر دل بھی اب نہیں
دکھتا لیکن اپنے بچوں کی خدمت اور خیال رکھنے کے
بعد بھی محبت نہیں ملتی تو دکھ ہوتا ہے۔

میں چاہتی ہوں اب بچے اور ان کا باپ جان
لیں کہ ان سے بے لوث محبت میں ہی کرنی ہوں اور
اب وقت آ گیا ہے کہ مجھے وہ سب کے سامنے اون
کر لیں جب وہ مجھے اپنا لیں گے تو گھر کے باقی افراد
خود ہی میری جگہ سمجھ جائیں گے۔“

”بس بیٹا! ابھی بھی پہلے غلط بھی ہو جاتے
ہیں ہمیں بڑی بہو کی بات مان لینی چاہیے گی۔“
”ارے نہیں ابا! ایسے سب کریں گے تو لوگوں
کے بڑے بیٹے کنوارے ہی رہ جائیں گے۔“ اس کی

میری ساس شاعر محوت ہے جان گئی ہے نئی بہو
آئے گی تو خرچہ بڑھے گا بڑی بیٹی کے وفد و رسد میں
تنگی آئے گی۔ دوسری بات ولید کی کام پر نہیں لگا،
تیسری بات وہ آفتاب جیسا بھولا بھی نہیں ہے ان
کے ساتھ رہ کر ان کو سمجھ گیا ہے کہ کیسے مجھے ذہنی آزار
میں مبتلا رکھتی ہیں۔ وہ پہلے ہی دن ان کی حدود بتا
دے گا۔ اس لیے میری ساس اب بیٹوں کی شادی کا
بالکل نہیں سوچ رہیں بلکہ وہ تو چھوٹی بیٹی کو بھی بھولی
ہوئی ہیں انہیں صرف بڑی بیٹی سے عشق ہے۔“
”چلو پھر خود ہی کوشش کا آغاز کرو تاکہ
تمہارے بچے تو تمہاری حدود میں واپس آ جائیں۔“
”بھابھی! صبح سے ہی آپ کے مطابق عمل
شروع کر رہی ہوں۔“

☆☆☆

”کرن! تم نے جانا نہیں ہے ابھی تک بستر پر
لیٹی ہو رات کو تو گیارہ بجے بھی گھر جانے کو تیار نہیں۔“
جبل آفس کے لیے تیار ہو کر اس کے سر پر کھڑا
پوچھ رہا تھا۔

”نہیں مجھے آج نہیں گھر جانا بلکہ ابھی چند دن
حریذ نہیں جانا۔“ اس نے عزم سے کہا تو جبل کے
ساتھ رات کے کھانے میں سے کرن کے بچوں
کے حصے میں آنے والی چیزوں کا تقن بھرے کھڑی
امی حیران ہی رہ گئیں۔

”ارے لڑکی! دماغ خراب ہو گیا ہے کیا، بچے
چھوڑ کر یکے رہو گی کیا یا آفتاب بچے چھوڑ جائے
گا۔“

”آفتاب کا پتا نہیں لیکن میں اکیلی ضرور
رہوں گی۔“ بھابھی نے اس کے چہرے پر چمکتا
عزم دیکھ کر انگوٹھا کھڑا کیا تو اس نے بھی مسکرا کر آنکھ
مار دی۔

”اس دفعہ میں بازی جیتنے کے لیے میدان
میں نہیں اتر رہی ڈیر سا سماں! بلکہ آپ کی جیتی
بازی کو آپ کا امتحان بنانے کے لیے اتر رہی ہوں
۔ یہ تو میں کر کے رہوں گی کیونکہ کھیل سے پہلے ہی

بات پر سب غی نہیں پڑے۔ ضرورت حکمت عملی بدلنے کی ہے، اب میں وہ بدل چکی ہوں۔“

☆☆☆

اس کی توقع کے عین مطابق آفتاب کا فون تھا۔

”جی آئی! میں بس آپ کو فون کرنے والی تھی پھر ناشتہ کرنے بیٹھ گئی۔“

”بچوں سے کتنی لاپرواہ ہو امی اور طیبہ، قصہ نہ ہوں تو وہ تو زلی عی جا میں، اسی لیے تو وہ تمہارے ساتھ آنا پسند نہیں کرتے۔ خیر جلدی گھر آ جاؤ، لائیو نے اسکول سے چھٹی بھی کر لی ہے اسامہ نے ناشتہ نہیں کیا۔“

”آئی! آپ بچوں کی مینشن کیوں لیتے ہیں جب آپ کو پتا ہے امی اور طیبہ لوگ کتنا پیار کرتے ہیں بلکہ مجھ سے زیادہ کرتے ہیں تو منہج بھی کر لیں گے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے بتانا تھا کہ میں بڑی بھابھی کے ساتھ رحیم یار خان جا رہی ہوں ان کی والدہ کا پتا کرنے، وہاں دو دن تو لگ عی جا میں گئے۔“

”دماغ ٹھیک ہے۔ بچوں کو چھوڑ کر رحیم یار خان جا رہی ہو، گھر میں کوئی اور ساتھ جانے والا نہیں ہے۔؟“

”تو ہے آئی! پتہ بھی ہے کہ چھ مہینے بعد بھیا بھابھی سے ملاقات ہو رہی ہے میری، ایک تو آپ میرے میکے والوں سے ملنا پسند نہیں کرتے نہ آتے جاتے ہیں تو ان سے سارے غصے میں نے عی نبھانے ہیں۔ آپ ساتھ چلیں گے تو ابھی لینے آ جائیں ہم پھر اپنے گھر سے ان کی پیار والدہ کی عیادت کو چلے جائیں گے۔“

کرن نے وہاں تیر مارا جہاں چوٹ گہری لگنے کا امکان تھا۔ جہاں جہاں شوہر کو دلبرانہ طریقے سے ڈیل کرنا تھا وہاں وہاں آواز کے کوچ پر خاص توجہ رکھی اور جہاں دھونس سے کام لینا تھا۔ لہجہ گھر درا بھی کر ڈالا۔

”پتا تو ہے تمہیں میرے پاس اتنا وقت کہاں؟“ آفتاب فوراً بدک گیا کہ ماں نے غیر محسوس طریقے سے سسرال سے بدظن کیا تھا تو اب اسے کھٹا کھٹا مشکل لگتا تھا۔

”اچھا پھر اسپیکر پر لگا کر بچوں سے بات کروا دیں۔“

”لائیو! آپ کیا کر رہی ہو؟“ دادی کے پاس بیٹھی کھیل رہی ہوں۔“

”او کے، میری بات سنو بیٹا دادی اور پھوپھو لوگوں کو تنگ نہیں کرنا، جو بھی لینا ہو دادی، پھوپھو، چاچو کسی سے بھی کہہ دینا۔ سب لے دیں گے۔“

”تم نہیں آؤ گی ماما؟“

کرن نے ”تم“ نظر انداز کر کے لہجے میں مزید شیرینی بھولی کہ اس کھیل میں وہ بچوں کے ساتھ حد سے زیادہ میٹھا ہونا چاہتی تھی اور دوسروں کے اصلی منافق اور تلخ رویے ان کے سامنے ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

”نہیں بیٹا! میں دوسرے شیر جا رہی ہوں بڑی ممانی کے ساتھ، کچھ دن بعد آؤں گی۔ آپ کو اس لئے نہیں لے کر جا رہی، یہاں بچے بھی مارتے ہیں اور کوئی بھی دادی اور پھوپھو لوگوں کی طرح پیار بھی نہیں کرتا، دادی کو فون دو۔“

”امی! میری بڑی بھابھی کی والدہ ٹھیک نہیں ہیں۔ مجھے ان کی عیادت کو جانا ہے۔ گھر اس لیے نہیں آ رہی کہ پھر اپنے گھر سے جانے پر ہمارا خرچا ہو جائے گا آفتاب پر مزید بوجھ آ جائے گا۔“

آواز دبا کر یوں بات کی آفتاب سمجھے، گھر والوں سے چھپا کر یہ کہہ رہی تھی۔

”تو بچوں کو ساتھ لے جاؤ۔ طیبہ تیار کر دیتی ہے۔“

”نہیں نہیں امی! مجھے بہت تنگ کریں گے۔ آپ کے اور پھوپھو کے لیے اتنی جلدی! اس ہو جاتے ہیں۔ میرے بغیر رہ سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کے بغیر نہیں رہتے۔ میری تو بھابھیاں حیران رہ جاتی

ہیں جیسے ہی ہیں۔“
 ”کرن! تمہاری ساس اور ننہیں اپنی نسل پر
 جان وارتی ہیں۔ کاش ہماری ساس بھی تمہاری جیسی
 ہوتی۔“

کرن نے فیس فیس کر ساس کو پالس پر چڑھا
 چاہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ساس متاثر نہیں ہوں گی۔
 اس کا مقصد بھی صرف آفتاب کو سناہی تھا جب ہی تو
 اس کے فون پر اسپیکر پر یہ باتیں کر رہی تھی۔ اسے خبر
 تھی اسامہ کو کھانے کے بجائے فیڈر پر فیڈر دیا جاتا
 رہے گا۔ ہو سکتا ہے، طیبہ گنڈا فیڈر طرف کھٹکال کر
 اس میں دودھ ڈال دیا کرے جس سے بچے کا پیٹ
 بھی خراب ہو جائے گا لیکن اسے معلوم تھا، چند دن یہ
 برداشت کرنا ہے دل پر پھر رکھنا ہی پڑے گا۔ مستاجم
 و جان کی رگیں توڑنی رہی لیکن وہ ڈھیٹ بن کر رحیم
 یار خان روانہ ہو گئی۔ بے تالی سے شام کا انتظار کیا
 تاکہ آفتاب کے فون پر کال کر سکے۔ جان بوجھ کر
 ساس کے موبائل پر کال نہ کی۔

”اسامہ کیا کر رہے ہو؟“

”گاڑی چلا رہا ہوں۔“

”کھانا کھالیا؟“

”نہیں۔ فیڈر دیا ہے۔“

”ماما پاس آتا ہے؟“

”نہیں۔“

”لائبہ سے بات کراؤ۔“ اور پھر بیٹی نے بھی
 اس کے سوال کے جواب میں یہی کہا کہ ماما پاس نہیں
 آتا، اپنے گھر میں ہی رہتا ہے۔ کرن اچھی طرح
 جانتی تھی یہ ابھی ابتداء ہے اتنی جلدی مطلوبہ نتائج نہیں
 حاصل ہو سکتے لیکن دل پھر بھی دکھ گیا تو اس نے توجہ
 بھائی اور اس کی والدہ کی طرف کر لی۔

دو کے بجائے انہیں تین دن لگ گئے۔ واپسی
 پر بچوں سے دوری نے سرور و بن کر چلے بھلے بخار کی
 صورت اختیار کر لی۔ ساس بے چین تھیں کہ وہ واپس
 گھر آئے اور بچوں کو سنبھالے کیونکہ بیٹی پر کام کا
 بوجھ بڑھ گیا تھا۔ بھائی پر حکم چلا کر بچوں سے پیار

کرنا اور انہیں اپنی سیدھی بیٹی پڑھانا آسان تھا لیکن
 خود ان کی فرمائش پوری کرنا اور پھر بیٹھ کر کھانا بہت
 مشکل کام تھا۔ پہلے تو وہ لوگ کرن کو آواز دے دیتی
 تھیں۔

”یعنی والی کچھڑی بتا دو، اسامہ کو کھلانی ہے۔“

کرن محنت سے بنا کر دیتی اور وہ بچے کو ادھر
 ادھر سے چوم کر گچھ سے کھلا دیا کرتی تھیں۔ نام
 پھوپھو کا ہو جاتا اور پیار بھی صرف ان ہی کا نظر آتا۔
 اب بچن میں بچوں کا فریاد ہی پروگرام پورا نہیں ہو رہا
 تھا۔ اگر پورا ہو جاتا تو باقی کام اور بچوں کے اضافی
 کام سے پھوپھو صاحبہ کی طبیعت چڑچڑی ہو کر بچے
 کے پاس بیٹھ کر کھلانے اور لاڈ اٹھانے پر مائل نہ ہو
 رہی تھی۔

کرن کی بیماری کی اطلاع نے ان لوگوں کو اور
 سچ پا کیا اور اس کی امید کے عین مطابق سرشام
 آفتاب بچوں کو لیے حاضر تھا۔

وہ مزید بڑھ چال ہونے کی اداکاری کرتی لیش
 رہی، بھائی نے قسم قسم کی چیزوں سے بھیل بھر دی
 لیکن ہمیشہ کی طرح آفتاب نے خڑے سے صرف
 چائے کا کپ اٹھایا اور بچے عیدوں کی طرح بھیل پر
 ٹوٹ پڑے۔ آفتاب ان کے طرز عمل پر واضح طور پر
 اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ اس کے آواز دبا کر ٹوکنے پر
 لائبہ نے صاف کہا۔ وہ اور اسامہ بہت بھوکے ہیں
 کیونکہ ماما نہیں تھیں تو کسی نے ان کو اچھے والا کھانا
 نہیں دیا۔ صرف چائے پاپے دے دیتی ہیں۔
 آفتاب گڑبڑا سا گیا۔

”چلو بھئی اٹھو گھر چلیں۔“

”آئی امیری حالت دیکھ رہے ہیں آپ، مگر
 جانے کا مطلب ہے کوئی ریٹ نہیں ہو سکے گا۔“
 ”کیوں ریٹ نہیں ہو سکتا۔ تم لیش رہنا طیبہ
 اور امی ہیں نا۔“

”تو مجھے یہیں لیٹا رہنے دیں طیبہ اور امی ابھی
 بھی سب سنبھال تو رہی ہیں۔“
 ”بیٹا! رہنے دو۔ ایک تو طبیعت ٹھیک ہو جائے

دوسرا کافی میٹوں بعد یہ سارے بہن بھائی اکٹھے ہوئے ہیں، مل کر وقت گزار لیں۔ بلکہ تم بھی رات رات جاؤ صبح یہیں سے دفتر چلے جانا۔“

کرن کی امی نے بھی مداخلت کی تو آفتاب اتنی جیڑی سے اٹھ کر کھڑا ہوا جیسے وہ زبردستی روک لیں گی۔ بچے بھی پیٹ بھر جانے سے تازہ دم ہو گئے تھے سو باپ کے ساتھ ہی جانے کو تیار ہو گئے۔

”تم لوگ ملا کے پاس رہو۔ ماما ٹھیک ہو جائیں گی تو ہا موں کے ساتھ گھر آ جانا۔“
”ہم نے نہیں یہاں رہنا آپ کے ساتھ ہی جانا ہے۔“

بچے پھر سے یک زبان ہوئے تو کرن کو بھی موقع مل گیا۔

”آفتاب اساتھ ہی لے جائیں۔ ادھر گھر میں سب کے بچے آنے سے گھر پھل بازار بنا ہوا ہے بچے آپس میں بہت لڑتے ہیں۔ ان کو کسی نے ایک لگا دی تو ساری رات روتے رہیں گے، دادی پاس جانا ہے پھوپھو پاس جانا ہے، چاچو پاس جانا ہے۔ باقی بچے ہمارے بچوں کی طرح دادی پھوپھو کے لاڈ لے نہیں ہیں۔“ آفتاب اسے دیکھ کر رہ گیا اور بچے بھاگتے دوڑتے بھرے پیٹ کے ساتھ پھر سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بچے بعد جب محل اسے شام کو چھوڑ کر گیا تو لائبر، اساتھ بھاگ کر اس سے لپٹ گئے حسب توقع ساس اور نند کا منہ سو جا ہوا تھا کیونکہ کام کا سارا بوجھ اکیلے برداشت کرنا پڑا تھا۔ دیوروں اور میاں کے چہرے پر بھی تباہی تھا۔

”آج بھی نہیں آتا تھا۔“ آفتاب نے ہلا خرابان کھولی۔

”کیا مطلب نہیں آتا تھا۔ میں کوئی شوق سے تو اتنے دن لگا کر نہیں آئی۔ بیمار تھی، کسی نے فون کر کے حال تک نہیں پوچھا۔“

کرن کے جارحانہ انداز پر آفتاب دھیمہ پڑا تو

باقی لوگوں کے چہروں کے تے مشکلات بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بھی سب کے ساتھ بیٹھک میں ہی بیٹھ گئی تو بچوں نے بھی دائیں بائیں سے کندھے پکڑ لیے۔ اب کے وہ سوچ کر آئی بھی انہیں کے سچ میں تھے رہنا ہے، باتیں سن لیتی ہیں لیکن میدان نہیں چھوڑنا۔
”ماما! پاسا بنا کر دیں، ماما! فیڈر بنا کر دو، ماما! پھوپھو نے مارا، ماما دادی نے ڈانٹا۔ پھوپھو گندی ہے دادی بھی اسی کی بات سنتی ہیں۔“ جیسے سینکڑوں شکوے تھے۔

”کوئی بات نہیں۔ دادی اور پھوپھو بیمار بھی ٹو کرتی ہیں ماما گھر پر نہیں تھیں تو آپ کی کتنی کسر کی ہے۔“

”جھوٹ بالکل جھوٹ، کسی نے کسر نہیں کی، میں ٹھیک مانتی رہی، مانتی رہی کسی نے بنا کر نہیں دیا۔ اساتھ باتھ روم سے گندائی اٹھ کر آ گیا کسی نے اسے واش نہیں کیا۔“

لائبر کی زبان پتلی کی طرح چلتی تھی اس سے بھولپن چھین کر گپ شب کی طرف لگانے والی بھی پھوپھو بھیاں اور دادی تھیں۔

”میں بھی کہوں دو دن سے اساتھ نیکر میں ہاتھ ڈالے کیوں پھر رہا ہے۔ اسے گندگی سے خارش ہو رہی ہوگی۔ امی، طیبہ آدو بچے نہیں سنبھالے گئے تم لوگوں سے۔“

آفتاب مزید جانے کیا بول رہا تھا لیکن وہ بچے کو اٹھائے واش روم کی طرف دوڑ لگا چکی تھی۔ جب وہ بچے کو نہلا دھلا کر بیٹھک میں لائی تو طوقان گزرنے کے بعد کی خاموشی تھی۔ پھر جو اس نے بیٹھے لیچے میں ساس کو مخاطب کر کے اساتھ کے شدید ریشتر کا گھر یلو ٹونکا پوچھا تو سر بھی میدان میں آ گئے موقف وہی تھا کہ اتنے سے بچے کے ساتھ اتنی لا پرواہی کیونکر پرانی گئی۔ خالی لوٹے دیکھ کر ساس کھٹک تو پہلے ہی گئی تھی پھر بچوں سے جان بوجھ کر لا پرواہی برتنے نے اسے اور تباہ کیا۔

کھانا مانگتے تو گھبتی پھوپھو سے لے لو، پڑھنے

کے وقت کہتی پھوپھو سے پڑھو۔ ساتھ ساتھ وہ بڑے ہی میٹھے انداز میں سب کے سامنے جتائے جاتی کہ امی اور طیبہ وغیرہ بچوں سے جتنا پیار کرتے ہیں اتنا انھیال والے کر ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے گھر پہلے ہی کافی بچے ہیں۔

یہ وہی الفاظ تھے جنہوں نے آفتاب اور بچوں کے ذہن کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ تردید کرنے کی کوشش میں مزید ذہنی آزار پہنچاتی تھی لیکن اب وہ سر تسلیم خم کر کے بات کو ڈرامائی انداز بھی دے رہی تھی۔

آفتاب اور سر جیسے بھولے مرد اس چیز کو نہیں سمجھ پارہے تھے لیکن کھیل شروع کرنے والیاں امداد ہی امداد ضرور مل کھارہی تھیں۔ ساس کو اس کی میسنی شکل کے پیچھے کی مکاری سمجھ میں آ چکی تھی وہ پھر سے بازی جیتنا چاہتی تھیں لیکن اپنی بیٹی اتنے کام سے گھبرا کر بیٹی جیسے سے دست "پیار" اٹھا چکی تھی بلکہ اب وہ بھانجے بھانجی سے بھی بے زار ہونے کو آ رہی تھی کہ سہیلی کی شادی طے ہو رہی تھی اور اس کی ماں اسے صرف بڑی بہن کی خدمت کی پٹی پڑھانی رہتی تھی۔

ہر دن بچوں کو پھوپھو اور دادی سے شکایتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ پودا انہوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا پھر کرن کو تنگ کرنے کے لیے روزانہ کی بنیاد پر سینچا تھا اسی لیے بچے منہ پھٹ ہو کر ایک کیل چار لگاتے تھے۔ بچوں کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں لیکن آفتاب پر ابھی معاملہ پوری طرح نہیں کھلا تھا۔ کرن کو تو امید تھی چند مہینوں میں منافقت اور حقیقی پیار کا مطلب سمجھ میں آ ہی جائے گا بس اسے دل پر پتھر رکھ کر پیار پیار کی گردان کرتے جانا ہے۔ مخالف بازنی کو مزید تاد دلاتے رہتا ہے تاکہ وہ مکمل رطلطی کریں اور بچوں اور آفتاب کے سامنے ظاہر ہو سکیں۔

☆☆☆

جمعہ کی شام بڑے بھیا اور ان کی فیملی کی کراچی واپسی تھی، آفتاب، سر اور دیور جب مسجد سے واپس

آئے تو وہ تیار بیٹھی تھی۔ اجلا چمکیلا دملکا رنگ اور ہم رنگ دوپٹا کالوں میں گھر کے واحد پودے چنبیلی سے اتاری کلیاں خوشبو کھیر رہی تھیں۔

"آفتاب! مجھے امی کی طرف چھوڑ دیں امداد بھلے نہ آئے گا۔ بس گیٹ پر اتار آ۔ میں۔ شام کی فرین سے بھیا لوگ واپس جا رہے ہیں نا، ذرا جلدی کریں پلیز۔"

"تو بچوں کو تو تیار کر لو۔"

"بچے وہاں جا کر خوش نہیں ہوتے۔ امی اور طیبہ طے پاس خوش رہتے ہیں۔ اتنی بار تیار کر کے چھوڑ کر ہی جانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی بچوں کے بغیر دو گھڑی سکون سے بات چیت ہو جاتی ہے۔ اسامہ، لائبہ! آپ دادی کے پاس رکو، میں بڑے ماموں سے مل آؤں۔"

"ادھر سے کھانا لے آنا، پہلے بھی آپ نہیں لے کے آئی تھیں۔"

"نہیں بیٹا کسی کے گھر سے کھانا نہیں لے کر آتے۔ آپ نے جو کھانا ہے دادی بنا دیں گی۔"

"کوئی بنا کر نہیں دیتا۔ صرف آپ ہی بنا کر دیتی ہیں۔ دادی یا پھوپھو سے کچھ کھانے کو مانگو تو ڈانٹ ہی پڑتی ہے۔"

"تو یہ ہے۔ چھٹایک بھر کی بیٹی کیسے جھوٹ بول رہی ہے لگاؤ اس کے پھڑ، غضب خدا کا منہ پہ جھوٹ بولے جا رہی ہے۔ آفتاب یہ لڑکی ہاتھ سے لکل جائے گی۔"

"امی! چھوٹی سی بیٹی ہے ہاتھ سے کیا لکلے گی ویسے بھی آپ کہتی ہیں۔ بچے جھوٹ نہیں بولتے تو ڈانٹا ہوگا تو کہہ رہی ہے آپ اس کی بات پر تنگ کیوں پڑ رہی ہیں؟"

کرن نے کچھ دوسرے ہاتھ میں خنل کیا۔۔۔

"امی! جیسے اب کہہ رہی ویسے ہی لائبہ میری امی وغیرہ کے بارے میں بھی بولتی رہتی ہے، آپ مانتی نہیں تھیں اب دیکھا، آپ تو مجھ سے بھی زیادہ پیار کر لیں ہیں۔ آپ کی بھی شکایت جڑ دی ہے۔"

ساتھ اس نے دل جلانے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے رکھی۔ آفتاب کے پیچھے بانیک پر بیٹھ کر مزید گل افشانی کی۔۔۔۔

”طیبہ! اسامہ ہاتھ روم میں بیٹھا آواز میں نہ دیتا رہے پہلے بھی تم نے اس کی آواز نہیں سنی تھی تو ڈاکٹر کے پاس جا کر ریشتر ٹھیک ہوئے ہیں۔ وہ پھر سے اٹھ کر آ جائے گا، ایسے ہی بیمار ہو جاتا ہے اس کی آواز سن ضرور لینا۔“ چند لمحوں تک گھٹو مزید جاری رہی تھی۔

آفتاب نے اسے گھر کے باہر ہی اتار دیا لیکن اب بھابھی کی کونسلنگ کے بعد وہ ان باتوں کو نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی اور کامیاب بھی ہو رہی تھی۔

”ہاں بھئی کرن! کیسے چل رہے ہیں معاملات“

”خامسے تیز رفتار ہیں۔ امی اور طیبہ بھری بیٹھی ہیں لیکن معاملہ بچوں کا ہے، اس لیے ابھی تک کل کر کچھ نہیں بول رہیں پر آخر کب تک چب رہیں گی۔ لائبرے تو جب یوٹی ہے ان کی تینوں دیکھیں اڑا دیتی ہے۔“

”مطلب تم خوش ہو؟“ بھابھی مسکرائیں۔

”ہاں میں بہت خوش ہوں کیونکہ پہلی بار اس کھیل میں، میں ان سے آگے کھیل رہی ہوں۔ جب تک میں بچوں پر توجہ دیتی تھی، انہیں امی کے گھر اور ہائی ہر طرف بھی ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی۔ وہ لوگ مجھے ذہنی تکلیف دینے کے لئے بچے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اب جب میں اس ریس سے باہر نکل آئی ہوں تو انہیں وہی پیارے بچے بوجھ لگ رہے ہیں۔ آج بھی خود کہہ رہی تھیں، ساتھ ہی لے کر جاؤں گے تو الٹا سیدھا بولتے رہتے ہیں، نہ خیال کا گھر چھوڑنے والی جگہ تو نہیں ہے پر میں نے کہا۔ آپ لوگ زیادہ پیار کرتے ہیں نہ خیال میں کون سا یہ پہلے بچے ہیں جو ان کو پیارے ہوں گے۔“ پھر پوچھا۔

”کب تک یہی طرز عمل جاری رکھتا ہے؟“

”دیکھو کب تک رکھنا پڑتا ہے۔“

لیکن محض تین مہینے بعد ہی گھر کا نقشہ بدل چکا تھا گھر کے جن کینوں کے بقول وہ بچے جو گھر کے پہلے بچے تھے جن میں سب کی جان تھی۔ اب وہی نکمیں ان ہی بچوں کو دنیا کے بدتمیز اور شرارتی ترین بچے کہہ رہے تھے۔ ان کے بقول انہوں نے بچے سنبھالنے کا ٹھیک نہیں اٹھا رکھا تھا۔

”کرن! تم امی اور طیبہ پر انحصار چھوڑ دو۔ یہ

ہمارے بچے ہیں ہمیں ہی ان کا خیال رکھنا ہے اور تربیت کرنی ہے۔ باقی سب تو عارضی پیار کرنے والے ہیں۔ میں نے بھی سوچا نہیں تھا۔ لائبرے اور اسامہ کو یہ لوگ اتنا برا بھلا کہیں گے، یار بچے ہی تو ہیں، خود ہی انہیں بگاڑ دیا اب خود ہی برا کہہ رہے ہیں۔“ وہ بیڈ پر نیم دراز بڑی سادگی سے دل کا حال صبر کر رہا تھا۔

”پلیس چھوڑیں ان باتوں کو، ہم خود اپنے بچوں کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ آپ ذرا کھڑکی میں دیکھیں پورا جائے کتنا حسین لگ رہا ہے۔ لائبرے! آپ جا کر پھوپھو کے ساتھ سو جاؤ۔“

”میں نے نہیں جانا وہاں، وہ مارتی ہیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں جانے کی، میری بیٹی میرے ساتھ لینے گی۔“

آفتاب نے لائبرے کی جگہ اپنے پہلو میں بتالی۔ کرن نے چور نظروں سے اسے بھولے بچن اور بیٹی کو دیکھا اور مسکراہٹ چھپا گئی کیونکہ وہ ہرگز نہ چاہتی تھی کہ وہ سچائی سامنے لائے اور آفتاب اس کا معنی کرن آفتاب کا کردار سمجھ سکے۔ وہی تو تھی جس نے جالاکی سے جالاک لوگوں کو غلطی کرنے پر اکسایا تھا جس کی وجہ ان کی اصلیت سامنے آئی تھی اور دنیا کے سب سے پیارے بچے دنیا کے بدتمیز بچے بنا دیے گئے تھے۔

☆☆

ناراض ہونا

پھر پھر ہونا

اور پری کو خود سے لپٹا کر خوب سارا پیار کیا اتنے میں
بجس انداز سے چلتی ہادیہ بھابی باہر آ گئیں۔ میں
محبت سے آگے بڑھی لیکن بھابی کا سرد سارو یہ دیکھ کر
میرے جذباتوں پر اوس کی پڑ گئی۔ خود کو خود میں سمیٹ
کر بھاری بیک ٹھیسٹ کر بھابی کی تقلید میں آگے
بڑھ گئی۔

ہادیہ بھابی ایک ٹرے میں دو کپ چائے
ساتھ چھ سات سکٹ لے آئیں۔ میرے برابر بیٹھ کر
رسمًا سا حال احوال پوچھا پھر میرے پلے سے چمکی پری
کو گھر کا، وہ ماں کی تیوری سے ڈر کر بیک اٹھا کے
اکیڑی لکل گئی۔

مجھے تھکان تھی اور نیند کا غلبہ، سونے کے لیے
مناسب جگہ درکار تھی مگر یہ پوچھنا کہ میں کس کمرے
میں سونے جاؤں۔ اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام
لگ رہا تھا۔ بھابی اٹھ کر کچن میں گئیں۔ تو میں ادھر
سونے پر ہی براجمان ہو گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح عجیب ہنگامہ خیزی تھی کچن سے اٹھا رخ
کی آوازیں تو کبھی بھائی بھابی کی ٹوک جھونک میں
حیران تھی کہ صبح صبح ہی ماحول بے حرا ہو گیا ہے۔ میں
سب کچھ کمرے میں بیٹھی سن رہی تھی نجانے کیوں باہر
نکلنے ہوئے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر ایسا کیا ہوا
جو بھیانے پری کو پھٹر جڑ دیا کرنٹ کھا کے باہر کو بھاگی
پری کو جا کے اپنی ہانہوں میں سمیٹا۔ لیکن ہادیہ بھابی
تن فٹن کرتی آئیں پری کو میری گرفت سے آزاد کیا
، پیچ کر دوبارہ بھائی کے سامنے لا کھڑا کیا اور خود بھی
اس پر چلانا شروع ہو گئیں۔

”کہاں سے آئیں گے پیسے، یہ تمہارا باپ اب
کیا ڈاکے ڈالے؟ کچھ رحم کرو اپنے باپ پر اور زبان کا
چمکا تھوڑا کم کرو۔“ شاید پری نے اسکول جانے کے
لیے پیسے مانگے تھے۔ میں بات سمجھ کے آگے بڑھی
اسے ساتھ لگا یاد پھر کمرے سے پیسے لا کر دیے۔

جو اس نے بلا حیل و حجت لے لیے، بھابی بھابی
بھی خاموش رہے لیکن بھیا کے چہرے کی ناگواری



گیٹ پری نے کھولا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی
سے اچھل پڑی اور حلق کے بل چلا کر ماں کو آوازیں
دینے لگی۔

”مما ممما! دیکھیں تو کون آیا ہے؟ ممما جلدی
آئیں۔“ اتنی گرجوٹی سے استہمال ہونے پر میری
سر کی ساری تھکان دور ہو گئی۔

میں نے کپڑوں کا بھاری بیک ایک طرف رکھا

120 2022 نومبر

Scanned with CamScanner

صدف مر

منگل سارا لیل چائے گا

digest novels lovers group Nadia Majid ♥♥

عجب خوف ناک لگتا تھا کہ آتے خوف آتا اسی وجہ سے وہاں سال کے بارہ مہینے گرد و غبار کا ایک طوفان سا رہتا تھا جو بھی بھی ازراہ مروت اوپری اوپری صاف بھی کروا دیا جاتا۔

بھی اس جگہ گھر کی مالکین صنفی بیگم نے بڑے اربالوں سے کیا ریاں بنوائی تھیں کہ سبزیاں اگائی جاسکیں اور جب تک وہ زندہ رہیں انہوں نے اس احاطے کی خوب دیکھ بھال کی۔ بوگن چمپا۔ چینی کی ہالہ لگوائی جو خوب چھلی پھولی۔ مناسب نریش خراش سے یہ حصہ تب بہت خوب صورت لگا کرتا تھا اور شام کو دونوں بچیاں یہاں آکر کھیلا کرتی تھیں مگر ان کے

سبز نے میں گمراہ گمراہ پنے کینوں کی بے اعتنائی کا شکار تھا۔ سبزہ بھی ایسا کہ جیسے جنگل میں آپس میں اچھے پڑے ہات یہ نہ گی کہ یہاں سنوارنے والے ہاتھ کم تھے بلکہ یہاں سب ہی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں رچائے اپنی ذمہ داریاں دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر خود کو بچانے کے فکر میں گھر کو دن بدن ایک جنگل میں بدلتے جا رہے تھے۔ پچھلے احاطے میں ایسا وہ اونچے اونچے درخت کئی سالوں سے مناسب کاٹ چھانٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں الجھ کر عجیب دیوبیل سے لگنے لگے تھے۔

شام کے وقت اس طرف کوئی بھولے سے بھی نہ پھٹتا تھا کیونکہ یہ ویران احاطہ دن کی روشنی میں بھی

مکمل ناول





Scanned with CamScanner

جانے کے بعد یہ جگہ بھی ویران ہو گئی۔ اب چپا اور چنبیلی کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھتی ساری دیوار پر مرونی سے لپٹی رہتیں مگر کوئی قدر شناس ہاتھ ان کو سنوارنے نہ آتا۔

یہ احمد علی کا گھر تھا جو انہوں نے اور صفیہ بیگم نے بڑی محبت و محنت سے بنوایا تھا۔ اس کے سنوارنے میں صفیہ بیگم دن رات جٹی رہتیں۔ ان کے محبت بھرے آشیانے میں دو پھول کھلے تھے مہر اور مینا کی صورت میں تو انہیں لگا کر ان کا گلشن محبت مکمل ہو گیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ بہار کا ایک خوب صورت دن تھا۔ جب وہ میاں بیوی مہر کے اسکول میں اس کا رزلٹ لینے جا رہے تھے۔ تین سالہ مینا سوئی ہوئی بھی ملازمہ کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ دونوں ہنستے مسکراتے بائیک پر نکلے اس دن گاڑی خراب بھی مگر احمد علی کی پرانی بائیک موجود بھی سو دونوں میاں بیوی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک موٹر مڑتے کسی گاڑی نے ٹکر ماری۔ صفیہ اچھل کر سڑک پر گریں اور ان کا سر فٹ پاتھ پر پڑے زور سے لگا جبکہ احمد علی بائیک کے ساتھ ٹھہرتے ہی چلے گئے۔ گاڑی والا موقع واردات سے بھاگ نکلا۔ راہ چلتے لوگوں نے ہی انہیں ایسبیلنس میں ہسپتال پہنچایا مگر سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے صفیہ جانبر نہ ہو سکیں اور راستے میں ہی دم توڑ گئیں۔ البتہ احمد علی شدید زخمی حالت میں بے ہوش تھے۔

ان کی جیب سے نکلنے والے کارڈ کی مدد سے ان کے شوروم فون کر کے ان کی حالت کی اطلاع دی گئی۔ آدھے گھنٹے میں ہی ان کے چھوٹے بھائی آگئے۔ ان کی فوراً سرجری کر دی گئی اسی دوران خاندان بھر میں صفیہ کے انتقال کی خبر کر دی گئی اور جب روٹی روٹی سی مہر کو چچا اسکول سے پک کرنے آئے تو وہ اپنی ثرائی سنہالے حیران سی بابا، ماما کے بارے میں سوال کرتی رہ گئی مگر محسن کے وسط میں بھی چارپائی پر گھن میں لپٹی صفیہ کو سکون سے لیٹا دیکھ کر

آٹھ سالہ مہر گم سم رہ گئی۔

وہ وقت بہت کڑا تھا احمد علی کے بغیر ہی صفیہ کی تدفین کر دی گئی تھی۔ وہ ابھی تک آئی سی یو میں تھے تین سالہ مینا کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ماں کو ڈھونڈتی بکارتی۔ چچی پہلے تو ازراہ مروت اس کو بہلانے کی کوشش کرتی رہیں پھر بے زاری سے اسے ملازمہ کے حوالے کر کے چلی گئیں۔ ملازمہ کے ساتھ اس کو بہلاتے ہوئے مہر بھی بے اختیار رونے لگتی۔ ملازمہ ترس سے ان دونوں بچیوں کو چھتکتی اور گلے سے لگا کر چپ کروانے کی کوشش کرنے لگتی۔

وقت کا مرہم یقیناً ہر گھماؤ بھر دیتا ہوگا۔ مگر مہر کی زندگی سے حادثہ ایک آکٹوپس بن کر چٹ گیا۔ احمد علی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر آ تو گئے مگر ان کی کمر کا نچلا حصہ سخت متاثر ہوا تھا جس کی وجہ سے چلنا پھرنا دو بھر تھا ان کے لیے۔ ان کے چھوٹے بھائی انور علی نے اپنی فیملی سمیت اپنے چھوٹے سے گھر سے ان کے ہاں شفٹ کا فیصلہ کیا انور علی ایک ناکام انسان تھے۔ چھوٹی موٹی نوکری کرتے پھر چھوڑ دیتے۔ تر کے میں ملی جائیداد بیچ کر کھیا چکے تھے۔ کچھ بیوی بھی عیش پسند اور آرام طلب تھیں سواب مشکلوں سے گزارا کرتے پھرتے تھے۔ ایک دو کمروں کا اپنا ذاتی ٹھکانہ سا گھر تھا سو یہاں آنا ان کی لاٹری کھلوا گیا تھا جب اتنے روشن اور شان دار گھر میں آنے کا موقع ملا تو بھول چچی کے عیار ذہن نے خود جوڑ توڑ شروع کر دی۔

تر کے میں ملی جائیداد سے احمد علی نے یہ گھر اور بڑا سا الیکٹرونکس شوروم کھولا تھا۔ اوپر سے صفیہ بھی گھر گراہستی کی ماہر اور سلیقہ مند تھیں۔ سو یہ گھر زمین خرید کے اپنی مرضی و پسند کے مطابق انہوں نے بنوایا تھا۔ وہ شروع سے ہی مختاری اور ترقی پسند ذہن کے مالک تھے سوا اپنی لائف سکیل کر چکے تھے مگر قسمت میں اور ہی کچھ لکھا تھا جو کہ بہت عجیب تھا۔ بھول بیگم آتے ہی پورے گھر پر چھا گئیں۔ سب کچھ اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ پرانی ملازمہ کو چھٹی دے دی گئی اور ایک نئی

ملاؤ منہ کھلی گئی۔

☆☆☆

الور علی کو بھی وقتاً فوقتاً برین واش کر کے انہیں تقریباً اپنی منگی میں کر کے اب وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کروانے لگیں۔ چار سالوں میں ہی سارا گھر کاروبار ان کے کنٹرول میں چلا گیا۔ احمد علی بے بس سے ہو گئے۔ الور علی نے شروع شروع میں بھائی کے علاج پر کچھ توجہ دی مگر اب مناسب علاج اور ورزش نہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ چل پھر نہیں سکتے تھے اور اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے ان کے قابل اعتبار ملازمین کب کے قاریغ کر دیے گئے تھے۔ علاج کے نام پر اب وہ ڈھیروں دوائیاں آتی تھیں جنہیں وہ کھاتے تھے بتول بیگم تو اس کے بھی خلاف تھیں مگر شاید اندر کچھ خون کی کشش باقی تھی کہ اس معاملے میں الور علی نے ان کی ایک نہ سنی۔ نیچے کے پورشن میں بڑا روشن کمرہ بتول بیگم کا بیڈ روم بن گیا جب کہ دوسرا بڑا کمرہ ان کی لاڈلی بدتمیز بیٹی نرمن کا تھا۔ وہ اتنے بڑے کمرے میں اکیلی ہی رہتی تھی بتول چچی کے۔

”اکھوتی ہے نا، اس لیے کسی کی شراکت داری اسے پسند نہیں۔“ یہ کہتے وہ بھول جاتیں کہ خود وہ دو کمروں کے عام سے کمرے اٹھ کر آئی تھیں۔

اوپر کے پورشن میں دو کمرے ان کے بیٹوں نے بانٹ لیے۔ گھر کا سارا انتظام ہی الٹ پلٹ گیا۔ ان کے تینوں بچے بہت شور مچاتے اور لڑنے کے عادی تھے۔ نرمن بات بات پر چچی روتی رہتی گوکہ مہر سے تین سال چھوٹی تھی مگر نہایت تک چڑھی اور بدتمیز تھی۔ زندگی گوکہ مشکل تھی مگر ایسے میں احمد علی کی اکھوتی بہن الفت بھی سسرال سے لڑتھکڑ کر اپنے تینوں بچوں کو لے کر ادھر مستقل ڈیرے ڈالنے آ گئیں۔ بتول چچی کو تو آگ ہی لگ گئی مگر الفت بھی اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔ ان کو سنانے کے لیے علی الاعلان بولتی رہتیں۔

”بھئی، میرے تو گے ماں جائے گا کمرہ۔“

جب پائے لوگ میٹ کر سکتے ہیں (ایسے میں بطور خاص بتول چچی کو دیکھا گیا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئیں) تو میرا تو پورا حق بنتا ہے۔ ادھر رہوں گی تو اپنی پیاری بھتیجیوں کا خیال بھی رکھوں گی اور نظر بھی کہ واقعی خدمت ہو رہی ہے میرے بھائی کی یا صرف دکھاوا ہو رہا ہے۔ سچ بھائی صاحب! چھ سال سے مراد پاہر گئے ہوئے ہیں۔ پلٹ کر نہیں پوچھا کہ زعمہ ہو یا مرگئی ہو۔ میں ان کے گھر والوں کی کوئی خادمہ بھی جو دن رات ان کی خدمت کرتی رہتی۔ بس اس دفعہ مراد کے فون کرنے پر میں نے صاف صاف اپنا فیصلہ سنایا کہ میں تو اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہوں بچوں کو لے کر اور اس وقت تک وہیں رہوں گی جب تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر لیتا۔ اگر اسے اپنے بچوں سے پیار ہے تو ہمارے ویزے بھجوا کر ہمیں بلوالے ورنہ بصورت دیگر میں اپنے بھائی کے گھر رہوں گی۔ کیوں بھائی صاحب؟ میں نے ٹھیک کہا نا؟ نان اسٹاپ بولتے انہوں نے رک کر خاموش بیٹھے احمد علی سے بڑی لگاؤ سے پوچھا تو وہ بس پھٹکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے کہا بولتے؟

”اب دیکھیے گا میں آگئی ہوں نا تو آپ کی خوب خدمت کروں گی۔ دلوں میں بھلے چلے ہو جائیں گے۔ اور میری بچیاں، میری جگر گوشیاں“ انہوں نے باس کھڑی مینا گوکس کر گئے لگا یا وہ بے چاری کسمپاس گر رہ گئی۔ بتول بیگم کالی پی ہائی ہونے لگا تھلہ دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔ چار سالوں میں بھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ اب اپنے مطلب کے لیے بی بی بنو آئیں ان کے تاثرات سے بے نیاز الفت اپنی ہانکے گئیں اور بارہ سالہ مہر کے دل میں ہول اٹھتے رہے وقت نے شعور کی میٹھی جلیاں جلد ہی طے کر وادی تھیں۔ سوانے والے دلوں کا نقشہ بخوبی نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو کمروں پر خوب گرما گرمی اور لے دے ہوئی آخر کار پھوپھو نرمن کے کمرے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی گئیں۔ نرمن ماؤں چچا کی روٹی تھی۔ بتول چچی نے بیٹوں کو ایک کمرے میں کر کے

نرمین کو کمرہ دلوا تو دیا مگر نرمین جو زردھی تھی۔ پھوپھو اس کے واویلے پر منہ مٹائے سناتی رہیں۔
 ”اتنی سی بچی ہے لیکن ہے پوری فتنی پڑے کمرے پر قابض ہوئی بیٹھی تھی اور اب دیکھو کیا طوفان اٹھارکھا ہے ہونہہ!“

اسد کو معاذ اور باہر کے کمرے میں زبردستی سیٹ کر دیا گیا۔ یوں یہ گھبراتے لوگوں اور مختلف حرا ج کے لوگوں کی وجہ سے ہر وقت طوفان کی زد میں آتی کسی کی طرح رہنے لگا۔

مہر کو پہلے بہترین اسکول سے نکال کر ایک ایوریج پرائیویٹ اسکول میں ڈالا گیا تھا اب اتنے لوگوں کے آنے پر خرچ بڑھ جانے کا کہہ کر اسے اور مینا کو سرکاری اسکول میں ڈال دیا گیا۔ احمد علی کی دوائیں بھی دن بدن کٹتی گئیں۔ زردھی کی عجیب موڑ پر انہیں کھڑا کیے۔ ان کا امتحان لینے پر تکی بیٹھی تھی۔ کوئی راہبر تھا نہ سہم بے بسی بیٹھی تھی۔

☆☆☆

”ہیلو ہیلو کیا ناشتا ملے گا؟“ مینا بابا کے لیے ناشتا بنا چکی تھی جب باہر حسب عادت شور مچانا امدد آیا تھا۔ مینا ان سنی کر لی ٹرے میں برتن لگاتی رہی۔
 چچی اپنا اور چچا کا ناشتا بھی اس سے بنا کر اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔ نرمین حسب معمول سو رہی تھی اور پھوپھو اور ان کی صاحبزادیوں کی صبح گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ دونوں بی اے میں دودو سال لگا کر اب گھر میں فارغ بیٹھی تھیں انار ری تھیں۔ سو اس وقت مینا اور مہر کے علاوہ شاید ہی کوئی چاکلٹا پایا جاتا تھا۔ چچی بھی نجانے آج کیسے جلدی اٹھ گئیں۔

مہر اپنا ایم ایس کھل کر چکی تھی اور اب دو سال سے ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھا رہی تھی جبکہ مینا تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ اپنا اور بابا کا ناشتا لے کر جانے لگی۔ جب باہر نے روک دیا۔ ”شنا نہیں تم نے۔ مجھے بھی ناشتا چاہیے“

”تو جا کر اپنی والدہ ماجدہ سے کہہ دیں تاں کہ

آکر ذرا ہاتھوں کو زحمت دے دیں۔ ویسے بھی مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے لگا سا جواب دے دیا۔

”اس وقت والدہ کو ان کے حجرے سے نکلوانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ تم بس مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔ آج میرا ایک ضروری اسائنمنٹ ہے مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔“ باہر ایم بی اے کر رہا تھا۔ سارے بہن بھائیوں میں بس ایک وہی واحد تھا جو پڑھائی میں اچھا تھا۔

معاذ بی اے کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہہ کر چچا کے ساتھ اسٹور پر بیٹھنے لگا تھا۔ رہ گئی نرمین۔ تو اس نے یونیورسٹی میں داخلہ صرف نام پاس کے لیے تھا۔ یونیورسٹی اس کے لیے ایک فیشن پریگم تھی جس میں وہ ہر مہینے کی چائے والی شاپنگ اور نئے نئے سوٹ دکھانے جاتی تھی لہذا جب دل چاہتا تھا جس وقت چاہتا وہ چلی جاتی جبکہ پھوپھو کی بیٹیوں کو پڑھائی سے ذرا براہر بھی شغف نہ تھا۔ دھکوں سے بی اے کرنے کے بعد وہ اب سارا دن گھر بیٹھے موبائل میں لگی رہتیں یا پھر باہر دوستوں کی طرف چلی جاتیں۔

اسد بھائی کو ایف اے کے بعد ان کے والد نے اپنے پاس امریکہ بلوایا تھا سواپ تو غرے اور آسمانوں کو چھونے لگے تھے۔ آخر وہاں کی کمائی کا زعم تھا سواپ تینوں خواتین کے کمرے میں روم ریفریجریٹر کے علاوہ نت نئے سامان کا ڈھیر تھا۔ اور بتول چچی کا رویہ بھی بادل نا خواستہ ہی کسی اچھا ہو گیا تھا۔

”تم یوں کرو یہ سامنے ساس پین پڑا ہے اس میں دودھ چھنی پتی ڈالو اور اہال آنے پر طلق میں اٹریل لو۔ میں کیا کروں جو تمہارے ضروری اسائنمنٹ ہے۔“

بے اختیاری سے کہتے ہوئے وہ ٹرے اٹھائے نکل گئی۔ باہر سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”ہونہہ اپنی بہن صاحبہ سارا دن آرام کرتی رہتی ہے اور کام کرنے کو ہم ہی رہ گئے ہیں۔ ہمارے گھر

میں ہی رہے ہیں۔ ہمارا ہی کھاتے ہیں اور ہمیں ہی ملازموں کی طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے۔“ بابا کے کمرے تک جاتے جاتے وہ بٹے دل کے پھپھو لے پھوڑتی رہی۔

بابا روزانہ کی طرح سرہانے سے لپک لگائے نیم دراز تک پڑھ رہے تھے۔ اپنی اس مصوم اور جذباتی قدرے دلیر بنی کو یوں بڑبڑاتے دیکھا تو دھیماسا مسکرا دیے۔

”مچلے بابا، آئیں گرم گرم ناشتا کریں۔ جلدی جلدی پھر مجھے کالج کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

”تایا ابو کو ضرورت نہیں جلدی جلدی کرنے کی کیونکہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے سوا سے ہی کرنے دیں۔ ہم تو درویش لوگ ہے ناں۔“ بابا ڈھیٹ بنا پیچھے پیچھے ہی آگیا تھا۔ اور اس کو چڑانے کو شیطان پر زور ڈالتے ہوئے بابا کے پاس براجمان ہو گیا۔

”تمہارا مطلب ہے میں شیطان ہوں؟“ اس نے اسے گھورا تھا۔

”میرا مطلب تھا کہ ہم درویش ہیں میں اور تایا ابو کیوں تایا ابو؟“

اس نے ہاتھ اٹھا کر معصومیت سے بابا سے تصدیق چاہی وہ مسکرا دیے۔

”جتنی یہ تو میری چھوٹی پری ہے اور ہم اس کا ہر حکم مانتے ہیں۔ ناشتا تو جلدی کرنا پڑے گا۔“

اس کا پھولا سرخ چہرہ محبت سے دیکھتے ہوئے بابا نے اس کی سائیڈ لی تو وہ ذرا مسکرائی۔ بابا نے ٹرے میں رکھا کپ اور سلاکس اٹھالیا۔

”ارے ارے، رکھو اسے، یہ مہر کے لیے ہیں۔ تم سب کو تو بس تیار لو الہ کھانے کی عادت ہے۔“ اس کا جملہ بہت سچ تھا۔

”اوہہ مینا۔“

اس کے لفظ اعزاز والفاظ پر بابا نے تنبیہ کی۔

”میں کچھ لفظ تو نہیں کہہ رہی بابا۔ جائے اور اپنی بہن یا والدہ صاحبہ سے کہہ کر ناشتا بنوائے۔ ہم کیا

ان کے لو کر گئے ہیں۔

”رہنے دیں تایا بابا۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہے۔“ بابا بڑے مطمئن انداز میں بغیر ہرمانے کھائے جارہا تھا۔ بابا کو اس کے انداز پر تاسف ہوا کہ بابا سب سے بہت مختلف تھا اور ان سے بہت محبت کرتا ہے مینا کا پارہ اس کے انداز پر ہائی ہوا جارہا تھا۔

”بابا کے بچے۔۔۔۔۔“

”انہیں بھی پلیز کھلا دو۔“

وہ اتنا بدجست بولا کہ پہلے تو وہ کبھی ہی نہیں ہونقوں کی طرح اسے دیکھ کر رہ گئی مگر جب کبھی تو سخت کہنے ہی والی تھی کہ مہر تیار ہو کر آگئی۔

”ارے واہ آج تو بڑے لوگ نظر آرہے ہیں۔“

”بڑے لوگ تو آپ ہیں۔ جاب لگنے کے بعد ہم کہاں نظر آتے ہیں آپ کو۔“ وہ جواباً بولا تھا۔ مہر مسکرا دی پھر بابا کی طرف مڑی۔

”بابا! آپ ناشتا کریں تو میں میڈیسن دے دوں آپ کو۔“

مینا اس دوران جیسے سے منہ پھلائے اپنا کپ اٹھائے سائیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔ بابا نے سٹائش و احرام سے مہر کو دیکھا وہ بہت دھیمے مزاج کی شا کر طبیعت کی تھی۔ بہت فرض شناس اور محنتی، مینا سے الٹ مکمل مزاج۔

”میں لے لوں گا تم آؤ ناشتا کرلو، دیر ہو رہی ہے جہیں۔“ بابا نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا۔

”سوری مہر، آپ کی چائے میں نے پی لی۔“

بابا معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے سہولت سے کہہ کر سلاکس اٹھالیا۔ بابا نے چائے دانی دیکھی تھوڑی سی چائے باقی تھی۔ پھر اپنے کپ کو دیکھا آدھا کپ بھرا ہوا تھا انہوں نے چائے دانی سے چائے اپنے کپ

نیں اٹھیل کر اسے چھادی اور محبت سے پوچھے۔

”سو کھے سلاکس طاق میں پھنس جائیں گے۔“

”مہر بابا کی چند دکانیں ختم ہیں آپ واپسی پر لے آئیے گا۔“

مینا بابا کو نظر انداز کیے دروازے پر چہ نکال کر مہر کو تھمانے لگی مگر بابا نے ہوا میں اچک لیا۔

”پھوڑیں مہر، میں لے آؤں گا تاپا ابو کی دوا میں مجھے یوں بھی جلدی آتا ہے۔“

”جی..... اور پھر آپ کی والدہ آپ کے تولنے لے لی مگر ساتھ میں ہمیں بھی وہ سنائی گئی کہ آسمند کے ہماری سات چستیں بھی اس احسان کو یاد رکھیں۔“ مہر نے مینا کو گھبراہٹ سے دیکھا مگر اس کی کتر کتر چلتی رہی۔

”میری بات مینا، کسی کے غلوں پر شک نہیں کرتے۔“

”شک؟ بابا شک نہیں۔ میں یقین سے حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ جس کے عملی مظاہرے ہم کئی سالوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ اس کی کڑوی باتیں حالات کی مرہون منت تھیں۔

”تم رہے دو بابا، میں لے آؤں گی۔“ مہر نے لاکھ منع کیا مگر وہ مصررہا۔

”غیریت مت برتن مہر، اور ہاں تاپا ابو! لوگوں سے کہیں کہ مرچیں کم کھایا کریں۔ روز بروز مہنگی ہوتی جا رہی ہیں سو گنتی بھی خوب ہیں۔“ وہ آخر میں بھی اسے چھیڑنے سے باز نہ آیا اور شرارت سے کہتا ہوا چلا گیا۔ پیچھے وہ سگ کردہ گئی۔

☆☆☆

شام کی چائے پر آج لاؤنج میں بڑی رونق تھی پھوپھو اور بتول چچی میں آج کل بظاہر بڑی یگانگت نظر آ رہی تھی اور ایسا خاص خاص موقعوں پر ہوتا تھا پھر جب سے اسد بھائی بھی امریکہ گئے تھے تب سے چچی نے اپنی پالیسی بدل لی تھی۔ اب وہ کھلم کھلا پھوپھو سے محاذ آرائی سے گریز کرتیں مگر باتوں کے پیچھے وار عادت سے مجبور ہو کر گزرتیں بقول ان کے وہ بہت صاف گو تھیں سو منافقت اور سیاست ان سے نہیں

ہوتی تھی جو دل میں ہوتا وہی زبان پر۔ سو آج لاؤنج میں اکٹھی چائے پی جا رہی تھی اور تو اور شبنم ادی زمین بھی اپنے حجرے سے باہر عام رہا یا میں نظر آ رہی تھیں۔ سہا اور سائرہ سر جوڑے فیشن میگزین پر جھکی ڈسکس کر رہی تھیں۔ زمین شالانہ انداز میں صوفے پر نیم دراز اپنے قیمتی اسٹارٹ فون کو ہاتھ میں لیے کھٹا کھٹا انگلیاں چلا رہی تھی۔ تینوں میں اگر دوستی نہ کسی تو ایسی خاموشی بھی نہ کسی تھی اب اوپر کے پورشن میں ہی ہوتی تھیں۔

پچھلے کچھ سالوں میں اوپر دو کمرے خرید تعمیر کرائے گئے تھے ایک نیا کھلا ہوا دار کمرہ تو فوراً زمین چنے لے لیا۔ دوسرے میں یہ دونوں کینٹین شفٹ ہو گئیں کیونکہ بقول پھوپھو کے کہ ان کی رات در یک پڑحالی کرنے سے وہ ڈسٹرب ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا عذرا اب کوئی ان سے پوچھے ایسی کون سی پڑحالی تھی جو گھٹ گھٹ کر بی اے تھرڈ ڈویژن میں کیا گیا تھا مگر اپنا پوچھ کر اوکلی میں سر کون دے سکتا تھا۔ حالانکہ دونوں صاحبزادیاں اب بھی رات گئے تک نیچے والدہ کے کمرے میں ہی پائی جاتی تھیں۔ بابا نے البتہ شکر ادا کرتے ہوئے زمین کے چھوڑے نئے کمرے میں منتقل ہونے میں دیر نہ لگائی تھی۔ معاذ کی اس سے خاص منتی نہ تھی۔

”مینا! ذرا یہ چائے تو گرم کر لاؤ۔“ وہ بابا کے کمرے سے ان کے لیے پانی کا جگ بھرنے لگی تھی مگر چچی نے آرڈر دے دیا دل چاہا کہ کہہ دے زمین بھی یہیں ہے مگر جانتی تھی وہ فضول میں الجھیں گی۔ چائے گرم کر کے وہ بابا کے لیے پانی لے گئی۔

”سنا ہے ریحان بھائی کا وہ امریکا والا ڈاکٹر بیٹا آیا ہوا ہے۔ پرسوں میری ثریا سے ملاقات ہوئی تو بتا رہی تھی۔“ اصل مدعا پر اب آیا گیا۔

”جانتی ہوں میں۔ مجھے بھی فرحت بتا رہی تھی کہ اس دفعہ شادی کی نیت سے آیا ہے۔ جلد ہی ریحان بھائی کے گھر ایک بڑی تقریب رکھی جا رہی ہے۔ سارے خاندان کو بلایا جائے گا۔“ پھوپھو زیادہ

باجر میں۔

”واڈا اس کا مطلب ہے سوئبر رچایا جا رہا ہے پھر تو لوگوں کی تیری دیکھنے والی ہوگی۔“

سیمانے میگزین سے سر اٹھا کر ٹھٹھا مارا۔ سائرہ بھی اس کا اشارہ سمجھ کر چٹنے لگی تھی۔ زمین نے نیکی نظروں سے دونوں کو گھورا۔ دھیان تو اس کا بھی سارا ادھر ہی تھا مگر وہ ہمیشہ ہر ایسے معاملے میں خود کو بے نیاز ظاہر کرتی جیسے اسے پروا ہی نہ ہو۔

”جو بھی رچایا جا رہا ہو، میرا خیال ہے الفت، کیوں نا انہیں دعوت پر بلا لیا جائے دیکھو نا ریحان الور کے سکے تا یا زاد ہیں۔ اتنا حق تو بنتا ہی ہے نا۔“ (ہمارا) فقرہ دل میں دہرایا۔

”تھیک ہے پھر، آج دعوت دیے ڈالتے ہیں۔“ پھوپھو کو ان کی چالاکی کی خبر تو تھی مگر مجبور تھیں۔ ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے وہ الگ سے چھپا کر دعوت نہیں کر سکتی ہیں آخر کو خاندان کی بات تھی۔

”ہاں، رات کو فون کر کے انہیں پرسوں رات کھانے پر بلا لیتے ہیں۔ یوں بھی بنتے کی رات ہوگی۔ اگلا دن چھٹی کا ہوگا سوسب کو سہولت رہے گی۔“

پھوپھو یا ان کی بیٹیاں کون سا پڑھتی یا جاب کرتی تھیں یہاں بھی چچی نے اپنی سہولت دیکھی تو پھوپھو دل ہی دل میں بیچ دتا بکھا کر بظاہر میچو منتخب کرنے لگیں۔ سیمانے اور سائرہ کو اپنے کپڑوں اور پارلر کی فکر لگ گئی۔ زمین بظاہر بے نیاز تھی مگر اپنی انفرادیت کیسے برقرار رکھتی ہے اسے خوب اچھی طرح آتا تھا اسے خود پر بہت زلم تھا۔

یوں بھی وہ سائرہ، سیمانے سے زیادہ اسٹائلش اور حسین تھی کھلا پیسہ ہاتھ میں تھا سو اس کی پسند خود بخود لا جواب ہوتی تھی اسٹیپ میں کئے بال، چمکتی اسکن اور لمبے کیوکس لگے ناخن، وہ ہر طرح سے اپنا خیال رکھنے کی قائل تھی سو ابھی سے بہت پر اعتماد تھی۔ دو دن بعد کی دعوت کے لیے۔

رات کو دعوت دینے کا فریضہ سرانجام دے دیا گیا اور اگلے دن سے گھر میں ایمر جنسی لگ گئی۔ کام والی کی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ جو کینوں کی لاہروائی کی وجہ سے ڈٹھی مار جاتی تھی۔ اب کوئے کھدروں میں کھس کر گند نکلوا یا جا رہا تھا۔ بازار سے نئے کپڑے لائے گئے جو دروازے سے قطار در قطار آتے ہوئے۔ برآمدوں کی سیڑھیوں میں بھی رکھوائے گئے کیا بیویوں کی سیٹنگ اور پچھلے لان کے لیے عارضی طور پر کھیں سے ایک مالی بلوایا گیا۔ ازراہ تکلف پچھلا احاطہ بھی صاف کر دیا گیا۔

سائرہ اور سیمانے میں بازار اور شام میں پارلر میں پائی جاتیں۔ پھوپھو بینک سے اپنے قیمتی کڑے اور لاکٹ سیٹ بھی نکلوا لائیں آخر امپریشن بھی تو جمانا تھا۔ زمین خاموشی سے اپنے پارلر کا ایک وزٹ کر آئی تو اس کی اسکن چمک رہی تھی۔ بالوں کی ٹریٹمنٹ مینی کیور، پیڈی کیور وہ بہت مطمئن تھی۔ سائرہ اور سیمانے کو کہ بہت خوب صورت نہ تھیں۔ مگر انہیں کم شغل بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ مگر زمین کی طرح طرح دار نہ تھیں۔

ان ساری تیاریوں سے مہربے نیاز اور مینا بے زار تھی کیونکہ زیادہ شامت اس کی آئی ہوئی تھی۔ ملازمہ کے ساتھ لگے رہنے کی ڈیوٹی اس کے سرگی اسی وجہ سے دو دن کالج سے بھی آف لینا پڑا۔ مہر کی مجبوری تھی مگر اس پر بھی اسے خوب باتیں سننے کو ملی تھیں۔ میچو تو سارا کا سارا تھا کادنے والا تھا اور مینا ان دونوں بہنوں کو ہی تھا۔ مہر کالج سے آکر جو کچن میں جتی تو شام کو ہی جا کر فارغ ہوئی۔

”اب بس بھی کریں مہر، کچھ کام اور لوگوں کو بھی کرنے دیں۔“ باہر کچن میں پانی پینے آیا تو پیسے میں نہائی مہر کو دیکھ کر سخت متاسف ہوا۔

”جی..... لوگوں سے بھی جا کر کہہ دیں تاکہ خود آکر رحمت کریں اور ہماری بھی بس کرا دیں۔ اگر اتنی ہمت ہے آپ میں۔“

سلا دسجا کر فارغ ہوئی مینا مہر کے بولنے سے

پہلے تجنی نے گویا ہوئی ناع بابا کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

”بس کام ختم ہی سمجھو باہر۔“

مہر نے اٹھن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اسے

”ہمت کی بات نہ کرو تم مگر میں جانتا ہوں تم لوگوں کے حق میں بولنا۔ تم لوگوں کی زندگی حریہ مشکل کرنے کے مترادف ہے۔“

وہ کہہ رہی رہا تھا۔

”اب کون سی آسان ہے۔ تھوڑی اور مشکل سکی۔ خواری حریہ سکی۔“

اس کے لہجے کی پیش ویسے ہی تھی۔

”مہر..... یہاں خود سے کسی کو بھی احساس ہونے والا نہیں۔ جب تک آپ خود احتجاج نہیں کریں گی۔ خود کو ویلیو نہیں دیں گی۔ ہر حکم کو خاموشی سے بجالاتا بھی تو ظلم ہے۔“ مینا کی مٹی کو نظر انداز کیے وہ مہر سے مخاطب ہوا۔

”بولنے کا انجام یا احتجاج کرنا سوائے خواری کے کچھ نہیں۔ سوچ رہی تھی بہتر ہے۔“ مہر کے تھکے لہجے پر مینا سر جھٹک کر رہ گئی۔

”ب کام ہو گیا ہے تو تم دونوں اب جاؤ۔“

”ہیں..... تم کب آئے؟“

بتول چنی تیز بولتی کچن میں داخل ہوئیں۔ مگر باہر کو دیکھ ٹھک گئیں۔ وہ صبح کا نکلتا تھا۔ ان کے مکتوک انداز پر بھی باہر چہرے پر سخت تاثر لیے چپ اکھڑا رہا۔

”جی چنی، سب کام تقریباً ہو گیا ہے۔ بریانی دم پر ہے۔ کڑا ہی تیار ہے۔ زکسی کو فٹے ریڈی ہیں۔ کتاب صرف تلنے ہیں۔ فٹس بھی فراہم کر دی ہے۔ سلاؤ وغیرہ بھی تیار ہے۔“

وہ مہر کو سننے کے بجائے باہر کو ہی مگھوتی رہیں۔ مگر دے لہجے میں ٹوک کر بولیں۔

”ٹھیک سے ٹھیک ہے۔ اب تم دونوں جاؤ۔“

باقی کا کام بچیاں دیکھ لیں گی اور ہاں۔ مہمانوں کے

سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے اور اپنے ابا کے لیے کھانا نکال لینا۔ دوپہر کا سالن فریج میں پڑا ہے۔“

”باقی رہ گیا کیا ہے امی؟ جو ”بچیاں“ دیکھ لیں گی۔“

مینا جو چنی کی خود غرضی پر دل ہی دل میں سلگ رہی تھی۔ باہر کے طہریہ لہجے پر ایک ٹیکسی نظر ڈال کر رہ گئی۔

”باقی سو کام ہوتے ہیں اور یہ تمہیں کیوں ہمدردی کا بخار چڑھا رہتا ہے کیوں اتنا درد اٹھ رہا ہے۔ صبح سے غائب ہو اب۔ آئے ہو تو ادھر چپک کر بیٹھے ہو۔“

انہیں ان دونوں کے سامنے اس کا طہریہ لہجہ کھلا تھا۔ سو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئیں۔ مہر نے بھی یہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا جانتی تھی کہ اب اس کو بھی رگیدا جائے گا۔ کمرے میں آئی تو واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ یقیناً اب پنا دیہ تک پانی کے نیچے کھڑی ہو کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لی گی۔

☆☆☆

دعوت حسب خواہش بہت شان دار رہی۔

ریحان بھائی اپنی مٹی کے ساتھ آئے تو پھوپھو بطور خاص براڈ ڈسٹ اور زیورینے خود کو معتبر سمجھ رہی تھیں تو دوسری طرف۔ بتول چنی کی بھی تیاری کچھ کم نہ تھی۔ صفوان ان کی توقع سے زیادہ شان دار تھا۔

چھوٹا والا بھی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ پڑھ رہا تھا۔ ڈشنگ تو وہ بھی تھا۔ ایک سی بی بی جی جو فائن آرٹس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ بڑی الگ تھلک سی بی بی تھی۔

سیما اور سائرہ جو مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آئی تھیں۔ اس سے کچھ دیر تو خوش اخلاقی بھانے کی کوشش کرتی رہیں مگر اس کے لیے دیے انداز پر منہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ دونوں معزز خواتین لڑکوں کی پر سنائی دیکھ کر دل ہی دل میں جوڑ توڑ کر کے خوش ہوئی رہیں۔ نرمین البتہ کسی

”بچی کو غلط چھی ہوئی ہوگی ورنہ بتول کیوں منع کرے گی۔“

چچا اب کھیا کر لاکھ وضاحت دیتے کمرے کے کین کی حالت اور ٹرے میں موجود کھانا چچ چچ کر اعلان کر رہا تھا کہ یہاں ان لوگوں کو کس درجے پر رکھنے کی روایت ہے۔ کئی لمحے خاموشی کی نظر ہو گئے۔ دل ہی دل میں تاسف کا شکار ریحان بھائی بڑی مشکل سے سنبھلے پھر زبردستی بٹاشت سے سکرائے مہر سے اس کے بارے میں پوچھتے رہے۔ مینا اپنی بات کے انجام سے بے فکر ہو چکی تھی۔ سو بڑے اطمینان سے ٹرے اٹھا کر کمرے میں بیٹھی ٹھنڈا کھانا رغبت سے زہر مار کرتی رہی۔ چچا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی کو نے میں یاریت میں منہ چھپا کر بیٹھ جائیں۔ غصہ تو انہیں مینا کے ساتھ بتول پر بھی آ رہا تھا جو ہر ایسے موقع پر انہیں ذلیل کروانے کا اہتمام بھد شوق کرواتی تھیں کیا تھا اگر وہ دونوں بھی کھانے میں شریک ہو جائیں۔ اب جانے خاندان بھر میں کیا کیا چہ میگوئیاں ہوں گی اور اس بات کو کس ڈھنگ سے لیا جائے گا۔ چچی کو اندر ہی اندر بڑی بے چینی ہو رہی تھی۔ سو وہ بھی آ موجود ہوئیں۔

”چلیے مابھائی صاحب، وہاں پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔“

ان کا شرمیلی ٹپکا تالچہ ایسے موقعوں پر خوب ہوتا تھا جہاں سے نفع کی امید ہو۔ اب تو بات ان کے شان دار بیٹے کی تھی جسے دل میں وہ اپنے داماد کا درجہ دینے کے بعد اس پر اپنا حق سمجھ رہی تھیں۔

”آپ چلیے بھابھی، میں آتا ہوں۔“ ان کے لہجے میں کچھ نیا سا تھا۔ کیا؟ وہ سمجھ نہ سکیں۔ سو چچا کے اشارے پر پنا چارواہیں مڑنا پڑا۔ نظر سامنے بیٹھی مینا پر بڑی۔ جو بڑے اہتمام سے کھانے کے بعد اب ٹرے کو سائیڈ پر رکھ رہی تھی۔

”یہ کیسی روز تو مغرب کی اذان کے ساتھ کھانا کھا لیا جاتا ہے اور آج؟ یقیناً ہمدردی حاصل کرنے کا

ادھما طریقہ ڈھونڈا ہے۔“ ٹرے میں رکھی پلیٹ کے اندر غنڈے شکل سے عجیب سے لگ رہے تھے۔ دل پسند نتائج اخذ کرنے میں انہیں یوں بھی ملکہ حاصل تھا۔

جاتے وقت ان کا بگڑا موڈ مہرو نے بھانپ لیا اور دل ہی دل میں آنے والی محاذ آرائی کے لیے تیار ہونے لگی۔ یہ دعوت شروع جتنے جوش و خروش سے ہوئی تھی۔ اختتام اتنا ہی سرد ہوا۔ وہ لوگ جلدی چلے گئے۔ جاتے وقت ریحان بھائی بہت چپ چپ سے لگ رہے تھے۔ مینا نے کچن سینے سے صاف انکار کر دیا۔ سو مہر کو خاموشی سے سب کچھ خود کرنا پڑا۔

بقیہ خوانین چونکہ بہت تنگی ہوئی تھیں سو تھکن اتارنے جلد ہی کمرے میں چلی گئیں۔ عجب ہوئی کمرے کے ساتھ مہر جب کمرے میں پہنچی تو مینا کا خالی بستر اس کا منہ چڑا رہا تھا اس نے کمرے سے ملحقہ دھرا دروازہ کھولا تو مینا بابا کے کمرے میں فرش پر بستر لگائے سوئی ہوئی نظر آئی۔

اکثر جب بھی بابا کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو

مینا ان کے کمرے میں ہی بستر لگاتی۔ اسے بابا سے

عشق تھا۔ ماما کو کھونے کے وہ ابتدائی چند تکلیف وہ

سال جب وہ کسی سے پہلتی نہ تھی تب بابا کی آغوش

میں جاتے ہی وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر مطمئن ہو کر

سو جاتی تب سے بابا کے ساتھ اس کا لگاؤ بہت بڑھ

گیا تھا۔ مہر نے دیکھا بابا دوا کے زیر اثر سو چکے تھے۔

وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ اس کی زندگی کا چوکور جب

سے نکون میں بدلا تھا تب سے اس کی ذات اس کی

ظاہری شخصیت کے نئے دب کر رہ گئی تھی۔ خود کو

چھپانے کا ہنر بڑا فن سمجھ کر کتنا تکلیف دہ اور صبر آزما

کا بھٹا ہوا ہاتھ سے چھوٹ کر سرور میں۔ ہم ہو گیا۔
بابا نے بے چینی سے کھڑا ہونا چاہا تو درود کی ایک تیز لہر
ان کے کندھوں سے ہوئی ہوئی ٹانگوں۔ تک چلی گئی
وہ جیسے ہانپ سے گئے۔ ”اچھا اگر تمہیں شوق نہیں
ہے تو کیوں ابھی کہا کہ میں نے منع کیا تھا تم لوگوں کو
ان کے سامنے آنے سے۔“

رات چچا کی باتوں کا زہران کے دماغ پر چڑھا
ہوا تھا۔ چچا نے منع بھی کیا تھا کہ اب اس معاملے کو
زیادہ اچھا لے کر ضرورت نہیں نہ ہی مینا سے پوچھ کچھ
کرنے کی اور یہ کہ آئندہ اس قسم کی کوئی ہدایت دینے
کی بھی ضرورت نہیں مگر وہ یہ سب کیسے برداشت
کر سکتی تھیں کہ سورات سے ہی جلتے توے پر ناچ رہی
تھیں۔

”تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔ کیا آپ نے منع
نہیں کیا تھا۔“

اس نے بڑی بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔ دل جو کل سے بے عادت پر
آباد تھا اب حدیں پار کرنا چاہتا تھا۔ ہر ناروا سلوک
وہ اپنے ساتھ تو برداشت کر سکتی تھی مگر کل جب سارا
دن کچن کی نذر کر کے وہ بابا کے کمرے میں پہنچی تو
تکلیف سے زرد پڑے بابا کے چہرے کو دیکھ کر ایک
آتش فشاں سا تھا جو اس کے اندر پھٹ پڑنے کو بے
تاب ہو گیا۔ ان کے عزت مآب مہمانوں کی مہمان
داری وہ کریں اور ان کا بے بس ولا چار باب تکلیف
سے پڑا تر پتا رہے جو اب اس بیمار شخص کو اچھا کھانا بھی
نہ ملے۔

”ہاں تو میں نے منع کیا تھا تمہیں کیا باز دے سکتی ہو
تم میرا۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری بدکردار بہن کا سایہ
بھی میری ہنسی اور اس کے آنے والے مستقبل پر
پڑے۔ دنیا جانتی ہے۔ سارا دن لور لور گھومتی پھرتی
تھی۔ نبھانے ایسا کیا کارنامہ سرانجام دیا مگر مہ نے کہ
انگوں نے بھی انکار کھلا بھیجا۔ بی بی ہمیں کوئی شوق
نہیں کہ دوسروں کے گناہ اپنے سر پر لادیں۔ معاف
رکھو ہمیں۔“

تک ہی جا کر دب گئی۔ مہر مار کیٹ، بابا کی میڈلین
لینے گئی تھی۔

مینا صبح سے ہی بابا کے پاس تھی۔ چچی کے ہزار
بلاؤں پر بھی وہ باہر نہ نکلی۔ اکثر وہ ایسے ہی ڈھیٹ
بن جاتی تھی۔ ابھی بھی وہ بابا کے کمرے سے جک
لیے پانی لانے نکلی تھی لہذا چچی کو سنہری موقع مل گیا۔
پھوپھو اکثر ایسے موقعوں پر غورل ہو جاتیں۔ بظاہر
خاموشی سے لی وی دیکھتے ان کے کان تو ادھر ہی لگے
ہوئے تھے۔

”اور یہ بھی سنو الفت! اس میسنی کے کارنامے
روز تو شام ہوتے ہی باب بیٹیاں کھانا کھاتی ہیں مگر
کل بطور خاص صرف ہمیں شرمندہ کروانے نچا
دکھانے کو ریحان بھالی کے سامنے وہ باسی ٹھنڈا کھانا
کھایا گیا۔ انہیں جتانے کو کہ ان کے ساتھ کتنا برا
سلوک کیا جاتا ہے۔“ اصل مدعا یہ تھا سو بھڑاس نکلتی
گئی۔

”چہ چہ بری بات مینا! اب تم ہمیں خامد ان
میں یوں رسوا کرواؤ گی کیا کی ہے آخر تم لوگوں کو
یہاں؟ میں بھی سالوں سے اپنا گھریا چھوڑے صرف
تم لوگوں کی خاطر ادھر بڑی ہوں۔ سچ ہے نیکی کا تو
زمانہ ہی نہیں رہا۔ بلکہ نیکی برباد گناہ لازم۔“ الفت
پھوپھو کی اس دروغ گوئی پر اس کا دل چاہا کہ انہیں
کھری کھری سنا کر آئینہ دکھا دیے کہ وہ کس لیے اور
کیوں ادھر پڑی ہیں مگر جانتی تھی کہ جھوٹوں کو سچ کا
آئینہ دکھانا وقت کھینا کرنے کے مترادف ہے۔

”کل بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو ان کے
ساتھ لگ کر میں اور مہر کھانا نہ کھائے دوسرے ہمیں کیا
پتا تھا کہ آپ کے معزز مہمان ادھر ہی چلے آئیں گے
ورنہ بطور خاص جتانے کا میرا ارادہ نہ تھا نہ ہی مجھے
ایسا لگے شوق ہیں۔“

منبط ٹوٹ ہی گیا۔ سلگتے لہجے میں انہیں کھرا
جواب دے کر وہ بابا کے کمرے کی طرف جانے ہی لگی
کہ چچی نے بازے پکڑ کر ایک جھکے سے اسے کھینچا پانی

ان کی زہر بھری باتیں ان کا کھیل لہجہ مینا کا چہرہ ضبط کے مارے سرخ ہو گیا اور اندر کمرے میں لاچار پڑے بابا جیسے صدیوں کے بیمار ہو گئے۔

ان کی پاکیزہ، پھول سے زیادہ نازک جی جی جس کی ہمت جس کے ضبط اور جس کے صبر کے وہ قائل تھے آج۔ ریک الزامات کی زد میں تھی اور وہ اس کے حق میں بول بھی نہیں پارہے تھے۔ پھر وہی تکلیف دہ قصہ دہرایا جارہا تھا۔

”خبردار..... ایک لفظ بھی مزید مت بولے گا۔ میری بہن کے کردار کو جانچنے والی آپ کون ہوتی ہیں۔ کس حق سے آپ اس پر ایسے گھٹیا الزامات لگا رہی ہیں۔“ مینا آج سارے لحاظ بھول گئی۔ سارے ڈر سارے خوف جیسے جادو کے اثر سے غائب ہو گئے۔ بلند ہوئی آوازوں پر سب ہی فرداً فرداً لانا لنگھنے میں متبع ہوتے گئے۔ بابا نے سائینڈ پر پڑی چٹری کو اٹھایا تھا۔ ان کی طاقت تو چچی کے الفاظ نے تھین گئی تھی۔ وہ بمشکل کھڑے ہوئے ان کی جیٹ اٹھائی۔ اسے ان کی ضرورت تھی۔

”ارے تو وہ کھوٹا کیزہ بابی کے بیبا آواز نیچی رکھو ورنہ زبان گدی سے پھینچ لوں گی۔“

اس کی جیٹ اس کی بے خونی انہیں مزید اشتعال دلا رہی تھی۔ کل اس کی وجہ سے ایک بڑی بازی ان کے ہاتھوں سے نکلنے کا امکان تھا۔ محاف کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔

”اس بھول میں مت رہے گا کہ آپ زبان کھینچیں اور میں چپ کھڑی رہوں۔“

بے خونی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتے اس کا انداز استہزاء تھا۔ یہ جملہ تھا کہ جلتی پر تیل۔ پھوپھو جی میں کرتی رہ گئیں اور چچی کا جواب اٹھا ہاتھ اس کا منہ لال کر گیا۔ سیماسائزہ حق وق رہ گئیں جبکہ زمین کے چہرے پر ایک استہزیہ سے پھر پور مسکراہٹ لگی تھی۔ جواباً وہ پھر کے آگے بڑھی تھی مگر بابا کو کمرے کے دروازے پر گرتے دیکھ وہ بے ساختہ بھاگی۔

”بابا“ اس کی وحشیانہ چیخ گھر کے درود یوار

ہلا گئی۔ بڑی مشکلوں سے وہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے مگر آگے کا منظر دیکھ ان کی رہی سہی ہمت بھی نہ ہو گئی۔

”بابا..... اٹھے بابا..... پلیز..... بابا“ بے بسی سے روتی وہ انہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔ تکلیف سے زرد پڑتے چہرے۔ بچنے ہوئے ہونٹ، پسینے سے تر چہرے پر کسی مرونی سی چھائی ہوئی تھی۔ مینا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ اس کی روتی کر لائی صداؤں پر باہر جو اپنے کمرے سے ابھی ابھی باہر نکلا تھا بھاگا ہوا آیا۔

بتول چچی سراپیدہ سے ان کی حالت دیکھ رہی تھیں۔ پھوپھو اور باقی حاضرین بھی جیسے ساکت رہ گئے تھے۔ باہر کو بصورت حال کا اندازہ ہو گیا تو اس نے فوراً روتی مینا کو تختی سے ہٹایا اور بے ہوش پڑے احمد علی کو بازو میں اٹھالیا۔

”بابا کے کمرے سے فوراً گاڑی کی چابی لاک۔“ گیٹ کی طرف بھاگتے اس نے زمین کو آواز دی۔ سارے منظر میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ الفت پھوپھو بھی اس کے پیچھے لگیں۔ زمین چابی لے آئی تو مینا اٹھ کر گاڑی کی طرف بھاگی۔ باہر بابا کو اب احتیاط سے پھپھلی سیٹ پر لٹا رہا تھا۔

”میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ میں بابا کے ساتھ جاؤں گی۔“ آنسوؤں بھری آنکھوں اور آنسوؤں سے تر چہرہ مینا نے اس کا بازو اٹھا آمیز انداز میں کہا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ چند لمحوں میں ہی گاڑی گیٹ سے نکل کر اوچھل ہوئی۔

”اللہ توبہ..... بھابھی..... تمہیں اتنا بنگامہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور سے تم نے تو ہاتھ اٹھا کر حد ہی کر دی۔“ چچی بڑی سنگ دل عورت ہو تم۔ اللہ بھائی صاحب کی خیر کرے۔“

یوٹرین لینے میں الفت پھوپھو کو کمال حاصل تھا۔ انہیں سنائی وہ ہوتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ چچی بتول کچھ کہنے کی کوشش میں بس منہ کھول کر رہ گئیں۔

☆☆☆

یہ حادثہ شاید اس کی کہانی کا نقطہ آغاز تھا یا پرانی

کالطہ انجام مہر مجھ نہی۔ باہر ہوئی ن ن باریں کو
 نکلتی۔ مہراں دلوں کو سوچ کر ابھی تک خوف زدہ تھی۔
 فضا میں سبزے کی مخصوص مہک رہتی تھی۔ کھڑکی سے
 گزرتے نظارے۔ اس کے ارتکاز میں کسی نہ لاسکے
 تھے۔ بابا کابی بی انتہائی جد تک گر گیا تھا۔ ہارٹ بیٹ
 انتہائی مدھم ہوئی جارہی تھی۔ وہ قیامت کے دودن جو
 بابا نے آئی سی یو میں گزارے، اس کے لیے کسی
 قیامت سے کم نہ تھے سجدے میں گری وہ دونوں اللہ
 سے گڑگڑا کر اپنے بابا کی زندگی مانگتی رہیں۔

اس دوران کون آیا کس نے کیا کہا؟ اسے کچھ
 پاد نہ تھا وہ ہر چیز سے بے نیاز۔ بس اپنے بابا کی زندگی
 مانگتی رہیں۔ باہر نے ساری بھاگ دوڑ کی۔ وہ انہیں
 رک کر نسکی دیتا پھر بے بسی سے ان کے مردہ چہرے
 دیکھ کر اپنے لفظوں کو بے اثر سمجھ کر چپ چاپ چلا
 جاتا۔ ان دنوں بہت سے کاش اس کے لرد منڈلاتے
 رہتے۔ کاش پاد سب نہ سنتے۔ نہ دیکھتے کاش وہ
 مارکیٹ تک دوڑا میں لینے نہ گئی ہوئی۔ کاش مینا چپ
 رہتی۔ میرے کام تھی۔

جنول چچی کی باتوں کی مار تو وہ ہمیشہ سستی رہی
تھیں مگر ہاتھ کی مار۔ اس کا دل کوئی جیسے شخی میں بیچا
لیتا۔ مینا اس دوران بالکل چپ تھی اس نے مہر سے
کوئی بات نہ کی اور تیسرے دن۔۔۔ پہر کے قریب
جب بابائے آنکھیں کھولیں۔

مہر..... چائے پی لو۔۔۔“ سنبل کی آواز پر اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے گہرا سانس بھرتے کب تمام لیا۔

”گلتا ہے بزم بالکل انجوائے نہیں کر رہی تم اتنی دیر سے باہر نظر نہ جمائے کم مٹھی ہو۔ دو تین مرتبہ میں آواز بھی دی مگر۔ جانتی ہوں تم آنا نہیں چاہتی تھیں مگر یا راب آئی گئی ہو تو انجوائے تو کرو۔“ اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی حسب عادت وہ مان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھی۔

”تم جانتی ہو نا۔ کس وجہ سے انکار کر رہی تھی؟“
اس کے اعجاز پر وہ حیر ہو گئی۔ سنیل اس کی بہترین

﴿پابند شعلہ نومبر 2022 135﴾

نہیں۔ اپنے سارے کام وہ خود انجام دیتیں۔ بابا کی دیکھ بھال گھر کے اضافی کام، استری وغیرہ کچن کی ذمہ داری بلکہ وقت بے وقت کی ذمہ داری اور پڑھائی۔ ان تمام چیزوں کو انہوں نے سچ کرنا سیکھ لیا تھا۔

بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے اب تک وہ یہ سب دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ ایک واحد باپ تھا جو سب سے مختلف تھا۔ حساس اور خیال کرنے والا اور نہ ان کے ساتھ تو ملازماؤں سے بدتر سلوک کیا جاتا۔ ہر عید پر ان کے لیے احسان کر کے سستے کم قیمت لباس آجاتے۔ مگر باقی سب کے کپڑے اور لوازمات دیکھنے سے تعلق رکھتے۔ مینا وہ سوٹ اٹھا کر کام والی کو دے دیتی اور عید بھی پرلے سوٹ میں مڑے سے گزارتی تھی۔ چچی کے جیلے پھو پھو کی ٹیکسی چھیتی لگاہیں۔ کچھ بھی اسے نہ ڈراتے۔

وقت کے ساتھ پتا رہی حقیقت آشکارا ہوتی چلی گئی اور اس کے اندر کئی بھرنی۔

”ہمارے بابا کے پیسوں پر سانپ بن کر بیٹھے سب ہمیشہ کر رہے ہیں اور ہمیں۔ ہمارے ساتھ کسی تیسری درجے کے شہری جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ بابا آپ بولتے کیوں نہیں ہیں؟ یہ سب آپ کا ہے۔ ان پر ہمارا حق ہے مگر ہمیں جتنا جتنا کر یہ کھٹیا چیزیں دی جاتی ہیں۔“

پہلے پہل تو وہ بابا سے ابھرتی رہتی۔ بابا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ جاتے۔ کیسے کہتے کہ اس نیم معذور جسم کے ساتھ وہ کس حد تک ان سے لڑ سکتے ہیں۔ فی الوقت ان لوگوں کا اتنا آسرا ہی کافی تھا کہ ان کی جوان ہوتی بیٹیاں اپنے گھر میں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ تھیں۔

تعلیم جیسے تیسے حاصل کر رہی تھیں۔ آدھ پونے پلیٹ کھا لیتی تھیں۔ مہر جیسے بابا کی بے بسی کو سمجھ گئی وہ مینا کو ڈانٹ دیتی۔

”تم کیوں فضول میں بابا کو مینشن دیتی ہو۔ دیکھتی نہیں کہ ان کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں رہتی۔“

کرتی یہاں جاب بھی کر رکھی تھی۔ اس جاب سے اس کی کئی ضرورتیں بن مانگے پوری ہو جاتیں۔

بابا کی دوائیں ان کی اچھی خوراک، مینا اور اس کے کئی اخراجات جن کو پورا کرنے کے لیے پہلے اسے چچی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پڑتا تھا سو شکر تو چچی نے بھی ادا کیا کہ ان خرچوں سے بھی ان کی جان چھوٹی۔ کالج کی پرنسپل تھوڑے سخت مزاج کی تھیں مگر زندگی کے اتنے سال تک دل لوگوں اور کڑے حالات میں گزارنے کے بعد اسے یہاں ایڈجسٹ ہونے میں دشواری نہ ہوئی۔

چچا بابا کے علاج سے رفتہ رفتہ غافل ہوتے ہوئے دوائیوں کی مقدار بھی کم سے کم ہوتی ضروری تک آگئی۔ محبت کا وہ ابال جو چچا کو شروع میں اٹھا تھا۔ چچی کی برین واشنگ پر رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ کئی مہینے گزر جاتے بابا کا مناسب چیک اپ نہ ہوتا۔ چچا ان کے کمرے میں ہفتوں جھانکتے تک نہ تھے۔ مہر کو ان کی دواؤں کے لیے کئی مرتبہ یاد دلانا پڑتا تب جا کر نیرا احسان جتا کر جو میڈیسن آئیں اس میں بھی ایک دو کم ہی ہوتیں۔ ایسے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مہر کا مقصد ایک اچھی نوکری کا حصول تھا۔ اسے فی الوقت ٹرائل پر رکھا گیا تھا۔

کام زیادہ تھا مگر وہ مطمئن تھی۔ گھر میں کام کے لیے دو دو ملازماں میں تھیں مگر وہ گھر کے کام کم اور پھوپھو اور چچی کے ذاتی کام زیادہ کرتیں۔ اوپری اوپری صفائی کے بعد گندے سندے برتن دھو کر ایک پھوپھو کی خدمت میں حاضری لگوانے چلی جاتی دوسری جوتل چچی کے پٹھے بیٹھے بیٹھے دونوں خواتین کے پٹھے جام ہو جاتے تھے۔ سو خود کو خوب دیوایا جاتا اور ادھر ادھر کی چھٹی خبریں بھی خوب سنی جاتیں۔ ان کی صاحبزادیوں کے ذاتی کام بھی وہ انجام دیا کرتیں۔ سو گھر کی طرف سے غفلت پر انہیں ڈانٹا نہ جاتا۔ کھانا شروع میں تو جیسے تیسے کھالیا تھا مگر جو مہر ذرا سمجھدار ہوئی۔ ذمہ داری خود بخود اس کی بعد میں مینا کی بنتی گئی۔ کپڑے ملازما میں دھوئی تھیں مگر مہر، مینا کے

پھر یوں ہوا کہ وہ بظاہر چپ ہو گئی مگر اب بھی کبھی کبھار اس کے منہ سے کوئی عجیب جملہ کوئی عجیب جہتی بات نکل ہی جاتی جو دونوں خواتین کو آگ بگولہ کر دیتی۔

وہی چلتی مسور کن ہوائیں خوشبوؤں اور ہنرے کی خوشبو سے لدی ہوئی تھیں۔ آسمان پر گہرے بادلوں کا بسیرا تھا۔ کن کن پڑتی پھوار سے بے نیاز سب ٹولیوں کی صورت میں غشی ہوئی تھیں۔ چائے کا بڑا سا گھگھوٹا ہوا تھا اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر بارش اور ہنرے کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا۔ یوں لگا جیسے برسوں بعد کھل کر سانس لی ہو۔ اندر جیسے ساری کتابتیں دھل گئی ہوں۔

درخت پھوار سے بھیگ کر مزید نکھر گئے تھے۔ وادی کا سارا حسن اپنے اندر سموئے کوئٹہ کی وہ سیاہ سڑک ان زندگی سے بھرپور آوازوں پر متحیر تھی۔ مہر نے ایک گہری سانس بھری اور سٹیل کو دیکھا جو لڑکیوں کو لیز کر رہی تھی۔ سہ پہر قریب تھی کئی جگہوں پر گھومنے کے بعد لڑکیوں کو اچانک ہی ہائیڈروجن کا شوق اٹھا تھا۔ یہ ایبٹ آباد کا ایک نواحی علاقہ تھا۔ ہنرے اور پھولوں سے لدا ہوا جہاں پہاڑوں پر بنے گھروں سے مسور کن دھواں نکل رہا تھا۔ وہ بہت مشکل محسوس کر رہی تھی۔ باقی کے لوگ اس سے کافی آگے نکل چکے تھے۔ سستی رومی سے چڑھتے چڑھتے وہ تھک کر رک گئی تو ایک سائیڈ پر پڑے پڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

”بابا اور مینا کیا کر رہے ہوں گے۔“ بارش کی وجہ سے سٹیل کا مسئلہ ہو رہا تھا۔ آواز صاف نہیں آرہی تھی۔

کہیں کالے تو کہیں سفید بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے جیسے اس وقت اس کے ذہن میں خیالات، اس نے یونہی بے دھیانی میں جھک کر نچے سڑک کو دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ نہ جانے کیسے پھسل گئی۔ بے اختیار ہی اس کے حلق سے ایک خوف زدہ مگر قدرے گھٹی ہوئی چیخ نکلی تھی۔ اسے لگا

کہ اب یہ وقت آخری ہے۔ تکلیف و خوف سے اس نے زیر لب اپنے رب کو پکارا تھا کہ نہ جانے کیسے اور کس نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ ساکن ہو جانے کے احساس نے کئی منٹ تو اسے یونہی دم بخود آنکھیں میچے، سانس روکے رکھا۔ گردش کرتے زمین و آسمان رگ کیسے گئے؟ اس کے حواس یہ سمجھنے سے قاصر تھے۔

”ہیلومس..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ آنکھیں کھول لیں۔ رولر کو سٹرک چکا ہے۔“ بظاہر سنجیدہ مگر قدرے چبھتی ماما نوس کی آواز کانوں سے ٹکرانی۔ پھر چہرے کے آگے چٹکی بجائے گئی۔ وہ قدرے حواس باختہ سردنوں ہاتھوں میں تھا اسے یونہی ساکن بیٹھی تھی۔

”دیکھیے مانا کہ یہ پوز گوتم بدھ کا بہت مشہور ہے مگر اس وقت اس آسن میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔ کہیں آپ کے بھگت آپ کے آس پاس جمع ہونا شروع نہ ہو جائیں۔ سو جائیے۔“ خوف سے بند آنکھیں آہستہ سے کھلیں۔ وہ پہاڑی کے ایک چھوٹے پلین سے جھے پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ جو کوئی بھی تھا نہایت اطمینان سے بچوں کے بل اس کے قریب بیٹھا فرصت سے جائزہ لے رہا تھا۔

”لگتا ہے چوٹ شاید دماغ پر لگی ہے یا شاید قوت گویائی متاثر ہوئی ہے۔ مس آر پو آئی رائٹ۔“ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔

اس نے پاؤں سیدھے کرنے چاہے ایک ٹیس سی اٹھی۔ وہ کراہ کر رہ گئی ایک جوتا غائب تھا نہ جانے کدھر گر گیا تھا۔ انگوٹھے کا ناخن بھی اکڑ چکا تھا۔ ٹپنے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں اور بھی لگی تھی۔ مقابل کی کرنچی آنکھیں بخور سے دیکھ رہی تھیں۔

”محترمہ! ریلیکس دیے خود کشی کرنے کا نہایت ہی بھونڈا طریقہ ڈھونڈا ہے آپ نے“ سیدھے سیدھے جب لگاتیں۔ یوں جھک کر قلابازیاں کھانے سے صرف ہڈیاں ٹوٹ سکتی ہیں۔“ وہ شاید

اسے گرتے دیکھ چکا تھا اور نجانے ایسا سمجھ رہا تھا۔
 ”پلیز۔“ اس نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ایک تو تکلیف اور پر سے اس کی نان اسٹاپ لن ترانیاں۔

”اوہ، یعنی کوئی نہیں ہیں۔ شکر ہے چلیے اب ذرا چیک کروادیتے ہیں کہ چوٹیں کہاں آئی ہیں۔ خان جی..... ذرا بیک تو دینا۔“

اس نے تبصرہ کرتے نجانے کسے نکالا تھا۔ وہ بھی جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ مسلسل انٹرنیٹ میسجوں کو دہاتے وہ بے حال ہو رہی تھی۔ بمشکل ہونٹ بھیجے وہ اپنی کراہوں کو روک رہی تھی۔ اس نے بیک لے کر رکھا پھر اطمینان سے اس کے پاؤں کا جائزہ لینے لگا مگر ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ درد کی ایک تیز لہر اسے شراپور کر گئی۔ اس بے اختیار ہی اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔
 ”پلیز مس..... مجھے چیک کرنے دیں کہ موج ہے یا کوئی فریجر۔“

”کیا ہوا مہر..... تم ٹھیک تو ہونا؟“

اتنے میں سنبل ہانپتی کانپتی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ آہنچی۔ ابھی نے سر اٹھا کر مہنویں اچکا ئیں۔ پھر دوبارہ جھک کر اس کا پاؤں ٹونے لگا۔ سنبل کی بات کا وہ کیا جواب دیتی اس نے بے اختیار دھیرے سے اس کا ہاتھ مٹایا تھا۔

”آپ یوں نہیں دیکھنے دیں گی۔ خان جی ادھر آؤ۔“ وہ شاید اس کا اسٹنٹ تھا۔

”لی بی کے ہاتھ ذرا زور سے پکڑو۔“ اس خونخوار سوچوں والے مرد کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھ چھپا لیے۔ سنبل ارے ارے کرتی رہ گئی۔

”دیکھیں۔ اگر آپ کو آپریٹ کریں گی تو اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے ورنہ بصورت دیگر اس پہاڑی سے آپ کو اتارنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ کو دوبارہ دھکا دے دیا جائے تاکہ آپ بعد شوق و احترام خود ہی نیچے لڑھکتی ہوئی پہنچ جائیں۔“

”آپ کی تعریف؟ کون ہیں آپ۔“ سنبل

کڑنٹے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”خود نہیں کرتا۔ کوئی کر دے تو اور بات ہے۔“ سنبل بھی نہیں پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ یہ ٹھیک تو ہے۔“

”جی مہر۔ ابس دو تین ہڈیاں ٹوٹی ہیں۔ شاید جھوٹا موٹا فریجر ہو۔ باقی تو ٹھیک ہیں۔“ پاؤں کا معائنہ کرتے ہوئے اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ سنبل کو سامنے پا کر اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ سنبل نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے محبت کے ساتھ لگا یا اور تسلی دینے لگی۔

”حوصلہ کرو۔ کیا بہت درد ہو رہا ہے۔“

”چوٹیں بہت ہیں۔ میرے پاس تو یہاں بس فرسٹ ایڈ کا سامان ہے۔ کلینک لے جانا پڑے گا۔“
 ”آپ کی تعریف۔“ سنبل کو اس کے مسلسل بولنے پر دوبارہ پوچھنا پڑا۔ وہ مسکرایا۔

”میں ہاشم آفریدی ہوں۔ ہائے پروفیشن ڈاکٹر۔“ وہ شاید بہت بولنے کا عادی تھا۔

”تو ڈاکٹر صاحب کیا مسئلہ سیر لیس ہے۔“

”ایسا کچھ خاص نہیں۔ ناخن تقریباً اکثر چکا ہے۔ اسے ہٹانا پڑے گا۔ ٹخنہ سو جا ہوا لگ رہا ہے مگر فریجر نہیں۔ باقی بازوؤں ٹانگوں پر معمولی خراشیں اور چوٹیں۔“ مہر اب آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ اس نے جینڈیج نکالی اور مہارت سے ٹخنہ کے گرد لپیٹنے لگا تھا۔

”مہم کیا ہوا؟“

”مس کیا ہوا؟“

”مہر کیسے کر گئیں۔ اتنے میں ایک جھوم سا اس کے گرد جمع ہو گیا۔ وہ ایک دم مرکز نگاہ بن گئی۔ ڈاکٹر صاحب سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہے۔ مہر کو یوں سب کا متوجہ ہونا عجیب سی شرمندگی سے دوچار کر گیا۔

”میڈم بہت چوٹیں آئی ہیں۔ یہ ڈاکٹر ہاشم آفریدی ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو اسے کلینک لے چلتے ہیں۔“ سنبل تنصیلاً بتانے لگی تھی۔ مہر تو بس

خاموش اپنی آنسوؤں اور شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جی، میرا کلینک یہیں پاس ہی ہے۔ اس وقت میں ایک مریض کو دیکھ کر آ رہا تھا کہ ان کو زخمی دیکھ کر رک گیا۔ آپ لوگ انہیں نیچے سڑک پر کسی طرح لے آئیں۔ وہاں سے میرا کلینک زیادہ دور نہیں۔“

مینڈیج لگا کر وہ بیک بند کر کے اٹھ گیا۔

”تھینک یو ویری مچ، ویسے میں سنبل ہوں ہم اسلام آباد سے کالج ٹور پر آئے ہیں۔“ سنبل نے خوش اخلاقی سے تعارف کروایا تھا۔

”مل کر خوشی ہوئی۔“ مقابل کی کرنچی آنکھیں چمکیں۔

”ویسے آپ کی یہ اسٹوڈنٹ خاصی غائب دماغ ہیں۔ لگتا ہے زندگی سے بے زار ہیں۔“

اس کی بات پر لڑکیاں کھٹکھٹا کر ہنس پڑیں۔ مہر کو سہارا دیتی سنبل بھی مسکرا دی۔

”سرا یہ ہماری ٹیچر ہیں۔“ لڑکیوں نے شوق سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اوہ.....“ وہ ہونٹ سکڑ کر رہ گیا۔

”چلیں پھر انہیں لائیں آپ لوگ، میں چلتا ہوں۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھرتی سے پہاڑی سے اترتا چلا گیا۔ جیسے جیسے وہ خوں خوار اسٹنٹ بھی۔

”بہت ایکسپریٹ لگتے ہیں ڈاکٹر صاحب پہاڑوں سے اترنے میں۔“

”کوئنٹ ہینڈسم۔“

”کول ہیں اور ڈھنگ بھی۔“

”کسی مودی کے ہیرو کی طرح۔“

منجلی لڑکیوں کے دلی دلی زبان میں اس پر ہونے والے تبصرے اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ وہ سب بڑے جوش و خروش سے ڈکس کر رہی تھیں۔ اس کے لیے کھڑا ہونا اور نیچے اترنا عذاب ہو رہا تھا۔ وہ زمین پر پاؤں جما نہیں پا رہی تھی۔ اس

کی تکلیف دیکھ کر دو اور اسٹوڈنٹ آگے بڑھیں۔ اس کا وزن تقریباً انہی پر تھا۔ وہ آہستہ سے دانت دانتوں پر جمائے اترنے لگی۔ کلینک واقعی قریب ہی تھا۔

اس کا انگوٹھا اچھا خاصا زخمی تھا۔ گھٹنے کہنیاں چھلتی ہوئی تھیں۔ وہاں خوش شکل سی باتونی نرس تھی۔ جو تسلی دیتی مسلسل سوال جواب کرتی اس کی ڈریسنگ کرتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا اثر اس پر بھی تھا۔ اس نے اسے انجکشن بھی لگایا۔

”یہ چن کر ہیں اگر درد زیادہ ہو تو ہر چار گھنٹے بعد بھی لے سکتی ہیں اور یہ انٹی بائیوٹکس ہیں۔ یہ دو ٹائم لینی ہیں کہ زخم سپیک نہ کریں۔ ٹیوب ہے۔“

پرچہ سنبل کو تھماتے وہ سمجھا رہا تھا۔ مسز تنقی نے ان کے اسٹنٹ سے میڈیسن منگوائیں۔ جتنی دیر میں میڈیسن آئیں۔ اس نے جائے منگوائی مہر کو گولیاں چائے کے ساتھ دے کر سنبل اور مسز تنقی اب اس سے بات چیت کر رہی تھیں وہ وہاں کا مقامی ڈاکٹر تھا اور لگتا تھا موصوف کوئی سبیل اللہ کام کرنے کا خاصا شوق تھا۔

”شکر یہ ہاشم آپ نے بہت مدد کی۔“

مسز تنقی اس سے بہت متاثر نظر آ رہی تھیں۔

”مالی ہیلپر اس کی آنکھیں چمکیں۔“

”آپ کی فیس؟“ سنبل کے شرارتی انداز پر وہ مسکرایا۔

”آپ لوگ میرے شہر میں مہمان ہیں اور ہم

مہمان نواز لوگ ہیں۔ جو مہمان سے کچھ لیتے نہیں۔

اس لیے شرمندہ مت کریں۔“ اس کی روشن آنکھیں

بار بار مہر کے چہرے تک جھک کر آئیں۔ نبھانے وہ کیا

کھوج رہی تھیں۔ کلینک سے نکلنے وقت اس نے

سرسری سے انداز میں سنبل سے پوچھا تھا۔

”ان کا نام کیا ہے۔ مطلب پورا نام؟“

”مہر وہیہ احمد علی۔“ سنبل کے بتانے پر وہ پر

سوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ سنبل اسے لے کر

ریسٹ ہاؤس آگئی تھی۔ یہ بھی مسز تنقی کی مہربانی تھی کہ

ان کے جاننے والے کا یہ ریسٹ ہاؤس تھا۔ جہاں

ہوئیں اسٹوڈنٹس اور کولیز اس کی طبیعت پوچھنے آئیں۔ بخار کم تھا اور رات کی نسبت وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

”تمہاری تو ساری تفریح ہی غارت ہو گئی۔ دیکھو تو آج موسم کتنا خوب صورت ہے۔“ اس کی کولیک فائف نے کہا۔ رات ہونے والی رجم جھم رک چکی تھی۔ بادل چھٹ رہے تھے اور خوش گوار برائیں چل رہی تھیں۔ وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔

”..... السلام علیکم، جملہ خواتین۔“

ایک جانی پچالی آواز آئی۔ اس نے بے اختیار دروازے کی سمت دیکھا۔ ڈاکٹر ہاشم آفریدی اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے آیا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مخصوص سی چمک جا گئی تھی۔ وہ نظریں چرائی۔

”علیکم السلام جنرل مین۔“ پر زور جواب دیا گیا۔ سنبل سے حال احوال پوچھا گیا سب سے اخلاق برتنے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”اچھا تو مہربانی بی۔ سنا ہے طبیعت ساری رات خاصی خراب رہی ہے آپ کی۔ مگر مردنا آپ اصرار کرتی رہیں کہ مجھے بے وقت زحمت نہ دی جائے۔ بی بی ہم ڈاکٹر پیشہ لوگ ہیں۔ ایسی ایمر جنسی کے عادی چاہے رات ہو یا دن ہمارا فرض ہے خدمت مریضوں کی۔“ بیک کھولتے۔ اس کا بی بی لیتے اس نے تھرما میٹر اسے دیا تھا۔ پھر سب کے سوالوں کا وہ فردا فردا جواب بھی دیتا رہا۔

آج اس نے ایک میڈیکل کمپ لگانا تھا دوسرے گاؤں۔ سو اس کے ساتھی کولیز جا چکے تھے اس نے بھی یہاں سے فارغ ہو کر ادھر ہی جانا تھا، سزئی کو وہ بتا رہا تھا۔

”اوں۔۔۔ بی بی خاصا لوہے۔ نمبر بچہ بھی ہے وہ تو ہوگا خیر چلے گا۔“ اس نے بیک سے سامان نکالا اور انجکشن تیار کرنے لگا۔

”میڈیسن لی تھیں آپ نے، فرق پڑا کچھ۔“ سوال ہوا۔

ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ دواؤں اور انجکشن سے اسے غنودگی ہو رہی تھی سودہ سو گئی۔ سنبل اور باقی اسٹوڈنٹس اور اسٹاف فی الوقت پاہر تھے۔ رات تک تکلیف بڑھ گئی۔ دواؤں سے وقتی آرام آیا تھا اس وقت وہ بہت بے چین تھی۔ انگوٹھا کا ٹوٹا ناخن تو نرس نے اتار دیا تھا مگر اب تکلیف کر رہا تھا۔ سنبل نے جو اس کی حالت دیکھی تو مشورہ دیا۔

”ڈاکٹر ہاشم کو بلوا لیتے ہیں۔ شاید ایک اور انجکشن سے تمہیں آرام آجائے۔“ ہاتھوں نے بھی اتفاق کیا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”ہاں بھی مہر وزیہ۔ انہوں نے اپنا کارڈ دیا ہے اس میں ان کے گھر کا بھی نمبر ہے۔ اگر تکلیف بہت ہو رہی ہے تو میں کال کر لیتی ہوں۔“ سزئی نے ہمدردی سے پوچھا مگر اپنی ذات کو لے کر وہ کبھی بھی کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ اتنی اہم تو وہ کبھی نہ تھی۔

”نہیں میڈم شکریہ، میں اب بہتر ہوں اگر صبح تکلیف بڑھی تو آپ سے کہہ دوں گی۔“

اس نے ان کو ٹالنے کے لیے کہہ کر دوا مگر ساری رات کراہتے گزری۔ اسے بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ سنبل اس کے ساتھ جا گئی رہی اور لعن طعن کرتی رہی۔

”مستردہ کی ناک بہت لمبی ہے۔ بامروت ہونا اب راتنا بھی اچھا نہیں کہ خود کو اذیت میں ڈالا جائے کبھی کبھی کسی کی مان بھی لینی چاہیے۔“

اس کی مدھم آواز میں کی جانے والی بو بواٹھیں خاموشی سے سنتی رہی۔ کل شام کورک جانے والی رجم ساری رات پھر سے اور مدھم مچائی رہی کھڑکی پر بھتی بوعدوں کی پائل اور سنانے میں کمرے کے اندر چلتے دھڑکی آواز کے سوائے کوئی صدا نہ تھی۔ سنبل نے اس کو دوا دی تھی۔ صبح کے قریب جا کر اس کی آنکھ لگی تھی۔ سنبل بھی اس کی طرف سے منظرین ہو کر سو گئی۔ لو بجے آنکھ کھلی تو کمرہ سیارا خالی تھا۔ سنبل اس کے جاننے کا انتظار کر رہی تھی۔ ناشتا کر کے وہ فارغ

رات سے ہائی بہر ہوں۔ ابسہ سے کہا گیا۔

”اچھا چلیں کلہ پڑھ لیں۔“ انجکشن بڑھاتے اس نے یوں سنجیدگی سے کہا جیسے وقت نزع قریب آگیا ہو۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”لگتا ہے آپ کی پریکٹس اچھی نہیں چل رہی۔ اب تک کتنے مریض ملک عدم روانہ کر چکے ہیں۔“ سنیل نے فوراً بدلہ لیا۔ وہ انہماک سے انجکشن لگاتا رہا پھر فارغ ہو کر اسے دیکھ کر اطمینان سے فرمایا۔

”کتنی کرنا میرا اصول نہیں ہر چیز بے حساب کرتا ہوں۔“

”کیا.....“ سنیل اچھل پڑی۔ بغور اسے دیکھا کہ شاید مذاق کر رہا ہو مگر وہ اب بڑی باقاعدہ قسم کی سنجیدگی بھی سب مسکرا رہے تھے۔

”آپ کو ایلیفینڈ..... ڈاکٹر تو ہیں ناں۔“ وہ مشکوک ہو گئی اپنے بازو کو مستی مہروز یہ نے سنیل کو گھورا۔

”الحمد للہ جسے شک ہو آزمائے۔ علاج شرط ہے۔“ پھر وہ مہر کی طرف پلٹا۔

”اچھا بی بی۔ یہ میڈیسن جاری رکھیں۔ ایک ہفتے تک یہ سوخن بھی کافی اتر جائے گی۔ باقی اللہ بہتر کرے گا۔ چلتا ہوں۔“ بیک بند کر کے وہ کھڑا ہوا کہ چند لڑکیاں چائے لیے آئیں۔

”سر پلیز۔ چائے۔“

اس نے شائستگی سے انکار کرنا چاہا مگر میڈم تقی کے اصرار پر بیٹھ گیا۔ پھر چائے کے دوران وہ ان شوخ لڑکیوں کے سوالات کے گول مول جواب دیتا رہا۔ دوران گفتگو اس کی مہر پر پڑتی پراسرار نگاہیں اور ان میں ابھرتی چمک کو سنیل نے بھی نوٹ کیا تھا۔ بعد میں وہ مہر کو معنی خیزی سے جتاتی رہی مگر وہ سر جھٹک کر رو گئی۔

”اگر وہ اپنا کیمپ چھوڑ کر صرف میرے لیے آیا ہے تو اس میں معنی خیزی کا پہلو کہاں سے لگتا ہے۔“

دل نے مدلوں سے حوس کی چھوڑ دی تھی۔ حوس لمائی کا اس کی زندگی میں گزرنہ تھا۔

کوئی کہانی یا ڈرامہ تو نہیں۔ راجا تک کوئی ہیرو آکر ائے اور یہ کراؤ محبت میں بدل جائے اور ہیروئن کے بدن کی ساری سوئیاں نکال کر وہ اسے ایک پھولوں بھری وادی میں لے جائے جہاں کوئی غم، کوئی تکلیف فکر نہ ہو۔ بابا اور مینا سے بات کر کے وہ ہلکی ہو گئی۔ واپسی کے سفر میں وہ بہت اداس تھی۔ اس پھولوں بھری وادی سے اسے ایک عجیب سی انیسیت محسوس ہو رہی تھی جو دل میں اداسی کی دھند بن کر پھلتی جا رہی تھی۔ نجانے کیوں؟

☆☆☆

”سنو بڑی مزے دار خبر ہے۔“ آج کئی دن بعد مینا کو اس نے ہلکے پھلکے موڈ میں دیکھا تھا۔ اس نے کتابیں بند کیں تاکہ فرصت سے اسے سن سکے۔

”ہتا ہے تم جب ایبٹ آباد گئی تھیں۔ تو پیچھے سے ریحان انگل کے گھر ایک سوئیر چایا گیا تھا۔“

”کیسا سوئیر؟“ اس کے سوال پر وہ استہزائیہ ہنسی۔

”تھا ایک سوئیر جس کی تیاریاں دونوں پارٹیاں کئی ہفتوں سے چکے چکے کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش میں دونوں نے ایڑھی چونی کا زور اٹھایا مگر انجام.....“ طعنیہ ہنسی۔ ”خیر اس دن یہ جلوس بڑے اہتمام اور غرور سے گیا۔ واپسی کے بعد بھی کئی دن اس پارٹی کے جے جے اور تذکرے تھے۔“

”یہ کیا ابھی ابھی باتیں کر رہی ہو مینا۔ کھل کر بتاؤ۔“ مہر نے اس کی بے سرو پا باتوں پر اسے ٹوک دیا۔

”سنو مائی ڈیر۔ بس خاموشی سے سنو۔ نجانے میرے باپ کے کئی ہزاروں پر پانی پھیرا گیا۔ کیسے کیسے اہتمام کیا گیا اپنی نمائش کا تاکہ ان کا وہ قارن پلٹ بیٹا نہیں پسند کرے مگر افسوس صد افسوس۔ منہ کی کھائی ہے دونوں نے۔ آج خبر ہے کہ لڑکے کی بات کسی اور سے ملے ہو گئی ہے اور جلد ہی شادی بھی

ہے۔ اب دونوں پارٹیاں کھسانی — ہوئی مانتی
شکل بنا کر سوگ منارعی ہیں اور دل کھول کر برا بھلا کہا
جا رہا ہے۔

”یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے۔ ہر شے کو مات ہوتی ہے اور
یہ سب خود کو بہت بڑے کھلاڑی سمجھتے ہیں ناں مگر ہر
معاملہ ان کی حسب خواہش حل ہو یہ تو ضروری نہیں۔
منہ کی کھا کر کپسا لگتا ہے انہیں بھی تو پتا چلا ہوگا۔“ مہر
نے اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا۔ نئی جس کی زبان،
سوچوں میں بھری ہوئی تھی اور اس کے اوصاف کو
کھا رہی تھی۔ اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔
”کسی کے نقصان پر خوش ہونا کم ظرفی ہے
میتا۔“

”نقصان..... کیا نقصان؟ کھانے میں تو
ہم رہے ہیں ہمیشہ۔ انہیں کون سے نقصان اٹھانے
پڑے ہیں۔ اور جہاں تک ظرف کا تعلق ہے تو میرا
ظرف اتنا بھی وسیع نہیں کہ اپنی پوری زندگی کو
کھا جانے والوں کو معاف کر دوں۔“ سرد مہری سے
کہتی وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ مہر اس کی پشت کو
دیکھتی رہ گئی۔

”اگر کام ہو گیا ہو تو لائٹ آف کر دیں پلیز۔“
اس کی روٹی روٹی آواز پر اس نے ایک گہرا سانس
لیا۔ جانتی تھی وہ اب اس سے ناراض ہو گئی ہے۔ ان
لوگوں کی طرف داری اسے گورانا تھی۔

اگلے دن چچی کافی مضحکہ خیز دکھائی دیں۔ پھوپھو
الہیہ سوگ کا پتلا اتار کر تیار ہو کر جانے کہاں سیر کو نکل
گئیں۔ چچی کو ریحان انکل سے اتنی بے مروتی کی
امید نہ تھی۔ باتوں باتوں میں دیئے گئے لالچ اور سبز
بارغ بھی کام نہ آئے۔ ”لو۔ سارے وقت تو میری بچی
کے آگے پیچھے رہا۔ کیسے اس کے سامنے بچھا جا رہا
تھا۔ اس کی تعریفیں کرتے اس کی زبان نہ تھک رہی
تھی اور یہ زمین تو بتا رہی تھی کہ ایک دوبار بابر اتفاقہ
ملاقات ہوتی تھی تو اسے کافی پلانے بھی لے گیا اور
اب دیکھو رشتہ مانگا بھی تو کس کا..... ہونہ پر میں نے

بھی کچی گولیاں نہیں کھلیں۔ ایسا چکر چلایا ہے کہ اب
مر کر بھی ایسا نہ سوچیں گے۔“ وہ فون پر اپنی چھوٹی
بہن سے کہہ رہی تھیں۔

”ہاں..... بھائی صاحب کی بیماری پر ریحان۔
بھائی آئے تھے بعد میں بھی آئے تو یہ بھی ساتھ تھا۔
تب اس کے انداز چچ چچ کر زمین کی طرف اس کے
جھکاؤ کو ظاہر کر رہے تھے۔“ مبالغہ اور جھوٹ ان کے
اوصاف ثانیہ تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو ہلکا لینے نہیں دیتی
تھیں۔

”اس مہینے مکار کی اتنی خاطر مدارت کی۔ اتنا
پیسہ برباد کیا۔ سب بے کار ہو گیا۔ ہونہ بے
قدر ہے۔ جھوٹے مکار لوگ۔“ بولتے وقت وہ
جذبات کی روانی میں آواز پر قابو نہیں رکھ سکیں سو باہر
لاؤنج میں موجود مینا اور فی وی دیکھتے باہر نے سب
ہا آسانی سن لیا۔ ماں کی ایسی باتوں پر باہر شرم سے
سرخ پڑ گیا۔ بہن کی یوں نمائش کی تفصیل پر اس کا
خون کھولا اور اسے مینا کی مسخرانہ مسکراہٹ تھی وہ تن
فن کرتا ماں کے کمرے میں تھسا اور زور سے دروازہ
بند کر دیا۔

”دو غلے لوگ.....“ سر جھٹکتے وہ بیڑا والی۔
”آپ کو کیا ضرورت تھی زمین کی نمائش کرنے
کی۔“ وہ ان کے سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔
”ہیں..... کیا مطلب.....“ چچی نے موہا بل
بند کرتے ہوئے اسے گھورا۔

”مطلب آپ اچھی طرح سمجھتی ہیں امی.....
میں ابھی سب سن رہا تھا جو آپ فون پر ارشاد فرما رہی
تھیں۔“ وہ غصہ دبا کر بولا۔

”تو کیا غلط کہا میں نے..... ایسا کون سا گناہ
کر لیا ہے جو تم جہنم کے دروغہ بن کر میرے سر پر سوار
ہو گئے ہو۔“ بی بی تو ان کا کل سے خیر سے غی ہاکی تھا
اب باہر کے شور دیکھے تو بکڑنے لگیں۔

”امی..... امی..... آپ کب رٹیلانز کریں گی
کہ آپ کہاں کہاں پر غلط ہیں۔“ وہ بے بس ہو گیا۔
انہیں سمجھانا فضول تھا۔

”اے لوسیاں..... یہ خوب کمی تم نے یعنی اب تم مجھے غلط ثابت کرو گے۔ مجھے۔ ما میں پوچھتی ہوں۔ ایسے کون سے غلط کام۔ غلطیاں کرتے دیکھ لیا ہے تم نے مجھے۔ ایسے کون سے جرم کیے ہیں میں نے۔“

”اب آپ بات کو فضول میں دوسری طرف لے جا رہی ہیں۔ آپ کو نرمی میں۔“

”یہ کیا نرمی زمین زمین اگر بھی ہے۔ ساری دنیا ہی ایسے کرتی ہے۔ کوشش کرتی ہے۔ تب جا کر من پسند رشتہ ملتا ہے میں نے ایسا کون سا لوگوں کا کام کر لیا ہے جو تم یوں انکارہ بنے کھڑے ہو۔“ اس کی بات پورے ہونے سے پہلے وہ چیخ کر بولیں۔

”آپ نے غلط کام نہیں کیا۔ بلکہ سچ کام کو غلط طریقے سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں اپنی عزت اپنی بیٹیوں کو اڑا لیں کیا جاتا سیٹ کر رکھا جاتا ہے۔ شوچیں مٹا کر کسی کے سامنے نہیں پیش کیا جاتا۔“

”تو میں نے کون سی بولیاں لگائی ہیں سچ چوراہے میں۔ دیکھو باہر..... میں تمہارے تیرے بڑے دلوں سے دیکھ رہی ہوں اور برداشت بھی کر رہی ہوں۔ یہ جو تم نے سماج کی بھلائی کا ٹھیکہ نیا ہوا ہے تا تو اس سے باز آ جاؤ۔ بہت پرزے نکال لیے ہیں۔ بس کرو۔ میرے مہر کو نہ آ زماؤ۔“

احمد علی سے اس کے خوش گوار تعلقات انہیں ایک آنکھ نہیں بھارے تھے سو اس وقت بھی خود کو ملامت کرنے کے بجائے وہ اسے برا بھلا کہنے لگیں۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ باہر جانے لگا تھا۔

”تو مت کرو بات۔ جاؤ اور اپنے سکوں سے کرو۔ ان کی خدمتیں کرو۔ بکوے چاٹو۔“ وہ پیچھے سے چیخنے چلانے لگیں۔..... باہر آیا تو مینا کو دیکھ کر نظریں چرا کر باہر چلا گیا۔ اندر وہ ابھی بھی چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔

☆☆☆

چیک اپ کے بعد بابا کی دوائیں تبدیل کر دی

گئی تھیں۔ اس حادثے کے بعد مینا اور مہراں کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں کہ ایک ہی توان کا اٹنا تھا۔ ابھی بھی باب کو چیک کر کے وہ کمرے میں آئی تو دیکھا مینا سو چکی تھی۔ آج اسے پھر بتاتے بتاتے دیر ہو گئی تھی۔

چچی کابی پی دو دن سے بڑھا ہوا تھا اور ان کا پرہیزی کھانا بتانے سے مینا نے صاف انکار کر دیا کہ اس دن کے بعد ہے ان کے درمیان ایک ان دیکھی سرد جنگ چل رہی تھی۔ سو یہ ذمہ داری از خود مہر کے سر پر آ گئی۔ بابا بھی اب بہت ڈپر بسڈ رہنے لگے تھے یہ خیال کہ اپنے ہی گھر میں وہ اپنی بیٹیوں کو مکمل تحفظ و خوشی نہیں دے سکتے۔ انہیں مسلسل کھائے جا رہا تھا۔ سو ان کابی پی دن میں کئی بار کیا جاتا۔

وہ دل سے چاہتے تھے کہ اب مہر کے فرض سے وہ سبک دوش ہو جائیں۔ یہ سوچیں انہیں دن رات الجھائے رکھتیں، مینا، بابا کا جیسا کہ مینا نے کو سارا دن الیک۔ ساتھ لگی رہتی، یوں چن کی بھی ذمہ داری مہر پر آ گئی تو اس نے سکون سے حل پیش کیا ”کہ تم بھی مت کرو کام۔ کر لیں فی خود ہی جب ان کے پیٹ میں جو بے دوزیں گے۔ تم بس ہمارے لیے کچھ ہلکا پھلکا بنالیا کرو۔“

مگر وہ دوبارہ سے تصادم نہیں چاہتی تھی۔ جس کی وجہ سے بابا اسٹریس کا شکار ہوں۔ کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے اس کی نگاہ پچھلے احاطے میں آگے جھل پر پڑی تو وہ رک گئی۔ اس احاطے میں تین کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ اس کے اور بابا کے کمرے کے علاوہ ڈرائنگ روم کا۔

مگر اس کا نقشہ اس کی ماما کی پسند کا تھا۔ ان کمروں کی کھڑکیاں بھی اسی جگہ کھلتی تھیں جہاں بچپن میں وہ چھاتی اور ماما کو اصرار دیکھ کر بھاگ کر ان تک آ جاتی تھی۔ اس جگہ سے سب کو خوف آتا تھا مگر یہ جگہ اسے اپنے بچپن میں لے جاتی جہاں دھیمے دھیمے مسکراتی ماما تھیں۔ صحت مند ماما تھے۔ ان کا پرسکون گھر تھا۔ تب وہ ماما کے ساتھ گھنٹوں ادھر بیٹھی کھیلا کرتی۔ ماما پھولوں کو بیلوں کو سنوارے جاتیں۔

ہیں دی جلتی ہے تاخیری جی کی خوب صورتی سے، بس یہی خطرہ ہوگا کہ زمین بازی نہ لے جائے تب ہی۔" من پسند نتیجہ اخذ کر کے وہ اب اپنی اما کو تسکین اور ڈھارس دے رہی تھیں۔

"تو مجھے کون سا فرق پڑتا ہے۔ لاکھ رازداری برقی مگر ملی آخر کار تھیلے سے باہر آئی جائے گی۔" اس کا برتفاخرا انداز اور ناز قدرے استہزاء لے ہوئے تھا۔ چچی سر ہلا ہلا کر اب آئندہ کی حکمت عملی طے کرنے لگیں۔

اتوار کو وہ لوگ آئے اور سائرہ کے ہاتھ پر شکن کے پیسے رکھ گئے۔ ریفر-شمنٹ کا سارا انتظام پھوپھو نے بہت اخلا کر دیا تھا۔ مینا تو ہاتھ بھاڑے سائڈ پر بیٹھی رہی۔ مہر نے کچھ آکٹلم پھوپھو کے کہنے پر گھر میں تیار کر لیے۔

کھاتے بیٹے لوگ، بڑھا لکھا لڑکا جو کویت کی کسی آئل ریفاٹری میں انجینئر تھا۔ رشتہ پھوپھو کی "ذاتی وچون" نے کروایا تھا۔ سوسارے معاملات نہایت رازداری سے پھوپھو نے مل ملا کر طے کر لیے۔ چچا جان البتہ چچی کے بھڑکانے پر خاصے ناراض تھے سو وہ..... ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی باہر چلے گئے۔ البتہ چچی خوب جم کر بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ آئی خواتین کے قیمتی ملبوسات زیورات چچی کا دل جلائے جا رہے تھے۔ جس گاڑی میں وہ آئے تو نئے ماڈل کی کرولا اپنے منہ سے اپنی قیمت خود بیان کر رہی تھی۔

سیما آج ہر کام میں پیش پیش تھی۔ سائرہ لجااتی شرماتی بڑی مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں حسب دستور باپ کے پاس ہی رہیں۔ چچی ان میں بیٹھی نچانے کون سے افسانے پھوپھو کی نظر سے بچا کر سناتی رہیں کہ اتنے میں زمین نے اپنے مخصوص انداز میں بھرپور تاثیر دی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن آنے والا فون ایک طوفان لے آیا۔ پھوپھو تن فٹن کرتی لاؤنج میں آئی تھیں جہاں چچی

ساتھ ہی اس سے بھی چھوٹی چھوٹی باتیں کیے جاتیں۔ آہ۔ اس کی نازک خوب صورت ماما۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اس منظر کی خوب صورتی کو ایک جذب سے محسوس کرنا چاہا تو نجانے کیسے دھیان اپنی چوٹوں کی طرف چلا گیا۔ جواب کافی حد تک مندرل ہو چکی تھیں۔ اس کی چوٹوں پر بھی کیا داستانیں گڑھی گئیں۔ معنی خیز اشارے کیے گئے۔ تب اس نے بہت ضبط سے کام لیا تھا اور بابا مینا..... دونوں کتنے پریشان ہو گئے تھے بابا تو..... اس نے کہیں کو آہستگی سے چھوا۔

"دنیا کو ظاہری کھاؤ تو نظر آ جاتے ہیں مگر روح پر بڑے زخم، چھالے، نظر نہیں آتے۔ کاش ان کا بھی کوئی سیما ہوتا۔ کاش کھڑکی بند کرتے اس نے یا سیت ہے سو جا۔ ان زخموں کو دیکھتے دھیان میں وہ مانوس ابھی آ گیا۔ جو غیر تھا مگر غم گسار لگا تھا۔ جو کچھ نہ تھا مگر اس کے زخموں کی سیما کی کرتے اس کے ہاتھ، اس کا چہرہ، سب آشنا سے لگے تھے۔ اس نے گہری سانس بھرتے دل میں ابھرتے اس الو کے احساس کو جھٹکتا چاہا تھا مگر۔

☆☆☆

الفت پھوپھو کے روز روز کے چکر رنگ لے ہی آئے تھے۔ اتوار کو سائرہ کو دیکھنے لوگ آرہے تھے سب کچھ بالائی بالا طے کرنے کے بعد یہ ایک رسمی سنا کارروائی تھی۔ بتول چچی کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ اتنی رازداری برتنا انہیں بری طرح کھلا۔

"کھائے ہمارا..... رہے ہمارے ساتھ۔ مگر کیسے ہمیں دور میں سے کبھی کی طرح باہر نکال پھینکا۔ بہت ہی معنی، مکار اور موقع پرست عورت ہے یہ الفت۔" پچھلے آدھے گھنٹے سے ان کا دادیلا سنی زمین نے بے زاری سے انہیں ٹوکا۔

"بس کریں امی..... ایسا کون سا شہزادہ کفلام ڈھونڈا ہوگا جو آپ کا رنج ہی ختم نہیں ہو رہا۔"

"ہاں تو کیا خبر۔ کوئی شہزادہ ہی ڈھونڈا ہو۔ باہر کی کمائی کا رعب ہی بڑا ہوتا ہے ہمیں تو ہوا تک لگنے

”اسی وجہ سے میں نے رازداری برتی تھی کہ جانتی ہوں یہاں حاسدوں کی کمی نہیں۔“ پھوپھو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں چھپا سے پکڑ کر گول گول چکر دے ڈالیں۔

”جاؤ بھئی۔ اپنا راستہ بناؤ۔ ہم کیوں جلیں گے تم جیسوں سے۔ ایسا وقت ابھی ہم پر نہیں آیا۔ اور نہ ہی میری بیٹی کو رشتوں کی کمی ہے جو ایسے نو دلیروں..... پر اپنی رال ٹکاؤں۔“ ان کی بات پر ایسا گھسان کارن پڑا کہ الامان۔ تمہارا ہمارا باہر پونڈرشی سے آیا تو گھر کا کشیدہ ماحول اسے مزید برگشتہ کر گیا۔ ”سو پلیز۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مجھے کھانا گرم کر دیں۔“ وہ دروازے میں کھڑا درخواست کر رہا تھا۔ مہر کے کچھ بولنے سے پہلے مینا بولی۔ ”کیوں تمہارے ہاتھ کیا ٹوٹے ہوئے ہیں یا۔“

”مینا.....“ مہر کی آواز پر وہ بادل نخواستہ چپ کر گئی تھی۔

”سالن تو میں خود بھی گرم کر لوں مگر روٹی ختم ہے اور وہ تو میں نہیں پکا سکتا۔“

”تم چلو۔ میں آ کر پکا دیتی ہوں۔“ مہر نے نرمی سے کہا۔ اسے باہر کی اچھائیاں اس کے احسانات یاد تھے۔ بابا کی جس طرح عزت، ان کا خیال وہ کرتا تھا یہاں کسی کو بھی اس کی توفیق نہ تھی۔

”ویسے بانی داوے۔ آپ کی ایک عدد بہن اور والدہ بھی ہوتی ہیں۔“ جتایا گیا۔

”ویسے بانی داوے۔ ہر وقت مرچیں چبانا ضروری بھی نہیں ہوتا۔“ اس کے جیلے پر مبہم سا مسکراتا باہر جاتے مڑا تھا اور جاتے کہہ کر جھپٹ سے باہر نکل گیا۔ مینا جل بھن گئی اور مہر سر جھٹک کر رہ گئی۔

گھر کی یہ کشیدہ فضا ان کے لیے تو سازگار بھی بھی نہ تھی سو مہر محتاط ہی تھی مگر مینا بہت بے نیاز تھی اسے اب ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ حالات نے اسے ایسا بنا دیا تھا مہر باہر کو کھانا دینے نکل گئی۔

فرصت سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ”بھابھی۔ یہ تو مجھے پتا تھا کہ کسی کی خوشی تم سے برداشت نہیں ہوتی مگر تم اتنا کر جاؤ گی اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔“

”ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔ یہ کیا بکواس کیے جا رہی ہو۔“ چچی جھک کر ناگواری سے بولیں۔ ”تم نے بانی کی ساس سے یہ نہیں کہا کہ میں سسرال سے لڑ بھگڑ کے برسوں سے میکے میں بیٹھی ہوئی ہوں۔“

”خبر غلط تو یہ بھی نہیں مگر بھی میں نے تو ان کے پوچھنے پر اتنا بتایا تھا کہ سسرال سے نئی نہیں تو بی بیو پور یا بستر سیٹے میکے آئی تھی۔ آخر بہن، بیٹیوں کا اتنا حق تو ہوتا ہی ہے نا۔“ چچی نے اطمینان سے گھونٹ بھرتے بظاہر غصہ سے جلتی پر مزید تیل چھڑکا۔

”کان کو یوں پکڑیں یا یوں۔ بات تو ایک ہی ہے۔ آپ تو چاہتی ہی نہیں ہیں کہ میری بیٹی کا ایسی اچھا جگہ رشتہ ہو۔ کچھ تو لحاظ کریں جو میرے لیے ایسی الٹی سیدھی باتیں بول کر یہ رشتہ خراب کر رہی ہیں اور اوپر سے زمین کو اتنا ج سنور کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی اسے دیکھنے آئے تھے۔“ اصل بات تو یہ ہی تھی، ساس کی ساس نے زمین کے لیے خواہش کا اظہار کیا تھا اور یہ تو پھوپھو نے مر کے بھی نہیں ہونے دینا تھا۔ اپنی بیٹی کے مستقبل کو تاریک کرنے کا ان کو شوق نہیں تھا جو بٹول بیگم کی اس تک چڑھی منہ پھٹ دختر نیک اختر کو بھی ادھر کھپا دیتیں۔

”اے لو۔ میں نے ایسی کون سی الٹی سیدھی باتیں کی ہیں۔ میں تو خدا لگتی کہوں۔ مجھ سے یہ لپٹا پوٹی نہیں ہوتی جو دل میں وہی منہ پر۔ منافقت نہیں آتی اور مجھ پر چڑھائی کرنے سے بہتر ہے کہ تم جا کر اپنی سیدھن کی خبر لو۔ غضب خدا کا ایسی فتنہ عورت..... آج تمہیں الٹی سیدھی بکواس کر کے چڑھادی ہے کل نجانے اور کیا کل کھلائے۔“ مہال ہے ان پر ذرا بھی جواثر ہوا ہو۔

آنے والے نے سامان گیت کے پاس رکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ سفر کو کہ اتنا تھا کہ دینے والا نہ تھا مگر اس راہ کو چلتے یہاں تک آتے وہ تھک ضرور گیا تھا۔ باہر سے اس خاموش گھر کو دیکھ کر وہ کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکا۔ لہذا آگے بڑھ کر نیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وقفے وقفے سے دی جانے والی کھنٹی پر کافی دیر بعد دروازہ ایک سرخ آنکھوں والے لڑکے نے کھولا تھا۔ شاید گہری نیند سے جاگا تھا۔

”جی آپ کی تعریف۔؟“ قدرے شائستگی سے تعارف چاہا تو وہ بے ساختہ ہی بولا تھا۔

”خود نہیں کرتا کوئی کر دے تو اور بات ہے۔“ ایک یاد سی ان کرچی آنکھوں میں چمکی تھی مسکرا کر سامنے حیران کھڑے لڑکے کو دیکھ کر سر جھکایا تھا۔

”مجھے احمد علی صاحب سے ملتا ہے۔ آپ ان سے جا کر کہیں کہ دراب آفریدی کا بیٹا آیا ہے۔“ ذرا ڈھنگ سے تعارف پر وہ آنے والا واپس مڑا۔ پھر چند منٹ بعد ہی وہ ان کے رو برو تھا۔ ان کے ہاتھ تھامے، دھیمی آواز میں مضبوطی سے بولتا ہوا۔ ان کو تسلی دیتا ہوا۔

”آتا تو مجھے ضرور تھا، بہت پہلے ہی مگر فیصلہ لینے میں دیر ہو گئی۔ آپ مایوس تو نہیں ہوئے؟“ اور بابا کی آنکھیں بے ساختہ نم ہوتی گئیں۔ باہر سامنے خاموشی سے کھڑا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مجھے یقین تھا کہ قدرت مجھے اس بار مایوس نہیں کرے گی۔ بس یہ انتظار بہت جاں سہل ہوتا ہے بیٹا۔ جو اس کی سولی پر ٹنکا ہو وہی جانتا ہے کہ امید و بیم کے درمیان ڈولتے ایسے ایک ایک سالس مشقت بن جاتی ہے۔“

”لیکن اس کے اختتام پر خوشیاں ہوں۔“ دلفریبی ہو تو ساری ٹھکن ہل بھر میں اترتی جاتی ہے۔“ اس کی دلاسہ دیتی مبہم باتیں۔ احمد علی نے حیران کھڑے باہر کو دیکھا پھر خوشی سے لبریز لہجے میں بولے۔

”یہ جہاں آرا کا بیٹا ہے۔ منیہ کا بھانجا۔“ باہر سمجھ کر مسکرا دیا۔ اسی نے تو تاپا ابو کے سارے خط پوسٹ کیے تھے۔

”اور یہ باہر..... میرا بیٹا ہی سمجھو اسے۔“ ان کے لہجے میں بولتی محبت پر آنے والے نے پیچھے مڑ کر بغور اسے دیکھا اور خیر مقدمی انداز میں مسکرا دیا۔

”جاؤ..... جا کر مہر سے کہو کھانا لائے۔ مسافر بہت دور سے آیا ہے اور تھکا ہوا بھی ہے۔“ وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا تو انہوں نے مڑ کر اس اونچے لہجے کرچی آنکھوں والے کو محبت سے دیکھا۔ اس کا آٹا۔ ان کا مان بڑھا گیا تھا۔ نہیں نئی طاقت دے رہا تھا۔

کھانا نکالتی، روٹی پکاتی مہر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا سامنا کس طوفان سے ہونے والا ہے۔ باہر کی تلاش کے بعد وہ خود ہی کھانے کی ٹرے اٹھائے بابا کے کمرے کے دروازے پر رکھی تھی۔

”آؤ مہر..... آ جاؤ..... یہ کوئی غیر نہیں ہے تمہاری خالہ کا بیٹا ہے۔“

”خالہ کا بیٹا۔“ مہر اس حوالے پر ٹھٹھک گئی۔ یہ حوالہ کوئی خوش گوار نہیں تھا اس کے لیے، بھاری ہوتے دل وقفے موں کے ساتھ ٹرے تھامے وہ اس کے سامنے آئی تھی جب وہی مسیحا مانوس لہجہ گونجتا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ٹرے رکھتے ہوئے بے ساختہ ہی سر اٹھا کر سامنے موجود بستی کو دیکھا تو بت نئی رہ گئی۔ بابا کیا کہہ رہے تھے اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ساتھیوں دھوکہ کھا سکتی ہیں مگر بصارتیں.....

”یہ تمہاری خالہ کے چھوٹے بیٹے ہاشم ہیں۔“ اس کی مسکرائی شناسائی کا سنگدل دیتی آنکھیں آج بھی اتنی ہی روشن تھیں۔ اس نے اپنے بے جان ہوتے جسم کے ساتھ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ مقابل کی لودیتی نگاہوں سے نظریں چرا کر اس نے آہستہ سے سلام کا جواب دیا اور چلی گئی۔ بابا حیدر کیا کہہ رہے تھے ساتھیوں سننے سے قاصر تھیں اپنی پشت پر ان دو

آنکھوں کی تپش اسے باہر نکلتے تک محسوس ہوئی۔

وہ کمرے میں آ کر بند ہو گئی۔ اس سے یہ رشتہ نکل آئے گا اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک اور دکھ دینا رشتہ۔ کرب سے آنکھیں موندتے وہ ڈھسے گئی۔

شام تک سارے گھر میں اس کی آمد کی خبر پھیل چکی تھی۔ مینا آنے والے کے لیے ڈرائنگ روم میں بستر لگا چکی تھی۔

”یہ کون سا بیٹا آ گیا جہاں آ رہا تھا؟ پہلا والا تو رسی بڑا کر بھاگ نکلتا تھا۔ دوسرا تو سنا تھا کہ دادی کے پاس ہوتا تھا۔ اس نے پالا پوسا۔ لو! اب نیا خرچا.....“

غرض طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں مگر جب اس سے ملاقات ہوئی سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ خوب صورت و شائستہ دراز قامت۔ بولتی چمکتی آنکھوں والا ہاشم آفریدی چھا جانے کی صلاحیت رکھتا تھا سو چھا گیا۔ وہی خواتین جو طرح طرح کی باتیں کرتی بیزار تھیں ایک دم متحرک ہو گئیں۔ ان کا جوش دیدی تھا۔ پھوپھو نے جلدی سے جا کر سیما کو تک سک سے تیار ہو کر آنے کا آرڈر دے دیا تو چچی کو بھی ہوش آ گیا۔ نرمن آج کسی دوست کی طرف بھی سوا سے فون کر کے جلد آنے کی ہدایت کی جو بد تیزی سے ہوا میں اڑا دے گئی۔

”ماں کیسی ہے تمہاری۔ کئی سال ہو گئے اس نے میڈیکر خبر ہی نہ لی۔“ مصنوعی لہجے میں اخلاق جھاڑ لی پھوپھو مینا کو سخت زہر لگی اس دم۔

”جی بس۔ ابا کی جاب کی وجہ سے کئی سال تو ایک جگہ تک ہی نہ سکیں۔ خیر.....“ وہ بڑے سکون سے ان کے سوالات کی بوچھاڑ نہ صرف سن رہا تھا بلکہ..... جواب بھی دے جا رہا تھا۔

”خیر جن کو تعلق رکھنا ہو خبر لیتی ہو وہ ہر حال میں رابطہ کر ہی لیتے ہیں۔ تم بتاؤ۔ کیا کرتے ہو آج کل۔ سنا تھا کہ تم کو دادی نے کو دلے لیا تھا۔ انہیں کے پاس ہوتے تھے۔“

”جی بس کرنا کیا۔ کمال کرنا ہوں یعنی کچھ ایسا خاص نہیں۔“ وہ بڑی عاجزی سے بولا تھا۔

”اور رہتا تو میں اب بھی دادی کے پاس ہوں۔ اپنے آبا کی گھر میں۔ اماں بھی اب ادھر ہی آگئی ہیں بابا کی ریٹائرمنٹ کے بعد اب ہم سب مل کر رہتے ہیں۔“

”آپ کو بابا بلارہے ہیں۔“ کافی دیر سے سختی مینا سے ان کی انگوٹری برداشت نہ ہوئی تو ہلکا خرزور سے بولی۔

”او کے لیڈینہ پھر بات ہوگی۔“ وہ بھی فوراً کھڑا ہو گیا اور منہ پھلپھلے جانی مینا کے پیچھے لگا چلا گیا۔ پھوپھو روکتی ہی رہ گئیں۔

پاپے نے اس کو آفریدی بھی کیا وہ اس کے کمرے میں رہے مگر ہاشم نے سہولت سے منع کر دیا۔ وہ نیچے ہی ٹھیک تھا تا کہ حالات کا نزدیک سے جائزہ لے سکے پھر احمد علی، مینا، مہر اور ڈرائنگ روم کی ترتیب ایسی تھی کہ وہ تینوں اکٹھے بنے ہوئے تھے۔ تینوں کا ایک دروازہ پھلپھلے احاطے میں نکلتا تھا۔ سوا احمد علی کے قریب رہنے کے لیے اس کا عارضی ٹھکانہ ہی بہترین تھا۔ نرمن کافی لیٹ ہی آئی تھی جس پر چچی نے اس کی کلاس لے ڈالی جو ابادہ چڑ گئی۔

”ایسا کون سا پرنس چارلس ان کے خیال سے آ گیا ہے۔ آپ بھی حد کرتی ہیں۔ اب اپنا لیکچر ختم کریں۔“ وہ جواباً بد تیزی سے بولی تھی۔ اس کی خود سری پر چچی جب کر گئیں۔ اس کو سر چڑھانے والی وہ خود ہی تھیں۔ انہیں ذرا قلق ہوا۔ مہر دانستہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ اسے دیکھ کر ماضی کے کئی زخم ہرے ہو گئے تھے۔ مینا کو بھی سارے حالات کا علم تھا سو وہ بھی ہاشم سے قدرے بھی کھینچی رہی۔ بابا کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انرجی ٹانک مل گیا ہو وہ کئی عرصے بعد اتنے مطمئن، خوش اور پر امید نظر آ رہے تھے۔

”آج تو آپ اپنے حجرے سے باہر ہی نہیں نکلیں۔ مجبوراً سارے کام مجھے کرنے پڑے۔“

مینا نے شکوہ کیا مگر وہ نظر انداز کیے یوں ہی لپٹی رہی۔

”ہوا کیا ہے۔؟ کچھ بولیں بھی۔“

”میں آپ سے بات کر رہی ہوں مہر۔“

اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پر اس نے ہنسنے کی کوشش کی تو اس نے بے زاری سے ٹوک دیا۔

”تھک مت کرو مینا۔“

”کیوں تھک نہ کریں۔ بابا کئی بار آپ کا بوجھ چکے ہیں۔ مگر لگتا ہے آپ تو مجھے سکتے ہیں چلی گئی ہیں۔ مہر..... بولنا سیکھیں۔ ہر جگہ خاموشی ابھی نہیں ہوئی۔ اگر آپ کو ان کا آنا برا لگا ہے تو کھل کر اظہار کریں۔ یوں خود کو گھلانا۔ کوئی میڈل نہیں دے گا آپ کو۔“

میرے اعتراض کرنے سے کیا سب بدل جائے گا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔؟ وہ واپس چلا جائے گا۔؟ اس رندھی آواز پر مینا بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔

”شاید کچھ بھی نہ ہو مگر آپ کے اندر کا غبار تو دھل جائے گا ناں۔ بعض دفعہ بولنا بہتر ہے بجائے اندر اندر کھلنے کے، خاموش رہ کر آپ لوگوں کی تصدیق ہی کر سکتے ہیں۔ ظلم کے خلاف نہ بولنا بھی ظلم ہے ناں اور یہ بات میں نے سیکھ لی ہے۔“ خود سے پانچ سال چھوٹی بہن کے منہ سے یہ سن کر پہلے تو وہ خیران ہوئی پھر قدرے نرمی سے مسکرائی تھی۔

”ضروری تو نہیں تجربات ہر کسی کو ایک سابق سکھائیں۔ مجھے خاموش رہنا ہی آسان لگتا ہے نسبتاً بولنے یا لڑنے کے۔ میں کسی سے لڑ نہیں سکتی، نہ ہی خود کو جستی قافی کر سکتی ہوں۔“ اس نے جیسے تھک کر اپنی کمزوری کا اعتراف کیا۔

”ایک لمحہ ایسا آتا ہی ہے مہر۔ جب آپ سرتاپا بدل جاتے ہیں۔ بعض اوقات تبدیلی آہستہ آہستہ آتی ہے مگر بعض جھٹکے آپ کو یک لخت کچھ سے کچھ کر جاتے ہیں۔ میں دعا کروں گی کہ آپ کی زندگی

میں بھی وہ لمحہ، وہ سوڑ آئے جب آپ خود اپنی ذات کے لیے لڑ سکیں۔ مہر بھی ایک مدت تک ہی ہوتا ہے زیادہ مہر بعض مرتباً آپ کو بے حس بنا دیتا ہے اور بے بسی پر کوئی اجر نہیں۔“ نزی سے اس کا ہاتھ تھامتے وہ بولے گئی۔

”اور ہاں۔ جرم جس نے کیا تھا سزا بھی انہیں بھی نہیں دیں۔ دوسروں کو اپنی بریت میں اپنی صفائی میں بولنے کا موقع تو ملنا چاہیے ناں۔! خود سے فرض کر لینا کہ جرم میں سب ہی شریک تھے بدگمانی اور۔ نا انصافی ہے۔“ بڑے پتے کی بات اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں سمجھائی تو وہ اسے دیکھ کر رو گئی۔

☆☆☆

مینا کی سوہنلی خیمی اور وہ کھڑکی میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ یہ اس کہانی کا نقطہ آغاز تھا یا انجام.....! مینا اس حادثے کے بعد جیسے بدلی تھی وہ حیرت انگیز تھا۔ جھک ڈر، خوف سب کو پیچھے چھوڑے اب اس کے ہر عمل ہر انداز میں ایک اطمینان ہوتا تھا۔ کوئی کیا کہے گا اسے پروا نہیں۔

بابا کی وہ حالت اور پھر ان کا تندرست ہو جانا اسے خوف کے انتہائی عمل کے بعد سے بہادر بنا گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اگر کھل کر جینا ہے تو کھل کر بولنا بھی ہے۔ اسے اب کسی کام کی پروا نہیں ہوئی تھی۔ ملازمہ کی چھٹی کرنے پر اب وہ جھاڑو اور جھاڑن ہاتھ میں لیے گھر صاف کرتی نظر نہیں آتی تھی بلکہ وہ بھی اطمینان سے اپنے بابا کے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ پہلے کی طرح ظلم کی غلام نہیں رہی تھی۔ چچی بھی اب اس کے منہ زیادہ نہیں لگتی تھیں اور وہ نئی وہ..... اس نے سسکی سسکی سی سانس لی۔ ڈاکٹر ہاشم آفریدی۔ حاتم آفریدی کا چھوٹا بھائی۔ اس کی سسکی خالہ کا بیٹا۔ حاتم آفریدی۔ اس کا منگیتر۔ خالہ کے میاں سرکاری ملازم تھے سو ان کا تبادلہ شہر ہونے کی وجہ سے خالہ بھی ایک جگہ نکل ہی نہ سکیں۔ ہاشم چھوٹا تھا۔ خالو کی والدہ کو اپنے آبائی گھر سے بہت محبت تھی سو انہوں نے

وہیں رہنے پر ترجیح دی۔ ہاشم کے ساتھ وہ ایبٹ آباد کے لوہان میں واقع اپنے گھر میں رہیں۔

نعمیال میں وہ اس کا واحد رشتہ تھیں۔ نانو کا انتقال تو جب وہ پانچ سال کی تھی تب ہی ہو گیا اور نانا پیدائش سے پہلے ہی نہ رہے۔ خالہ، پاما کے انتقال کے بعد کافی دن اس کے پاس رہی تھیں۔ اور جانے سے پہلے وہ بابا سے کہہ گئی تھیں کہ وہ مہر کی فکر نہ کریں وہ ان کی امانت ہے۔ بعد میں بھی وہ بابا سے رابطے میں رہیں۔ ہر موقع پر وہ اس کے لیے شلن بھیجتی رہیں۔ تب اسے کچھ علم نہ تھا مگر چچی اور پھوپھو کھٹک سی گئیں۔ میٹرک میں آنے کے بعد بابا نے اسے بتا دیا کہ اس کی بات اپنی خالہ کے گھر طے ہے۔ خالہ سے بھی بات ہوئی رہتی تھی۔ تب اس رشتے کے حوالے سے اس کے کوئی خاص جذبات نہ تھے۔ حالات نے کوئی نرم، لطیف جذبہ بھی پنپنے ہی نہ دیا تھا۔ مگر بابا کا اطمینان دیکھ کر وہ بخوشی راضی ہو گئی۔ خالہ میں ماما کی خوشبو آتی تھی۔ ان میں ماما کی بہت شباهت تھی۔ سو مستقبل کے حوالے سے ایک اطمینان سادل کو ہو گیا تھا کہ کم از کم حال سے بہتر ہی ہوگا۔ پھر سنا کہ خالو ڈیویشن پر دو سال کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ خالہ جانے سے پہلے ملنے آئی تھیں وہ ان کے ساتھ بھی تھا قدرے لا پرواہ۔ قدرے سنجیدہ سا۔ وہ چلی گئیں۔ ان سے بابا کا رابطہ اب کم ہی رہا کرتا تھا کہ اچانک ایک دن ان کا فون اس کی ذات کے پرچے اڑا گیا۔ تب وہ تھرڈ ایئر میں نئی نئی آئی تھی۔ ان دنوں گھر کے حالات بہت عجیب سے ہو گئے تھے۔ ہر دم کشیدگی۔ بابا بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ان کی دوا میں۔ ان کا علاج کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ زمین جیسے ان تین لوگوں کے لیے مزید تنگ کر دی گئی تھی۔ اپنے ہی گھر میں ایک بوجہ سمجھا جا رہا تھا۔ تب مینا بہت چڑچڑی ہو گئی تھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے وہ ہوم ٹیوشن دے رہی تھی جن سے اسے اتنے روپے مل جاتے کہ بابا کی

دواؤں میں مانگ کم ہونے لگا تھا۔ وہ بھی ایک تھکا ہوا پر مشقت دن تھا جب خالہ کا فون آیا۔

”بھائی صاحب۔ اگر چچی کی رضا اس رشتے میں نہیں تو آپ زبردستی مت کریں۔ جہاں اس کی خواہش ہے وہیں اس کی بات ٹھہرا دیں۔ زبردستی کے رشتے سوائے تکلیف کے کچھ نہیں دیتے۔“ یہ سن کر بابا ششدر رہ گئے۔ خالہ کیا کہہ رہی تھیں اور کیوں؟

”تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ یقیناً تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مہر کو اس رشتے پر بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی بھائی صاحب! میں آپ سے کبھی یہ بات نہ کرتی۔ مگر مجھے بار بار یہ بتایا گیا اور بتایا گیا ہے۔ میرے پاس شواہد ہیں۔ میں بغیر کسی ثبوت کے یہ بات کبھی نہیں کر سکتی تھی مہر میری بہن کی نشانی ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے سواگر اس کی خوشی حاتم نہیں تو خیر..... اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔“ دھی، کوٹے لہجے میں کہتی وہ فون بند کر گئیں۔ اور بابا..... بابا اس بات سے ٹوٹ گئے۔ اس رات ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔ انہیں دل کی تکلیف اٹھی تھی۔ وہ خوف سے پر رات جب مہر کو لگا تھا کہ بابا بھی سے ماما کی طرح چھوڑ جائیں گے۔ اس کے سارے احساسات نمود کر گئی۔ بابا ٹھیک ہو کر آج بھی گئے مگر بہت خاموش۔ بہت دل گرفتہ رہنے لگے تھے گھر میں بھی یہ خبر سب کو ہانگ گئی کہ اس کی خالہ نے منگنی توڑ دی ہے۔

”سنا ہے اس کے کردار کی وجہ سے مشکوک تھی عافیہ۔“ چچی بظاہر راز داری سے کہتیں مگر با آواز بلند مقصد اسے سنا ہوتا۔

”ہاں..... اور یہ بھی کہ اسے پتا چلا ہے کہ بہت خود سر ہو گئی ہے شام ڈھلے گھر آئی ہے۔ سارا دن نجانے کہاں کہاں منہ مارتی پھر لی ہے ٹیوشن کے بہانے۔“ پھوپھو کی زہرا فشا لی اسے نیلا کر گئی۔

”بھئی..... میں تو اپنے بیٹوں کو اس سے بھا کر رکھتی ہوں۔ ابھی سے باہر کے چسکے منہ کو لگ گئے

ہیں۔ ایسی لڑکیاں جہت چلتر باز ہوتی ہیں۔ ان کے شر سے کوئی کتنا بچے۔" بچی کا کٹھنلا حقیر انداز پھوپھو مزید بچا رہے بھرتیں۔

"شکر ہے میرا اسد تو گیا باہر..... ویسے اتنی پرانی مگنی بے وجہ تو نہیں ٹوٹی ہوگی۔ یقیناً کسی نے کی رپورٹ دی ہے اس کی۔ شکل دیکھ کر کیسی معصوم لگتی ہے۔ مگر اندر سے پوری میسنی ہے۔ نبھانے ایسا کون سا گل کھٹایا ہے کہ مگنی بھی ٹوٹ گئی اور بھائی صاحب بھی اسپتال پہنچ گئے۔" ان کے لہجے، جلوں، لفظوں کے پتھر اس کے کردار کی چادر کو داغ دار کرتے کرتے تاریا کرنے پر تل گئے۔

"ہاں..... اللہ معاف کرے اور ہماری بچیوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھے۔" بات بڑی نہ مگر رفتہ رفتہ پھندے لگتے پورے خاندان میں بھی پھیلتی چلی گئی۔

اس کا دل چاہتا کہ وہ خالہ سے پوچھے کہ انہیں یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اس کے کردار کے بارے میں کوئی بھی رائے دیں۔ کیا انہیں اپنی بہن کے خون پر اعتبار نہ تھا؟ کیوں اسے مصلوب کیا جا رہا تھا۔ اس کی رسوائی کا حصہ بنانے اور پھیلانے میں انہوں کا ہی ہاتھ تھا۔

بابا نے بعد میں ان سے ایک دو مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ وہ اندر ہی اندر گھٹنے لگے۔ بظاہر چپ تھا مگر جہت سے

انزیت سے پردہ سال گزارنے کے بعد اس نے اپنے بکھرے حوصلوں کو جمع کیا۔ خود پر بے نیازی کا خول چڑھا کر ان چھپتی نگاہوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی وہ میدان عمل میں کودی تھی۔ اس بات کو چھ سال ہو چکے تھے۔ زندگی میں بظاہر ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ خالہ سے رابطہ کھل متقطع تھا وہ اپنی ذات و کردار کی دوبارہ تعمیر کرتے کرتے جھکنے لگی تو دل میں کئی گھلے ان کے حوالے سے اتر آئے اور آج۔ پھر وہی باب کھٹا تھا۔ کہانی کا ایک نیا کردار سامنے آیا تھا کہ قصہ پراگ تھا۔ زخموں کا منہ ادھر گیا تھا

سوزات تو روفو گری میں کٹنی تھی ما..... نرمین کا تو مانو مزاج ہی بدل گیا تھا۔

ہاشم آفریدی کی چھا جانے والی سحر انگیز شخصیت اس کے خود ساختہ بے نیازی کے خول کو چٹا گئی۔ اس کی بے نیازی کے جواب میں اس کی سرسری نظریں اسے چیلنج کر گئیں۔ پھوپھو نے ساڑھ کی شادی کی تاریخ طے کر دی تھی اور اب سیما کو ہاشم کو چاہو کرنے کے گر سکھا رہی تھیں۔ اس مرتبہ وہ نرمین کا جادو چلنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ ہاشم کا زیادہ وقت کوکہ بابا اور باپ کے ساتھ ہی گزارتا تھا مگر اب اکثر شام کی چائے پر اسے زیر دستی تھیٹ لیا جاتا۔ نرمین بطور خاص اہتمام کے ساتھ اس کا ساتھ دینے کو موجود ہوتی تو سیما بھی پیچھے نہ رہتی۔ ایسے موقعوں پر دونوں خواتین اکثر ڈشٹی مار جاتیں ادھر ادھر کھسک جاتیں۔ ہاشم خود سمجھتا تھا مگر مردت اسے کچھ کہنے نہ دیتی۔

اس دن گھر میں بہت امن تھا کہ دونوں فریقین کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مٹانے کلمہ شکر بڑھا تھا اور کتابیں اٹھائے منوعہ علاقہ لاؤنج میں جانے لگی کہ پیچھے سے آتے ہاشم نے پکارا۔

"اے سنو چڑیا۔"

"میرا نام مٹا ہے۔ مینا کل احمد ملی۔"

"مگر مجھے تو تم ایک چھوٹی سی منہ پھٹائے چڑیا لگتی ہو۔ جو ہر کسی سے ناراض منہ چھپائے جھنجھی رہتی ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔

"منہ چھپائے وہ جس نے جرم کیا ہو۔ میں ہر کام ڈنگے کی چوٹ پر کرنے کی نادی ہوں۔ دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر نہیں چلائی۔" اس کے تکیے انداز تھلاتے لہجے۔ پر ہاشم بے ساختہ ہنس دیا۔

"اچھا بی بی۔ حق و سچائی اور جرات کی طبردار ذرا یہ تو بتا میں۔ مجھ سے کیا ناراض ہیں؟ دوسری طرف آپ کی بڑی بہن بھی مجھے مسلسل نظر انداز کر رہی ہیں۔" دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے اس نے

”گریز اگر بے وجہ ہو تو اگلا مشکوک ہو جاتا

ہے۔ یہ رویہ کب تک چلے گا۔ کوئی ڈیل لائن؟ کوئی حد؟“ اور مہر کا دل چاہا کہ پلٹ کر سخت جواب دے دیے مگر ضبط..... وہ یوں ہی نظر انداز کیے خاموشی سے چائے میں دودھ ڈالے گئی۔

”بے وجہ خاموشی بھی الجھنیں مزید بدھاتی ہے سو بولے۔ بولنے سے اگلا آپ کا موقف تو سمجھے گا نا۔“ وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھا اسکا تار ہا۔ مگر وہاں بھی ضبط کمال کا تھا۔ خاموشی سے ہی چائے کا کپ آگے دھرا کیا تھا۔ مقابلہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا سپاٹ چہرہ بلا کا پرکشش تھا۔

”پلیز..... اگر تم تھوڑی دیر رک کر میری بات سن لو.....“ وہ پلٹنے لگی تو اس کی نرم آواز پر رک گئی۔

”وقت گزرنے کے بعد ساری وضاحتیں بے معنی ہو جاتی ہیں ڈاکٹر ہاشم! پھر جو قصور وار ٹھہرے کٹہرے میں بھی وہی کھڑا ہو تو بہتر ہے، دوسرے آپ کے وکیل منائی بنیں تو قاعدہ کیا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گئی سے کہہ گئی۔

”بعض دفعہ سچائیاں بعد میں کھلتی ہیں تو وضاحتیں بھی تب ہی دی جاسکتی ہیں۔ دھول بیٹھنے کے بعد منظر واضح ہوتے ہیں، لہذا راستہ دیکھ کر سفر شروع کر دینا آسان ہوتا ہے۔“ اس کی ذومعنی بات اور ٹھہرے انداز۔ مہر نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔ آج بھی اس کے چہرے پر ایک مہربان سا تاثر تھا۔ گریز آنکھوں میں چمک لیے وہ بڑی فرصت سے اس کے تاثرات پڑھتا جا رہا تھا۔ مہر نے ایک پرتاسف سانس لی۔

”دھول بیٹھنے میں بہت وقت لگتا ہے ڈاکٹر صاحب اور اس وقت اس گرد میں کھڑے شخص کو سست نظر نہیں آ رہی ہوتی ہاں مگر خود وہ ضرور سٹی میں سٹی ہو جاتا ہے۔ اور وہ کڑا انتظار۔ وہ آنکھوں میں ذرے چبھنے کی اذیت اور آپ کی ذات پر اثراتی جانے والی خاک..... اے جمیلنا..... اے جھیلنے جھیلنے آپ ضرور سست کھو بیٹھتے ہیں۔ بعد میں چاہے

استفسار کہا۔

”اس کا جواب تو اپنے دل سے پوچھیں کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔“ وہ بدستور ویسے ہی بولی۔

”اگر بات چیت یا رابطہ نہ ہو تو بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ سو تم آرام سے میری بات سن لو گی تو ہو سکتا ہے کہ فیصلہ کر سکو کہ مجرم کون ہے اور ملزم کون۔“ اس کے سنجیدہ لہجے میں ایسا تو کچھ تھا کہ مٹانے چند لمحے رک کر بغور اسے دیکھا پھر گہرا سانس بھرتی فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”آئیے۔“ اور ڈاکٹر ہاشم کی گریز آنکھوں میں روشنی جیسے ایک دم بڑھ سی گئی۔

☆☆☆

صبح وہ معمول سے بھی پہلے بندار ہو گئی تھی۔ رات بھر بھی ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ اب بھی اذان کے ساتھ آنکھ کھلی تو وہ نماز و تلاوت کے بعد چائے کی طلب میں باہر نکل آئی۔ بابا کے کمرے میں حسب عادت جھانکا تو وہ پرسکون نیند سو رہے تھے یوں بھی آج کل ان کی طبیعت بہتر رہنے لگی تھی۔ مینا بھی ابھی سو رہی تھی۔ وہ چائے پنانے کچن میں چلی آئی۔ جانتی تھی کہ سحر خیزی کی عادت اس گھر کے بانی کینوں کو نہ تھی۔

چائے کا پانی چڑھا کر وہ کینٹ سے جی اور چینی نکال رہی تھی جب آہٹ پر بے اختیار چونک کر مڑی تھی آنے والا ہاشم آفریدی تھا اسے اتنی صبح جاگتا دیکھ کر حیرت تو ہوئی مگر چہرے پر اس نے عکس نہیں آنے دیا۔

”بھئی ہم تو سحر خیز لوگ ہیں۔“ سنیل سے کہا گیا جملہ ذہن میں گونجا تھا اور اس کے ساتھ کتنا کچھ یاد آ گیا۔ وہ آہستہ سے چولہے کی طرف مڑ گئی۔

”زحمت تو ہو گی مگر پلیز۔ ایک کپ میرے لیے بھی۔“ سنائے میں اس کا شائستہ مہربان لہجہ گونجا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے خاموشی سے ایک کپ مزید بڑھا دیا۔ وہ ڈائننگ کی کرسی کھیٹ کر بیٹھ گیا تو اسے الجھن ہونے لگی۔

حل ملے یا راستہ..... اس کڑے وقت میں تو اپنی ذات کا استحکام برقرار رکھنا ہی انتہائی جاں نسل ہوتا ہے۔ وہ جتنا وقت اور خود پر لگائے گئے الزامات۔ جس کی بازگشت آج بھی اس کی ذات کی چار دیواری میں گونجتی رہتی۔

مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ گناہ گار قرار دی گئی تھی۔ ہاشم اسے دیکھ کر ہلکا سا تاسف کا شکار ہونے لگا۔ مینا اسے سب کچھ بتا چکی تھی گوکہ احمد علی نے کچھ نہ جتایا تھا مگر یہ ان کا طرف تھا۔ ماحول کے بوجھل پن نے انھوں میں ان کو اپنے حصار میں لیا تھا مگر ہاشم نے والوں میں سے نہیں تھا۔ سو سکر اتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں پلٹ گیا۔

”دیے باتوں کے ساتھ جائے بھی اچھی بتا لیتی ہیں آپ۔“ وہ بغیر کچھ کہے جانے لگی۔

”میں انتظار کروں گا۔ مہر۔ جب آپ فرصت سے۔ بغیر کسی رکاوٹ، کسی عداوت کے مجھے سننا چاہیں گی۔ مجھے یقین تو نہیں مگر امید آپ کے کافی سارے بوجھ ہلکے ہو جائیں گے اور شاید کچھ لوگوں کی حقیقت بھی کھل جائے۔“ اس کا لہجہ پر یقین تھا اس نے یوں ہی مڑ کر دیکھا اب وہ فرصت سے چائے انجوائے کر رہا تھا وہ باہر نکل گئی۔

☆☆☆

زمین کا زیادہ تر وقت اب گھر پر گزرنے لگا تھا۔ خود پر وہ پہلے سے بھی زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ سیمہ بھی اس بار ہتھیاروں سے ٹیس مقابل تھی۔ پھوپھو ساڑھ کی طرف سے مطمئن اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ چچی سے ان کی ایک سرد جنگ ہنوز جاری تھی۔ چچا البتہ معاذ کی غیر ذمہ داریوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگے تھے۔

وہ کھنٹوں بتائے بغیر عائب رہنے لگا۔ کیش کاؤنٹر سے رقم بھی عائب ہونے لگی تھی اور اس بات پر گھر میں اس دن خوب جھگڑا ہوا۔ اس نے بھی اعتراف کر لیا تھا۔ وہ آج کل کسی لڑکی کے چکر میں تھا۔ چچی تو یہ سن کر پہلے خوب پتہ چلا میں پھر ان

کا بی بی شوٹ کر گیا۔ بند کمرے میں ہونے والی کارروائی کی بجائے کچھ نہ کچھ باقیوں کو بھی پڑ گئی۔ ہاشم بابا کو اپنے ایک کلاس فیلو کے کلینک لے جانے لگا تھا۔ ہاشم گھر کے حالات سے دلے ہی مالاں تھا۔

چچی پہلے ہی اس کے تہہ دیکھ کر کھٹک گئی تھیں مگر اب بڑے صاحبزادے کے کڑوتوت انہیں مزید ڈرا رہے تھے۔ زمین ان تمام حالات سے بے نیاز تھی۔ اس کے لیے اپنی ذات اہم تھی۔ خود غرضی کا یہ سبق پڑھانے والی چچی خود ہی تھیں۔ سو بیٹی سے انہیں کسی ہمدردی کی امید نہ تھی۔

ستمبر کی اس سسنان دوپہر میں جب سب اپنے کمروں میں تھے۔ مہر کالج سے آئی آج کل اکثر ہی اسے کالج سے واپسی پر دیر ہو جاتی تھی۔ بھوک بے برا حال تھا۔ مینا بابا کے کمرے میں ہی سوئی ہوئی تھی۔ اس نے شاور لے کر کچن کا رخ کیا۔ چٹلی میں ذرا سا سالن بچا رکھا تھا۔ البتہ ہاٹ پاٹ خالی تھا۔

فرنیچ سے آٹا نکال کر اس نے پیڑا بنایا ہی تھا۔ جب گیٹ کھلنے کی آواز پر اس نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا۔ اس گرم دوپہر میں آنے والا ہاشم آفریدی تھا اور اس کے ساتھ زمین بھی تھی۔ زمین کے چہرے پر تھاکہ احساس اتنی دوری کے باوجود بھی اسے نظر آ رہا تھا۔ وہ رخ پھیر کر تواچو لیے پررکتے لگی۔

”مجھے کیا ہے۔ یہ چاہے جس کسی کے ساتھ بھی کھوے۔“ ہاشم آفریدی کے حوالے سے آنے والے خیال پر اس نے سر جھٹک چاہا مگر اندر کہیں کسی نے دھیرے سے نیکی کی تھی۔

”تھنک یو ہاشم۔ آپ کی وجہ سے مجھے بہت سہولت ہوئی۔“ بال جھٹکتے ایک اداسے مسکراتی زمین نے سنجیدہ سے ہاشم کو دیکھا۔

”خیر مگر۔ زمین بی بی۔ میں روز روز آپ کو یہ سر دہن نہیں دے سکتا۔“ بظاہر عام سے لہجے میں ایسا کون سا سرد تاثر تھا کہ زمین نے مڑ کر بغور اسے دیکھا۔

”اگر میں چاہوں تب بھی۔“ نبھانے کس رو

میں اس نے بڑے انداز سے پوچھ لیا۔ ہاشم نے بڑے سکون سے اسے دیکھا پھر تسلی لے کر جواب دیا۔

”ہاں..... ہمارے چاہنے سے سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی مل سکتا ہے۔ سو اس بات کو تو رہنے ہی دیں۔“

”مگر میں نے جو چاہا ہمیشہ حاصل لیا ہے۔ مجھ میں اتنا دم ہے اور جرات بھی کہ اپنی چاہت کو قابل حصول بنا سکوں۔“

”خوش گمانی اچھی چیز ہے۔ مگر چیزوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ انسانوں پر اپنی مرضی سے قابل حصول کا ٹیگ لگوانا حماقت ہی ہے۔“ بظاہر ہشام دیتے لہجے میں کہا وہ آگے بڑھ گیا۔ زمین نے اس کی چوڑی پشت کو سکرانی چیلنج کرتی نظروں سے دیکھا تھا۔

”یہ تو وقت بتائے گا ہاشم آفریدی..... کہ کون قابل حصول ہے اور کون نہیں۔“ ہاشم نے نڈرتے ہوئے ہن میں کھڑی مہر کو دیکھا تو ایک لمحے کو رک گیا۔

”میں آپ کی فراغت کا انتظار کر رہا ہوں مہر۔“

”اچھا...! اسی لیے اپنی فراغت کا اچھا معرّف نکالا ہے آپ نے۔“ مانا چاہتے ہوئے بھی وہ طنز کر گئی۔ ایک لمحہ لگا تھا ہاشم کو سمجھنے میں۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

”بعض اوقات مروت بھی مراد ہوتی ہے۔“

”اور مروت بھی ایسی خوب صورت۔“ اس کے تھکے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ہاشم نے چونک کر بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ اس کی جاچتی نظروں کو محسوس کر کے اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ کیا بول گئی ہے اور کس سے، کیوں۔ تو خفیف سی ہو گئی۔

”اندر ایسا کیا ہے کہ آپ اسٹک ہو گئے ہیں۔“

”جیسے سے آتی زمین کی آواز پر وہ رخ موڑ گئی۔“ سنگ میل یا شاید نشان منزل۔“ ہلکے سے

بڑبڑا کر وہ آگے بڑھ گیا۔ مہر ساکن ہو گئی۔ مہر کو دیکھ کر زمین کی توری چڑھ گئی۔

”زیادہ اونچی اڑان اڑنے کی کوشش مت کرنا کہ تمہارے پر کھٹنے پر کھسکیں واپس زمین پر نہ بیٹھ دیں۔ اپنی اوقات میں رہنا۔“

ہاشم آفریدی کے چہرے پر پھیلا وہ نرم گرم سا تاثر اسے آگ لگا گیا تھا سو اسے وارننگ دیتی وہ جیسے سے پلٹ گئی۔ مہر نے ایک آرزو سی سانس بھر کر سوچا۔

”زمین پر رہنے والوں کو گرنے پر اتنی چوٹ نہیں لگتی جتنی اونچی اڑان بھرنے والوں کو۔ اور کیا میں اپنی حقیقت نہیں جانتی۔“

☆☆☆

معاذ نے معاملات بہت خراب کر رکھے تھے۔ چچا آلی ہزار دمکیوں کے باوجود بھی وہ اس بڑی سے لٹنے سے باز نہیں آ رہا تھا بالکل انا بھند تھا کہ اس کے گھر رشتہ نے گر جایا جائے۔ چچی تو ایسی چلتر لڑکی کو بہو بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ جس کی ریپویشن بھی اچھی نہ تھی اور جس نے ان کے بیٹے کو ابھی سے اپنی سہمی میں کر رکھا تھا۔

اس معاملے میں ان کی برعکست عملی لیل ہوتی جا رہی تھی۔ دھونس، دھمکی سے وہ - معاذ کو قابو نہیں کر سکتی تھیں لہذا ان کا بی بی ہر وقت ہانکی رہنے لگا تھا۔ ادھر زمین اب مستقل ہاشم آفریدی کو اپنی ملکیت تصور کرنے لگی تھی۔ سیما سے اس کی تو تو میں میں بھی ہو چکی تھی۔ مینا کو اس کا دھونس جھانا انداز ہر لگتا۔ وہ مہر کو قابل کرتی کہ انہیں مل کر ہاشم آفریدی کو زمین کے جنگل سے بچانا چاہیے آخر وہ ان کا کزن ہے۔

”تو میں کیا کروں۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں۔ اچھا ہے، زمین اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ سوٹ کرتے ہیں۔“

مینا کی روز روز کی تکرار سن کر آخراں نے چڑ کر کہہ دیا۔

"ارے واہ کیسے سوٹ کرتے ہیں۔ بلکہ کس اینگل سے سوٹ کرتے ہیں۔ کہاں وہ تک چڑھی بدلتیز زمین اور کہاں اتنے ریفرنڈ۔ شائستہ مہذب ہاشم بھائی۔ ویسے ہائی داوے۔ آپ آج کل کیوں اتنی چڑی ہوئی جارہی ہیں۔"

یہ چڑنا اس کا مزاج نہ تھا سو چوری پکڑی گئی۔
"کوئی نہیں تمہارا وہم ہے یہ، دوسرے تم کیوں اس کی اتنی حمایت کر رہی ہو۔ پہلے تم ان لوگوں کا نام لینا پسند نہیں کرتی تھیں اب وہ بھائی بن گیا۔" اپنی اندرونی کیفیت چھپا کر وہ بڑے نارمل انداز میں اسے لٹاڑنے لگی۔ مینا نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

"جب سے مجھ پر حقیقت کھلی ہے تب سے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسا کھرا بندہ زمین کوٹے۔ بلکہ میری صابر بہن ایسا بندہ ڈیزرو کرتی ہے۔" وہ ہر بات صاف گوئی سے زور دیتی تھی۔ سب ابھی ابھی اپنے خیالات کا اظہار آرام سے کر رہی تھیں۔ مہر کا دل ایک نئے کوزور سے دھڑکا پھر اندر عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ یہ کیا کہہ گئی تھی مینا۔ وہ کمزور سے لہجے میں کہنے لگی۔
"میرے کردار پر سوالات اٹھانے کا جو سبب ہے میں تم ان کو مار جن دے دی ہو.....؟"

"نہیں، بلکہ آپ پر عزت کی چادر تاننے والے سوالی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتی۔ حقیقت کیا ہے؟ کھلی آنکھوں سے دیکھنا سیکھیں۔ پہچانیں کون اپنا ہے اور کون بار آستین۔"
"مثلاً کیسی حقیقت.....؟"

"یہ تو آپ خود کھو گئیں۔" وہ اسے خاموشی سے دیکھے گئی۔ مینا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"جانتی ہیں آپ کے لیے آنے والے رشتے بابا کے علم میں لائے بغیر لوٹائے گئے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ آنے والوں کو آپ کے کردار کے بارے میں ایسی کہانیاں سنائی گئی ہیں کہ کوئی مڑ کر واپس نہ لوٹا۔ بابا کے کزن یاد ہیں آپ

کو۔ ریمان تاپا انہیں آپ بہت اچھی لگی تھیں۔ وہی جن کے فارن پلیٹ بیٹے کے لیے دونوں خواتین کا پیپر جوش تھیں مگر شاید بابا کی بے بسی اور ہمارے ساتھ ان کا سلوک وہ بھانپ گئے تھے۔ مگر ان کی خواہش ظاہر کرنے پر دونوں خواتین نے آپ کے کردار پر وہ چھینٹے اڑائے کہ ریمان تاپا کے چاہنے کے باوجود ان کی بیوی اور بیٹے نہ مانے۔ یہ بات بابا کو بہت بعد میں پتا چلی تھی۔ کبھی وہ اتنے فکر مند اور پریشان رہنے لگے تھے پھر باہر کی مدد سے بابا نے خالہ لوگوں کا پتا لگوایا اور انہیں یہاں کے سارے حالات لکھ ڈالے۔

مہرا یہ لوگ کبھی بھی ہمارے خیر خواہ نہیں تھے اور نہ ہی ہو سکتے ہیں۔ اب بھی ہاشم آفریدی کی شخصیت کو دیکھ کر وہ لوگ پھر سے انہیں بدظن کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی ہمیں خوش رہنے نہیں دیں گے۔ ان کے لیے ہماری اہمیت بس ایک کریڈٹ فارڈ کی ہے۔ جس سے ان کا گھر چل رہا ہے۔"

مینا اس سے زیادہ باخبر تھی وہ سناٹے میں گہری سختی رہی۔ دل پر وہ جھجھک رہی تھی۔

☆☆☆

ہاشم کی بے اعتنائی کے باوجود بھی زمین پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا سرد انداز اسے چیلنج کرنے لگا تھا۔ وہ بہت ضدی تھی۔ سو ہاشم آفریدی سے آسانی سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ ہاشم کو جانا تھا۔ اس کی واپسی کا سن کر مینا اور بابا دونوں بہت اداس تھے، مہر نے نبھانے کیا ٹھانی ہوئی تھی کہ اس کا رویہ اور انداز بدستور ویسے ہی تھے۔ یہ جالی گرمیوں کے دن تھے۔
"ما میں ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ایسے دن مہر کو بہت اداس کر دیتے تھے۔ ہاشم دوپہر کو مینا کے ساتھ بیٹھا تھا جب زمین چلی آئی۔"

"ہاشم میری دوستوں نے آج آپ کے اعزاز میں ایک گیٹ ٹو گینڈر رکھی ہے۔ شام میں تیار رہے گا۔" اس کا استحقاق انداز۔ مینا نے چونک کر اور ہاشم

نے قدزے جیسے سرد انداز سے اسے دیکھا۔
 ”پر میں تو انہیں جانتا ہی نہیں تو میرے لیے
 کیوں.....؟“

”میں تو آپ کو جانتی ہوں ناں.....“
 جتنا انداز مینا کو سلگا گیا۔ ہاشم نے گہری
 سانس بھری۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر
 قدزے کا طمینان سے بولا۔

”زمین بی بی..... میرا انجان لڑکیوں میں کیا
 کام؟ آپ جانتی ہیں مجھے ایہ آپ کا دھوا ہے۔ مگر
 کاش آپ واقعی میں مجھے جانتیں تو اچھا ہوتا۔ ایسی
 گید رنگز۔ ایسی پارٹیز مجھے پسند نہیں۔ نہ ہی میرا معیار
 ہے کہ میں خود نمائی کے شوق میں ایسی چیزوں اور
 جگہوں پر شوق سے جاؤں۔ سو میری طرف سے
 معذرت۔“ مینا کے سامنے اس کے الفاظ۔ انداز
 اسے اپنی شدید بے عزتی کا احساس دلا گئے۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ میرے ساتھ چلیں
 گے۔“ سگلتے لہجے میں قدزے دعوت و ضد تھی۔
 ”شام کو میرا ایک ضروری کام ہے۔“ اس کا
 حوصلہ ضبط کمال کا تھا۔

”مجھ سے جی زیادہ ضروری کام کوئی ہو سکتا
 ہے؟“

”ہے زمین بی بی..... دنیا میں ایسے کئی کام ہیں
 جو کسی کے لیے غیر اہم اور کسی کے لیے ضروری ہیں۔“
 ”جو بھی ہو۔ میں شام میں انتظار کروں گی تیار
 رہے گا۔“ اس کے انداز ہنوز وہی تھے۔ مینا کی
 مسکراتی نظروں کو محسوس کرتے وہ سگلتی ہوئی وہاں
 سے چلی گئی۔ ہاشم سر جھٹک کر رہ گیا۔

”جی تو کیا نہیں گے شام کو؟ شلواری قمیص۔
 پشادری چیل یا ڈیزائنڈ ریس سوٹ۔“ مینا کے شریر
 انداز پر وہ انہوس سے سر ہلا کر رہ گیا۔
 ”اب میرا مذاق اڑاؤ کی لڑکی۔“

”میں..... میری اتنی بساط کہاں۔ یہ کام
 تو زمین بہتر طریقے سے کر ہی لے گی۔“
 ”مجانے اس احمق لڑکی کو کس نے کہہ رکھا ہے

کہ ہر چیز آپ کی پراپرٹی ہوتی ہے۔ جتنا انکوار کرنے
 کی کوشش کرتا ہوں اتنی ہی فری ہوتی جا رہی ہیں۔“
 ”دل میں تولد و پھوٹ رہے ہوتے ہیں لڑکوں
 کے، بظاہر بے زاری و بے نیازی کا اظہار کیا جاتا
 ہے۔“ وہ بدستور مذاق لڑا رہی تھی۔

”ایسا بھی ہوتا ہے بیٹا۔ یہ دنیا ہے اور یہاں
 ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مجھے توئی
 الوقت مہر کی بے اعتنائی پریشان کر رہی ہے۔ امی
 کی بابا سے بات ہو گئی ہے۔ ہم لوگ دوبارہ تجدید
 چاہتے ہیں۔ مجھے انکل نے رضامندی دینے دی
 ہے۔ مجھے آج کل میں واپس جانا ہے۔ وہاں
 میرے کام کا بہت حرج ہو رہا ہے مگر مہر..... مگر
 چاہتا ہوں وہ اپنی دلی رضامندی سے میری طرف
 بڑھے، میری بات سنے اور دل میں دبائے سارے
 گلے سارے سوال باہر نکال دے۔ بغیر کسی دباؤ
 کے مجھے اپنائے۔ انکل سے بھی میں نے یہی کہا
 ہے کہ اسے زبردستی پریشاں مت کریں۔ دلی
 رضامندی سے اگر وہ میری جانب بڑھتی ہے تو
 ٹھیک ورنہ..... ایسا ہو سکے گا مینا.....؟“

اس کا افسردہ لہجہ اور آنکھوں میں مائل پڑتی
 چمک مینا کو ایک لمحہ لگا تھا۔ اس نے پچھلے
 لہجے میں کہا۔

”ایسا ہی ہوگا ہاشم بھائی۔“ وہ میں چلے سے سر
 ہلا کر رہ گیا۔ اور واقعی ہاشم شام سے پہلے کہیں چلا
 گیا۔ اسے گھر میں موجود نہ پا کر زمین کا خصے کے
 مارے برا حال تھا اس کی احساس اسے سلگائے دے
 رہا تھا۔ اس کا نمبر بھی مسلسل بند آ رہا تھا۔ تھک ہار کر
 اس نے خود کو خصے سے کمرے میں بند کر لیا۔ آج کی
 شکست اسے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ نظر انداز
 ہو۔ یہ کیسے ممکن ہو گیا تھا۔ اور اسی شام بابا نے مہر سے
 بات کر لی۔

”بیٹا..... تمہاری خالہ امی اس نادانی پر بہت
 شرم سار ہیں اور بار بار معافی مانگ رہی ہیں۔ یہ سارا
 کھیل اسی گھر میں رچایا گیا تھا اور مہرے بھی ہم ہی

کی بات ہے۔ سادگی سے نکاح کر دیں گے۔ زیادہ
تھام جھام کی ضرورت بھی نہیں۔ اور پھر ہم ان کی داغ
دار بیٹی لے رہے ہیں۔ انہیں تو الٹا ہمارا شکر گزار ہونا
چاہیے۔ ”چچی کی مخصوص چینی آواز اسے خوف زدہ
کرنے لگی۔

صاف کیا تھا۔ تصویریں بھیج بھیج کر۔ فون کر کر کے

انہیں یقین دلایا تھا کہ مہر کی دلچسپی دوسرے لڑکے میں ہے اب دوسرا آ گیا ہے۔ نجانے کیا نیت ہے اس لونڈے کی۔ معاذ کوراضی کریں کسی طرح۔ کہہ دیں کہ پہلے ہماری مرضی سے جہاں چاہے بیاہر چالے۔ مہر کا کیا ہے۔ ایک کونے میں اب بھی پڑی ہے بعد میں بھی پڑے رہے گی۔“

مہر بمشکل بے جان ہوتے وجود کو کھینچتی کمرے تک لائی۔ مینا سوری تھی۔ پٹھے کی ہلکی گھوٹ گھوٹ اس کے اندر کی ٹھن اور جس کو حرید بڑھارہی تھی۔ وہ پچھلے احاطے میں کھلتے والا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ آسمان پر چاند غائب تھا ستاروں کی مدھم روشنی میں وہ جگہ بہت بھیا تک سی لگ رہی تھی۔ مگر ان کے رشتوں سے زیادہ نہیں۔ ساکن فضا میں اس کی تیز ہولی سانسوں اور کھنٹی کھنٹی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ مفاد پرستی اس کے گل کو کھا گئی تھی اور آنے والے گل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ رشتے مانتے کیا اتنے خود غرض ہوتے ہیں؟ شاید ایسا ہی ہو۔

آج اس کی ہر خوش گمانی، خوش چہی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ساکن فضا میں اس کے قطار در قطار گرتے آنسو اس کے اندر کے جس، دکھ کو ختم نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ آج رورہی تھی ہر اس دکھ پر جو اس نے صبر سے سہا تھا۔ ہر اس الزام پر جو اس نے چپ چاپ سہا تھا۔ ہر اس چوٹ پر جو اس کے پندار کو اس کے کردار کو ضرب لگائی اسے چور چور کرتی رہی تھی۔ جانی گرمیوں کی اس ہلکی سی ٹھنڈک سموئے رات اس لڑکی کو دکھ سے دیکھ رہی تھی۔

”مہر.....“ آنے والے کو حیرت سے دیکھا اس کا سلکتا وجود ایک لمحے میں ساکت ہو گیا۔ پھر جیسے ایک سیل رواں تھا جو جاری ہو گیا۔

”آپ اس وقت یہاں کیا ہوا؟ جو آپ کے ضبط کو بہالے گیا.....؟“

اس کا نرم لہجہ ویسے ہی میٹھا تھا۔ اس نے سراٹھا کر اس اجنبی مہربان کو دیکھا۔ اس کے قد آدم جھولے

کے پس منظر میں جھانکتے وہ درخت کیسے عجیب سے لگ رہے تھے۔ مہر کا ہر خوف نجانے کہاں جا سوتا تھا۔ ایک لاوا سا پھنسنے کو بننے کو، تیار تھا۔

”آپ کیا کر لیں گے جان کر..... کیا کر سکتے ہیں۔“ اس کا ورشت لہجہ سن کر وہ بے اختیار ہنچوں کے بل جھک کر بیٹھا تھا۔ قدرے جھکتے اس نے نیم اندھیرے میں دکتے بھیکے چہرے کو اسردگی سے دیکھا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے وہی کر لوں گا۔“ ”میرے چاہنے نا چاہنے سے آج تک کچھ ہوا ہوتا تو میرا کل اتنا داغ دار نہ ہوتا۔ میرا آج اتنی بے یقینی کا شکار نہ ہوتا۔ میرے آنے والے گل میں اتنی دھند نہ بھری ہوتی۔“ اس کا لہجہ وحشت زدہ تھا۔ اس کے اندر روٹی کر لائی خاموشی آج ٹوٹ گئی تھی۔ دھول سے الٹی بیڑھیوں پر انگوٹوں سے پر چہرے کے ساتھ وہ کوئی جو کن لگ رہی تھی۔ ہاشم نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

”ماپوسی کی دھند میں اکثر امید کا ستارہ واضح نظر نہیں آتا مگر ہوتا ضرور ہے۔ صرف آنکھوں کے جالے صاف کرنے کی دیر ہوتی ہے۔ ہر رستہ واضح ہو جاتا ہے۔ ہر دیا جل اٹھتا ہے۔ آپ امید کا دامن تھامیں تو.....“

اس کے مرہم زدہ لہجے پر وہ بے اختیار رونے لگی۔

”آپ یہ باتیں کر سکتے ہیں۔ مگر ہم جیسے لوگ جنہیں صعبوتوں کا خار ہمیشہ تار تار کر دیتے ہیں حرف اندھیروں میں ہی ٹانگ ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ صرف اندھیرے کو ہی اپنا مقصد مان لیتے ہیں۔ کیا آپ لا سکتے ہیں۔ میری ماں کو..... میرے بچپن کی بے فکری کو..... میرے لڑکپن کے سنہری دور کو..... میرے کردار پر اچھالے گئے کیچڑ کر صاف کر سکتے ہیں۔ یا میرے معذور و بے بس باپ کو پہلے جیسا کر سکتے ہیں۔ کر سکتے ہیں کیا؟ جواب دیں..... بولیں۔“ اس کے پے در پے سوالات کو سننا ہاشم آفریدی سانس

مہرنا آہستہ سے اس کے برابر اپنی دھول زدہ میٹروں پر آ بیٹھا تھا۔ آسمان پر سینکڑوں ستارے تھے مگر آج نہ جانے کیوں ہر روشنی بہت جلدی بجھی لگ رہی تھی۔

ایک نظر اس نے برابر پیشی مہر کو دیکھا جو آج بہت شکستہ لگ رہی تھی پھر نظر سامنے موجود ان بے ترتیب الجھے ہوئے میٹروں پر جھکا کر حوصلہ دیتے لہجے میں بولا تھا۔

”گزر اچھا وقت واپس نہیں آ سکتا مہر وہ نہ ہی جانے والے بھی پلٹ کر آتے ہیں۔ جو آزمائش قدرت کی طرف سے ہو وہ تو مبروہ وصلے سے جھپٹتی ہی ہوتی ہے مگر انسانوں کی طرف سے لٹنے والی اذیتوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔ بس دل بڑا کر کے ایک موقع دینے کی دیر ہے۔“

”آپ کے پاس کون سا مرہم ہے؟ کون سا مداوا کرنے کے دعوے کرنے آئے ہیں آپ۔“ وہ ہنوز بے یقین تھی۔ بے اعتبار تھی۔

”تم موقع تو دو مجھے۔ اگر کامیاب نہ ہو سکا تب سزا کا فیصلہ سناؤ۔ میں مانتا ہوں امی سے غلطی ہوئی۔ تمہارے ارد گرد رہنے والوں کو جانتے بوجھتے ان کی باتوں پر اعتبار کر لیا۔ مگر صرف تمہاری خوشی کی خاطر۔ جب انہیں بتایا گیا کہ تمہاری رضا معاذ کے ساتھ میں ہے اور حاتم بھائی سے یہ رشتہ تم انکل کی وجہ سے زبردستی بھیج رہی ہو تو امی نے صرف تمہاری خوشی کے لیے یہ فیصلہ کیا مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے جھوٹے فریبی لوگوں پر یقین کر کے تصدیق نہ کی۔

بتول جچی اور تمہاری پھوپھو کی ملی بھگت سے یہ سب ہوا تھا۔ مگر قصور و ارادی بھی ہیں اگر وہ یہاں آ جاتیں تو شاید یہ سب بہت مختلف ہوتا مگر شاید پھر میں یہاں اس وقت نہ ہوتا۔ تمہارے سامنے دست طلب پھیلائے ہوئے۔“ اس کے گہرے ہونے لہجے میں۔ اس آخری جملے میں نہ جانے ایسا کون سا اثر اس تھا کہ وہ جو فرش پر نظر میں جمائے سب سن رہی تھی بے ساختہ اسے دیکھنے لگی۔ ہاشم نے بھی اسی لمحے اسے دیکھا

تھا۔ اپنی جانب بکتی مہر کو نگاہوں کے حصار میں لیے وہ حریف کیے گیا۔

”حاتم بھائی نیڈرل تھے۔ تم ان کے لیے صرف ایماں کی پسند کردہ لڑکی تھیں سوان کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی میں چلا آیا۔ تمہارے بابا کے وہ سارے خطوط میں نے ریسیو کیے تھے اور یہاں کے سارے حالات جاننے کے بعد میں نے امی، بابا کو اعتماد میں لے کر سب بتا دیا۔ تم نہیں جانتیں مہر۔ امی تب سے بہت بے چمن ہیں۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ میں بھی جلدی آ جاتا مگر کچھ معاملات نہانے تھے۔ ویسے اس پہاڑی پر تمہیں زخمی دیکھ کر ہی میں ٹھنک گیا تھا کہ یہ چہرہ ابھی نہیں بلکہ صدیوں سے آشنا ہے۔“ ہاشم کی آنکھوں سے نکلتی گرم شعاعیں۔ اسے اپنے حصار میں لینے لگی تھیں۔ وہ آہستہ سے رخ پھیر کر سامنے بیڑوں کو کھنسنے لگی۔ ہلکی دھیمی ہوا اب چلنے لگی تھی۔ اپنی کیفیت اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس سے نظریں چرائے وہ خود کو بہت احمق لگ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں یہ جگہ..... یہاں موجود ان بیڑوں سے تمہیں بہت انسیت ہے۔ یہ خالہ کے ہاتھوں لگائے ہوئے ہیں ناں۔ تو پھر خالہ کے اس جیتے جاگتے بھانجے سے اتنا گریز کیوں؟“

”کیونکہ ان سے محبت کرنے والے اور بہت لوگ ہیں۔“ اس کے نزدیک انداز پر اس کا قبقبہ بے ساختہ تھا۔

”ہائے گاڈ اس دن زمین نے جھوٹ بول کر یونیورسٹی بلوایا تھا۔ کہ ٹرانسپورٹ نہیں مل رہی۔ اور اس کی طبیعت اچانک سے بہت خراب ہو گئی ہے۔ تب نا چاہتے ہوئے بھی مروتا میں چلا گیا۔ حالانکہ میرے پاس کوئی مرسیڈیز کار نہیں تھی۔ میں تو خود بائیک کی بائیک ادھار لے کر نکلا تھا۔ مگر لگتا ہے تم اب تک اس بات کو دل سے لگائے ہوئے ہو۔“ جھٹک کر اسے دیکھتے اس کے چہرے پر شریں چمک گئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ خوش نہیں ہے آپ کی۔“

وہ صاف مکرگئی تو ہاشم مسکرا دیا۔

”مہرا میں نے انکل سے پہلے ہی کہہ دیا کہ مہر کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ مت پہنچنے گا۔ مگر انکل پر بہت پریشر ہے۔ تمہارے چچا معاذ کے رشتے کے لیے زور دے دیں۔ انکل بہت مزور ہیں اگر تمہارے دل میں اب بھی کوئی گرہ کوئی شک، شکوہ ہے تو تم کھل کر کہہ دو۔ میں رشتوں میں زبردستی کا قائل نہیں محبت میں کیسے جبر منکھور کروں۔“

اسی نرمی سے کہتے اس نے ساکت ہنسی مہر کو بغور دیکھا۔ مہر نے نظریں اٹھائیں۔ چند لمحے وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر سچائی تھی۔ ایمانداری تھی اور سب سے بڑھ کر محبت کی روشنی۔

”محبت کا دھوئی کر رہے ہیں آپ..... اور اس دھوے کی سچائی تو وقت ہی ثابت کرے گا۔ اور میں اس دن کا انتظار کروں گی جب دھوے سے یقین تک سفر کر کے اعتبار کی دولت سے مالا مال ہو جاؤں اور میرے کردار پر اچھالی گئی سیاسی دھل کر شفاف ہو جائے۔“

اس کی بات میں اقرار تھا۔ ہاشم آفریدی کی آنکھوں میں روشنی ایک دم سے بڑھ گئی۔

”وقت ہر فیصلہ خود کر دیتا ہے مہرا! اور مجھے اپنے دھوے کی سچائی کا یقین ہے اور یہ یقین ایک دن آپ کے دل میں بھی اترے گا۔ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔“

اس کا یقین دلاتا لہجہ مہر کو پرسکون کر گیا۔

☆☆☆

”مہر بعض لوگوں کو وقت خود سزا دیتا ہے اور کڑی سزا۔ دوسروں کی راہ کھولنے والے خود بھی نشان منزل نہیں دے سکتے۔“

پھوپھو کو دیکھو وہ آج کل میں واپس سیالکوٹ جانے والی ہیں۔ سائرہ کی سسرال والے فراڈ نکلے۔ نہ گھرانے کا اپنا تھا اور نہ گاڑی جائیداد..... دو بچوں کو لے کر سائرہ کئی مہینے اجہر آ کر چیمپی رہی مگر اب انکل کے بچھانے پر وہ واپس چلی گئی ہے۔ انکل شاید لڑکے کو کوئی کاروبار کروادیں۔ مگر پھوپھو اب بھی مطمئن

نہیں۔ سنا ہے کہ اسد بھائی کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ انکل کی ایک جاننے والی کی ٹیلی میں اور یہ بات چار پانچ سالہ پرانی ہے۔ پھوپھو کو ہنسک بھی نہیں بڑنے دی گئی۔ پھوپھو تو یہ سن کر شا کڈ ہی رہ گئیں۔ انکل ان کی خود سری سے سدا کے مالاں تھے سو انہیں اس طرح سزا دے رہے ہیں۔ سیما کی دو مشکلیاں ٹوٹنے کے بعد انکل نے سیالکوٹ میں اپنے بھائی کے گھر اس کی بات ٹھہرا دی ہے۔ پھوپھو اور سیما نے بہت واویلہ مچایا مگر اسد بھائی نے دونوک کہہ دیا ہے کہ اگر انکل کے فیصلے نہ مانے گئے تو وہ ”بیرونی امداد روک دیں گے۔“ پڑھتے پڑھتے وہ اس اصلاح پر مسکرائی۔

”اب وہ پھوپھو ایسی بھی بے وقوف نہیں۔ سو سیما کے شور شرابا کرنے کے باوجود سیالکوٹ سدھار رہی ہیں۔ ہائے وہ ان کے اونچے خواب۔ سچ ہے کہ انسان کو نظریں ہمیشہ زمین پر رکھنی چاہیے۔ سنا ہے کہ لڑکا جنرل اسٹور چلاتا ہے۔ سچ ہے۔“

کرکری تو بول چچی کے ساتھ بھی بہت ہورہی ہے معاذ بھائی تو پسند کی شادی کر کے سسرال سدھار گئے۔ یہ عید مہم تو نہ تھا کہ زمین نے مالا لنگ کے بعد کلاسیکل رقص سیکھنے کو اکیڈمی جوائن کر لی تھی۔ یہ خبر تو چچی نے بہت چھپانے کی کوشش کی مگر باہر کو پتا لگ ہی گیا۔ اسی بات پر ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا ہے زمین سے۔ کیوں کہ وہ اب ایک شو کے لیے اپنی پر فارمنس سے تھلکہ مچانے دینی جا رہی ہے۔

وہ تاپا ابو جن کی عزت پر ہماری وجہ سے بھٹ لگتا تھا اب اپنی نور چشمی کی حرکات سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ چچی کا بیانی تو آج کل مسلسل بلندی پر ہی رہ رہا ہے سو میں تو ان کے سامنے جانے سے مکمل اجرا ز کرتی ہوں ویسے بھی اپنی بیٹی کی شکست کے بعد انہیں میں اور بھی زہر کھنسنے لگی ہوں (ہاشم بھائی کا دیا گیا زخم محترمہ زمین ابھی تک نہیں بھوئیں) کل تک آپ کو داغ دار کہنے والی۔ آپ کی عنیت کو دل پٹواری کہنے والی چچی سے بہت پوچھنے کو دل چاہتا ہے کہ اب

چچی بند شعلہ نمبر 159 2022

بتائیں۔

یہ جو زمین سیولیس بنے ریمپ پرواک کرتی ہے تب ان کی شان دار تربیت کہاں جا چھیتی ہے۔ بابر نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ زمین کو لگام ڈال لیں ورنہ وہ ان کے ساتھ اب مزید نہیں رہ پائے گا۔ یہ سن کر چچی نے حسب عادت و سابق شور مچانے کی بہت کوشش کی مگر اس بار چچا بھی بابر کے حامی نکلے۔

وہ زمین بی بی کے ایک مہربان پروڈیوسر انہیں ایک گزری اپارٹمنٹ دلواریے ہیں۔ شاید وہ وہیں شفٹ کر جائے۔ چلیں۔ خس کم جہاں پاک۔ اور ہاں آخر میں ایک اور بات۔ بابر نے مجھے پروپوز کیا ہے اور میں نے اس کا یہ پروپوزل چند شرائط کے ساتھ قبول بھی کر لیا ہے۔ حیران مت ہوں۔ اگر وہ ان شرائط کو پورا کر سکا تو ٹھیک ورنہ..... اور شرائط بھی کچھ ایسی مشکل نہیں۔

اگر وہ یہ سارا کاروبار خود ٹیک اور کرے اور ہر مہینے ایمانداری سے میرے بابا کا حق لاکر ہاتھ پر رکھے۔

چچی کو لگام میں ڈالے۔ بلکہ ان کے لیے الگ گھر کا انتظام کر کے انہیں یہاں سے بھدا احترام رخصت کرے۔ (بہت عیش کر لیے انہوں نے۔) تیسری اور اہم شرط یہ کہ وہ ہمیشہ میرے اور بابا کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ بابا کا بیٹا بن کر۔ اور خوشی شرط کہ وہ پچھلے احاطے کو صاف کروا کر ٹھیک کر دے گا بلکہ ایک چھوٹا سا گارڈن بنوائے گا جہاں جب آپ آئیں گی تو ہم دونوں بابا کے ساتھ شام کی چائے پیا کریں گے۔ اور ہاں کام تو میں بالکل نہیں کروں گی (کچھ شرائط بہت پرسنل و کانفیڈنشل ہیں)۔

چلیں اب اجازت دیں۔ آپ سے آدمی ملاقات تو ہوئی۔ رات کا ایک بج رہا ہے۔ بابا آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں اور اس چھوٹے کو بھی۔ ذرا اپنے صاحب سے کہیں کہ آپ کو ساتھ لیے حاضری دینے آجائیں۔ ان کے مریضوں کی بات کچھ دن کوئی اور کرے گا۔

..... تہہ کرتے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ہاشم کا ٹرانسفر جس بستی میں ہوا تھا وہاں اکثر موبائلز سگنلز کا مسئلہ رہتا سوا یہی میں جینا کے لئے والے خط اس کے اکیلے پن کا احساس کم کر دیتے تھے۔ دنیا مکافات عمل ہے اسے یقین آ گیا تھا۔ شادی کے ان چار سالوں کے دوران ہاشم نے اسے اپنی عزت، اپنی محبت دی تھی کہ ہر وہ زخم سلتا چلا گیا جو کبھی ناقابل علاج لگتا تھا۔

خالہ کے ساتھ نے ماما کی کمی پوری کر دی تھی حاتم بھائی بڑے بھائیوں والا مان دیتے تھے تو انکل ایسے نبی سمجھتے اور بے بے کے لیے تو وہ سب کچھ تھی۔ وہ اس کے بہت جاؤ کرتیں۔ ان چار سالوں میں۔ وقت نے ہر شے اس کی جھولی میں ڈال دی تھی صارم آفریدی سمیت۔ کھڑکی کے راستے لان سے آنے والی ہاشم کی زندگی سے بھرپور آواز سن کر اس نے خط دراز میں رکھتے ہوئے چچی اور پھوپھو کے حالات کے بارے میں سوچا تھا۔

دروازہ کھول کر اس کی زندگی اس کا مان۔ چہرے پر وہی مہربان، نرم مسکراہٹ سجائے کر چچی آنکھوں میں روشنی لیے صارم کی انگلی تھامے اندر آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر بہت محبت و عقیدت سے اس مہربان کو دیکھا کہ آج اسے بتانے کا وقت آ گیا تھا کہ اس کے دعوے سچ تھے۔ اس کی محبت پر گواہی دیتا یقین سے ماما مال دل گواہ تھا کہ وہی اس کا مسیحا تھا اور ہے۔ وہ سب تلخ فیس یوں ہی آتی تھی اور اگر حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے تو مجھے ہاشم آفریدی جیسا محبت کرنے والا شخص شاید کبھی نہ ملتا۔

اعتماد سے اس کی جانب بڑھتے اس نے بہت دل سے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆

بچوں کو اکول بھیج کر وہ ابھی بکمر اکمر سیٹ
 رہی تھی کہ اس کی اماں بفل میں کچھ فائیں داہے اندر
 چلی آئیں۔

”سب خیر تو ہے ماں اماں! آپ اتنی بچ
 سو رہے کیسے؟“
 شادق نے تشویش سے ماں کو دیکھا۔ جن کے
 ”ستے ای خیراں نے..... تو بس ادھر آ میرے
 پاس بیٹھ۔“ گہری مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے
 ہاتھ پکڑ کر اسے بھی پاس بٹھایا۔

زرقا سکندر

سٹارڈ کی نصیحت



اعتراض نہیں دونوں بخوشی اپنے حق سے دستبردار ہو رہی ہیں تو پھر میں کون ہوں بھلا اس بارے میں بولنے والی۔

اماں سوالی بن کر آئی تھیں انہیں خالی ہاتھ کیوں کر لوٹائی، جو اس پر نگاہیں جمائے پیار سے چمکارتیں جواب اس کی ہنستھیں۔

شارقہ نے بھی چپ چاپ کاغذوں پر انگوٹھا لگا کر قائلیں ان کے حوالے کر دیں۔ اس کی تابعداری پر نہال ہوئیں اماں آٹھل بھر بھر کے دعا میں دیتی اٹھ کر چل دی تھیں۔

”کیا تھا جواماں میرا بھی تھوڑا شیال کر لیتی تھی۔ یہ تو میرا جائز حق تھا اور ابا کی وصیت بھی یہی تھی۔ چند لاکھ روپوں سے کسی کو قطعاً کوئی فرق نہ پڑتا مگر میری زندگی ضرور آسان ہو جاتی۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

عبدالستین، اس کا شوہر دو برس پہلے تک بڑا کڑیل جوان تھا۔ ایک روز دفتر جاتے ہوئے اس کی موٹر بائیک سامنے سے آئی گاڑی سے ٹکرائی۔ وہ اچھل کر دروازہ جا کر اجان تو بچ گئی مگر کمر پر شدید چوٹ آنے سے نچلا دھڑاتنا متاثر ہوا کہ وہ چلنے پھرنے سے ہی معذور۔ علاج کی خاطر اس نے خوب پیسہ بھی بہایا مگر افاقہ پھر بھی نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ اس کی نوکری بھی جاتی رہی۔ اچھے وقتوں میں لیا گیا وہ غلامت بھی فروخت کرنا پڑ گیا جس پر بھی ایک چارہ سا گھر بنانے کا خواب ان دونوں میاں بیوی نے دیکھ رکھا تھا۔

☆☆☆

بچیوں کی پڑھائی، گھر کا کرایہ اور باقی اخراجات پورے کرنے کے لیے سلطوت بھانجی باقاعدگی سے اسے ہر ماہ کچھ رقم دے جاتیں اور پھر پورا مہینہ پلٹ کر پوچھنے کی رودار نہ ہوتیں، آیا وہ کس حال میں ہے۔ ہمایوں بھائی تو ویسے ہی اپنے کاروبار میں مصروف رہتے۔ بہن سے اس کی خیریت دریافت کرنے کی فرصت ہی کب تھی۔ اس لیے گھر کی گرنا دھرتا، سیاہ سفید کی مالک سلطوت بھانجی ہی

”بڑی امید لے کر آئی ہوں تیرے پاس۔ وعدہ کر سکتے تھے۔ کچھ مایوس نہ لوٹائے گی۔“

”عقل تو کریں اماں۔۔۔۔۔ آخربات کیا ہے؟“

شارقہ نے بڑی تابع داری سے جواب دیا تو اماں نے فوراً سے وہ قائلیں اس کی گود میں ڈال دیں اور تکیں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے۔

”دیکھ شارقہ! ہمایوں تم دونوں کا ایک ہی بھائی ہے اللہ زندگی دے اسے میرا بڑا ہی فرماں بردار ہے پھر کیا کچھ نہیں کرنا آیا اپنی بہنوں کے لیے بھی۔۔۔۔۔ بات اب یہ ہے کہ تیرے ابا کی زمین پر کارخانہ لگانا چاہیے۔ عالیہ کا تو پتا ہی ہے ناں۔۔۔۔۔ اپنے گھر میں کتنی سستی ہے، اس نے تو راضی خوشی ان کاغذوں پر دستخط کر دیے ہیں اور میں نے بھی اپنا حصہ معاف کر دیا ہے۔ چل اب تو بھی جلدی سے ان سب پر انگوٹھے لگا ڈال۔ بے شک جائیداد تو تیرے باپ کی ہی ہے پر اس تھوڑی تھوڑی رقم سے ہم میں سے کسی کا کچھ نہیں بننے والا۔ ہاں مگر سب کا ملا کے اس بھلے مانس کا ضرور کچھ بن جائے گا۔“

”اماں!“ شارقہ کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں لہرا اٹھیں۔ کبھی اماں اور کبھی بستر پڑے اپنے بیمار شوہر کو دیکھنے لگتی۔

ابا کی جائیداد میں سے حصہ ملنے سے حالات کے بہتر ہونے کی اس واحد امید کے ختم ہونے پر۔۔۔۔۔ مستقبل میں پیش آنے والی بے سروسامانی کا خوف ناک منظر اس کی نظروں میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ تو نے خرچے کی بالکل بھی فکر نہیں کر لی۔ تیرا بھائی ہے ناں۔۔۔۔۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی میری بھئی۔“

جوبات شارقہ لیوں سے نہ کہہ پائی وہ آنکھوں نے بیان کر دی جسے اماں بخوبی سمجھ گئی تھیں تب ہی پیار سے اس کی کمر کو تھپکاتے ہوئے انہوں نے یقین دہانی کروائی۔

مجھے بڑا ہی آسرا ہو جاتا اگر یہ چند لاکھ بھی مجھے مل جاتے۔ مگر اب جب اماں اور عالیہ میں سے کسی کو

رکھنے لگتے ہیں کہ وہ ہر وقت روتا دھوتا اور بڑے حالوں میں ہی نظر آئے۔ حالانکہ دل اور جذبات انسان امیر ہو یا غریب سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہماری وجہ سے کسی کا وقت اور حالات اچھے گزر رہے ہیں۔

سلطوت کو بچوں کی یہ طرف داری کہاں بھاتی بھلا اس لیے مزید کچھ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بھی سخت ہو گیا تھا۔

”صبح کے نکلے رات گئے واپس آتے ہیں تمہارے پاپا۔ دو دو گھروں کے اخراجات پورے کرنے میں اسے الجھے۔ ہیں کہ انہیں اپنا بھی ہوش نہیں اور تم لوگ ہو کہ مجھے ہی غلط ثابت کرنے پر تلے ہو۔“

وہ بے بسی وہ اپنے موقف سے نہ ہٹنے کی شدت سے قائل تھیں۔

”میں بھی پھر بالکل ٹھیک کرتی ہوں۔ تمہارے پاپا ہر ماہ جو رقم شارقہ کے لیے دیتے ہیں ان میں سے آدمی رکھ کر ہائی اسے دے آتی ہوں اب کسی کو تو خیال کرنا ہوگا۔“

”ماما! پھوپھو کے پیسے روک کر آپ بالکل بھی اچھا نہیں کر رہی ہیں۔“ ماں کے اس انکشاف پر دونوں بچوں نے یک زبان احتجاج کیا۔

”کتنی ضرورتیں ہوں گی جو پوری ہونے سے روک جاتی ہوں گی۔ اوپر سے مہنگائی کا زمانہ ہے اتنے کم روپوں میں مہینہ گزارنا پھوپھو کے لیے کس قدر مشکل ہو جاتا ہوگا۔“

”اچھا جی..... تم دونوں کا مطلب ہے کہ سارے پیسے ایک ساتھ اسے دے آیا کروں تاکہ وہ پونجی بے فکری سے اڑائی پھرے۔ سسرال والے تو ویسے ہی کنگلے ہیں اس کے کسی کا کچھ فرض فریضہ نہیں سوائے ہمارے۔ ارے بھی دیکھ لینا کل کلاں کو اس کی بیٹیاں بھی تو ہم ہی نے پہنی ہیں تب کتنا روپیہ درکار ہوگا تو کیوں نہ میں ابھی سے سوچوں اس بارے میں۔“

تھیں۔
”بھئی بڑی ہی بے وقوف ہے یہ شارقہ بھی۔“
بھابھی گھمراہتے ہی بولنے لگیں۔
”ماما..... کوئی بات ہوئی ہے کیا پھوپھو کے گھر۔“

عدیم اور لیسہ بھی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ان کے پاس چلے آئے، جلی بھنی سلطوت صوفے پر گر کرنے کے انداز میں جا بیٹھیں۔

”اب کیا بتاؤں تم لوگوں کو..... لڑکیوں کو اس نے پتلونیں پہنا رکھی ہیں اور خود شارقہ بیگم نیا گور جوڑا پہنے گھر میں بیٹھی ہے۔ کون اسے ٹھنڈ کہے۔ اچھا پھر خود ہی مجھے بتانے لگی کہ بھابھی یہ سوٹ تو میں نے پچھلے برس سل میں سے خریدا تھا۔ آج ایسے ہی دل چاہا تو پہن لیا۔ لو بتاؤ بھلا ایسے خرچے پورے ہوں گے۔ خاوند تمہارا بستر پہ، ذریعہ آمدنی ہے کوئی نہیں اور اوپر سے انہیں عیاشیاں سوچھی ہیں۔ ہاں جی پتا ہے ناں انہیں کہ مہینے بعد بھائی کی طرف سے خرچے کا لفافہ آ جاتا ہے اس لیے جی بھر کے اڑائے جاؤ۔“

”ماما جینو تو آج کل سب لڑکیاں پہن رہی ہیں اور پھر پھوپھو کی بیٹیاں تو بہت چھوٹی ہیں کیا ہوا جو انہوں نے بھی پہن لیں۔“

لیسہ کو ماں کی بات پر تعجب بھی ہوا اور تاسف بھی اس لیے خود کو بولنے سے روک نہ پائی۔ اسے شارقہ پھوپھو کی دو سال سے لے کر آٹھ سال تک کی اوپر تلے کی چاروں بیٹیاں ہی بڑی پیاری لگتی تھیں۔

”جینیں جی ضرورت ہی کیا ہے ایسے لیشون کی..... آج چھوٹی ہیں تو کل بڑی تھی ہوں گی پھر کہاں سے پورا کرے گی ان کے لباس۔“

لیسہ کو کڑے تیوروں سے گھور کر سلطوت ہاتھ نچا کے بولیں۔

”ماما..... لیسا آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“
عدیم بھی بہن کا ہم خیال نکلا۔

پتا نہیں، ایسا کیوں ہے کہ ہم جب اپنے کسی بہن بھائی کی مدد کرتے ہیں تو ان سے یہ توقع کیوں

”اما مگر آپ ہی تو کہتی ہیں کہ ہر پچاس سال صیب خود لے کر آتا ہے۔ کل کی کل دیکھی جائے گی ان کا آج تو اچھا ہونے دیں۔“

”کل جب خود کمانے لگو گے تو بھلے میری طرف سے ساری تحوہ اپنی پھونگی کو دے آتا میں آج جو کر رہی ہوں وہ مجھے کرنے دو۔ آئے بڑے سمجھانے والے دونوں۔“ بچوں کو اپنا حیا تہ نہ پا کر وہ خفا خفا سی بحث کو سینیٹی اٹھ کے اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

عبدالستین کی طویل ہوتی بیماری، اس کے علاج پر اٹھنے والا خرچہ اور دیگر اخراجات کے باعث شارق کی بڑھتی مشکلات، ان گزرتے سالوں میں اماں بھی تو نہ رہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو حالات شاید بہتر ہوتے۔ انہی سب مجبوریوں نے پریشان حال شارق کو ایک روز سلطوت بھابھی کے ہاں لا پہنچایا۔

”ڈاکٹر نے ان کی دوائیاں بڑھا دی ہیں بھابھی! فرق نہ پڑا تو ممکن ہے آپریشن کی نوبت آجائے۔ ہمارا خرچہ کچھ بڑھا دیں تو بڑا احسان ہوگا آپ کا۔“

”یہ کیا کام پکڑ لیا ہے تم نے بی بی..... عبدالستین کی دوائیوں تک تو ٹھیک ہے۔ باقی خرچے تو کم رکھو۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلا نا کب سیکھو گی۔“

بھابھی پر اس کی فریاد کیا اثر کرتی وہ الٹا اس پر برہم ہونے لگی تھیں۔ ان کے اعزاز و بیان سے کسی بیگانگی، شارق بچی تو نہ تھی جو اس رویے کو سمجھ نہ پائے۔

”یہ بمشکل ابھی کاروبار سیٹ کر کے بیٹھے ہیں۔ بھلا کہاں سے نکالیں اتنی رقم جو تمہیں پوری پڑ جائے، اس لیے ہماری بھی مجبوریاں سمجھو..... جو مل رہا ہے قیمت جانو۔“ پھر اگلے ہی بل وہ ذرا نرم روی سے گویا ہوئیں۔

”جب حالات ٹھیک نہیں تو پھر ضرورت ہی کیا ہے لڑکیوں کو پڑھانے کی، میری مالتو تو بڑی دوکوتو ابھی

سے تم سلائی سیکھنے پر بٹھا دو، چار پانچ برسوں میں کامیاب درزن میں تو بن ہی جائیں گی۔“

”بھابھی یہ کیا کہہ رہی ہیں۔“ یہ مشورہ تھا بھلا..... وہ کراہ اٹھی۔

”مجھے پتا تھا..... میری صلاح تمہیں کڑی لگے گی۔“ اپنی بات پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ برا مان گئیں۔

”میں اپنی بیٹیوں کو ان کے تعلیمی حق سے محروم رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ حالات کیسے بھی ہوں مگر میں انہیں خوب پڑھاؤں گی۔“

تیزی سے بہہ اٹھنے والے آنسو اس نے ہاتھ کی پشت سے پونچھ ڈالے اور چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔

☆☆☆

یہ ہمایوں بھائی کی دن رات محنت کا ثمر تھا۔ ان کا چڑے کی اشیاء بنانے والا کارخانہ خوب چل لگا۔ جلد ہی دوسرے ممالک میں بھی اپنا سامان بھجوانا شروع کر دیا۔ اب تو ان کا اٹھنا بیٹھنا شہر کے امرا اور شرفاء میں ہونے لگا تھا۔ اور انہی تعلقات کی بدولت وہ تاجروں میں کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔

آج شام حلق لے کر واپس گھر آتے ہوئے ان کے دل میں نمجانے کیا سہلی کہ راستے میں آنے والے ایک بزرگ کے دربار پر فاتحہ خوانی کے ارادے سے گاڑی روک لی۔

دعانا نگ کر باہر نکلے تو دربار کے احاطے میں بیٹھے ضرورت مندوں کی مدد کے لیے انہوں نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ان کا ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا اور وہ تصویر بنے کھڑے تھے سامنے ان کی چھوٹی بہن شارق اپنی چادروں بچیوں کو ساتھ بٹھائے لنگر کھانے میں مصروف تھی۔

ایک آنسو ہی ہمایوں بھائی کی آنکھ سے نہ اترے ورنہ اس ایک لمحے میں ان پر کیا کچھ قیامت نہ گزر گئی تھی۔ وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے غرباء اور مساکین کے درمیان چھٹی اپنی بہن شارق کو دیکھے جا رہے تھے۔

☆☆

1642022



پھیلی قسط کا خلاصہ

قارس کو موبائل پر عدینہ اور حماد کی تصویریں موصول ہوتی ہیں۔ ان تصویروں میں وہ حماد کے ساتھ مختلف ریستوران اور شاہنگ مالز میں ہنسی مسکراتی نظر آتی ہے قارس یہ سب دیکھ کر شیرازی اتر پر اترز جاتا ہے۔ وہاں اس کا سامنا اعظم شیرازی سے ہوتا ہے وہ انہیں بتاتا ہے حماد نے اس کا گھر خراب کیا ہے۔ جیلہ شیرازی قارس سے بڑی مشکل سے رابطہ کرتی ہیں وہ انہیں ابارشن کے بارے میں بتاتا ہے۔ سب سے رابطہ شیرازی میں نکل جاتا ہے وہاں شام کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے وہ اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔

ہارون شیرازی، قارس سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ قارس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہتا ہے آخر میں گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

قارس لاشاری گروپ کو جوائن کرتا ہے اس پر اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسے اغوا کرنے والے جنید لاشاری تھے۔ ادھر عدینہ اور حماد میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اعظم شیرازی حماد کے سارے میں اکاؤنٹ فریز کر دیتے ہیں۔ قارس کو پتا چلتا ہے کہ جنید لاشاری جو جیلہ بیگم کے بھائی ہیں۔ لاشاری کے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ہارون شیرازی اور حماد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ قارس کو جنید لاشاری کے منصوبے کی خبر ہوتی ہے وہ حماد اور



ہارون کو شیرازی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ہر جاتی ہے۔
 جنازے میں وہ اعظم شیرازی کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ یہ چیز جدید لاشاری کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔
 جنت کو لینے فارس پہنچتا ہے تو اس کا سامنا پان سے ہوتا ہے۔ وہ ڈرے سے رہاں کو گود میں اٹھا لیتا ہے۔
 جدید لاشاری فارس کی اعظم شیرازی کے ساتھ قربت دیکھ کر مشکوک ہے۔
 جدید لاشاری اس کی قتل کا الزام فارس پر لگا دیتا ہے کہ اس نے جائیداد حاصل کرنے کے لیے یہ قتل کیے ہیں۔
 فارس، ہارون اور آرزو جہاں سے کھانسی کا نائن اولاد ہے۔
 اعظم شیرازی ہارون کا نکاح نامہ داتا اور فارس کا برٹھ شوٹکیٹ سب پبلک کروا دیتے ہیں۔
 بیٹے اور پوتے کا دکھ اعظم شیرازی کو اندر سے ٹوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنی تمام جائیداد اور بزنس فارس کے نام
 کر دیتے ہیں۔ فارس دن رات ان کی خدمت کرتا ہے۔ ایک رات وہ ان کے کمرے میں ہوتا ہے اور ان کا شکریہ
 ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ وہ اعظم شیرازی سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔
 یہ آخری رات ہوتی ہے اعظم شیرازی کی۔ اگلی صبح وہ دم توڑ دیتے ہیں۔

میسویں قسط

وہ راہداری میں تھی۔ آئی سی یو کے سامنے ہی
 کھڑی تھی۔ سوبائل ہاتھ میں تھا۔ تن گھٹنے ہو چکے تھے
 فارس کو ہاسپٹل سے گئے ہوئے۔ اور ابھی تک وہ وہاں
 نہیں آیا تھا۔ ابھی تک اس کی کوئی کال بھی ریسیو نہیں کی
 گئی تھی۔ سوبائل بند تھا۔ کوئی پیغام۔ خیریت کی کوئی
 خبر۔ اسے کچھ بھی موصول نہیں ہو رہا تھا۔
 جنت کے ہاتھ پر ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ فکر
 خوف اور اندیشوں میں گرا دل۔ بہت شدت سے
 دھڑک رہا تھا۔ اسے اپنی سائیس رکتی ہوئی محسوس ہو
 رہی تھی۔ اس کی پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ وہ اس
 حالت۔ اس پھوٹن میں آخر جا کہاں سکا
 ہے؟ راہداری سے نکل کر اس نے لفٹ کا رخ کیا
 تھا۔ گراؤنڈ فلور پر پہنچے ہی وہ باہر چلی گئی تھی۔
 اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ ہاتھ کپکپا رہے
 تھے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ حلائی نگاہیں یہاں وہاں
 بھٹک رہی تھیں۔ مگر اسے فارس کہیں بھی نظر نہیں آ رہا
 تھا۔
 "تم کہاں ہو فارس۔ پلیز۔ پلیز واپس آ
 جاؤ۔"
 اس کا رخ پارکنگ ایریا کی طرف تھا۔ عجلت
 میں قدم اٹھاتے اب وہ اس کی گاڑی کو ڈھونڈ رہی

تھی۔
 "اگر تم چاہتی ہو، ہمارے درمیان سب ٹھیک
 رہے۔ تو آئندہ اس معاملے میں نہیں پڑو گی تم" وہ
 مسخر۔ وہ آواز۔ وہ کیفیت ایک بار پھر حاوی ہوئی
 تھی۔
 "تمہیں میری فیملی کا خیال نہیں ہے، میں
 تمہیں کس بات سے روک رہا ہوں، اس سے تمہیں
 کوئی فرق نہیں پڑتا"
 "جنت لی لی!" مدحت پریشانی کے عالم میں
 اس کے پیچھے چلی گئی۔
 اس نے منتشر ذہن کے ساتھ ہر طرف دیکھا۔
 تھاوٹ سے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ غم اور
 پچھتاووں میں روح الگ تڑپ رہی تھی۔ اس سے یہ
 غلطی کیونکر سرزد ہوئی۔ اس نے اتنے بڑے امتحان
 میں کیوں ڈال دیا انہیں۔ احساس کیوں نہ کیا۔
 ذہن کے پردوں میں گزرے دھنوں کے کئی
 مناظر پھر سے ابھرنے لگے۔ وہ غرتیں جو بہنوں نے
 دکھائیں۔ وہ رویہ جو خاندان نے اپنایا۔ وہ سزا میں
 جو اس کے لیے جن لی گئیں۔
 ایک بار پھر کوئی حساب شروع ہونے والا تھا۔
 اس کی غلطیوں کا خیار اب کوئی اور بھگتے والا تھا۔

"وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

آنکھوں میں درد لیے وہ مہری سانس لیتا اپنی ہتھیلیوں میں سر گرا گیا۔

"وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ آتم رٹلی سوری یہ سب ہو گیا۔"

اس نے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ بمشکل قدم کھینچا آگے بڑھا۔

ریان کو اٹھائے بغیر حت ان کے پیچھے تھی۔ وہ قارس کو دیکھ رہی تھی۔ نئی محبت تھی اسے جیلہ داؤد سے۔ کہ صرف جدالی کے تصور سے ہی وہ اسے مرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کتنے پرس بیت گئے۔ کتنا بڑا ہو گیا وہ۔ مگر جہاں جیلہ داؤد تھیں۔ وہاں وہ چھوٹا سا قارس ہی تھا جسے اپنی پوری دنیا تاریک ہوئی ہوئی نظر آتی تھی۔

راہداری سے لٹ اور پھر کاریڈور میں قدم اٹھاتا آتی سی یو میں چلا گیا۔ یوں جیسے آنکھوں سے دیکھ کر تسلی کرنا چاہتا ہو جیلہ داؤد کی سانس چل رہی ہیں۔ زندگی سے ان کا تعلق ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ ان کا ہاتھ تھامے ان پر جھکا ہوا تھا۔ وہ آنسوؤں سے تر آنکھوں سے انہیں قریب ہے دیکھ رہا تھا۔

"مئی!"

ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے لب ساکت تھے۔ وہ اس کی پکار پر فوری جواب دیتی تھیں۔ اب نہیں دے رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ اس کی گرفت میں بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ دھڑکنوں کی نشاندہی کرنی لکیروں میں اسے زندگی نظر نہیں آرہی تھی۔

نرس اور ڈاکٹر اندر داخل ہوئے تو اسے ہا ہر جانا پڑا۔ بند دروازے کے سامنے وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے کھڑا رہا۔ گھٹسنا۔ غموں سے چور۔ زخموں سے بڑھ حال۔

جنت اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ بہت نرمی سے بازو سے پکڑ کر اسے بچ پر بٹھایا۔ بانی کی بوسل ہاتھ میں پکڑائی۔ بمشکل چند گھونٹ لیے۔ اب وہ

اس کے قدموں کی حرکت ایک لمحے کے لیے ختم کی گئی تھی کہ بجھکتی ہوئی نگاہیں جس گاڑی پر جا ٹھہری تھیں، وہ قارس کی ہی تھی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔

عجلت میں قدم اٹھاتے اس نے قارس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اگلے ہی لمحوں اس کا وجود ساکت ہوا تھا۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے آگے بازو میں ریان شیرازی تھا۔ خند سے بیدار۔ آنکھیں کھولے۔ اس کے سینے پر سر رکھے ہوئے۔ شرٹ کو پکڑے ہوئے۔ سہا ہوا سا۔

وہ صدمے سے منجمد کھڑی رہ گئی۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

قارس بمشکل سانس لیتا اپنی جگہ ہنوز بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو سفید پڑتا دیکھ سکتی تھی۔

اس نے کس قدر کوشش سے ہاتھ بڑھا کر ریان کو لیتا چاہا۔ مگر ریان نے ایک دم سے روتے ہوئے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ سینے میں منہ دیے رونے لگا۔ جنت نے اسے قارس سے لے لیا جسے مدحت نے سنبھال لیا۔

"قارس!" دروازے پر ہاتھ رکھے وہ تر ہوتے چہرے کے ساتھ قارس کی طرف جھکی تھی۔

اس نے آہستگی سے جنت کی طرف دیکھا۔

اس کی سرخ پڑتی آنکھوں میں جنت کمال کو اپنا آپ ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جو ہمت تھی مخاطب ہونے کی وہ ختم ہونے لگی۔ جو حوصلہ تھا بات کرنے کا مٹنے لگا۔ جس طرح سے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پائے گی۔

"کیا۔ مئی؟" اس کے لب ہلے۔ وہ بمشکل لفظ ادا کرتا۔ ٹوٹا بکھرتا نظر آ رہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ قارس۔" اس نے بے اختیار اس کے ٹھنڈے پڑتے، کپکپاتے ہاتھ تمام لیے۔ وہ رو رہی تھی تو وہ سمجھا۔ کچھ ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو کھو دیا ہے۔

گہری سانسیں لیتا خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جو ایک دلدل جیسی تھی۔

"وہ ٹھیک ہو جائیں گی" اندر سے ریزہ ہوتے جنت کمال نے اوپر سے مضبوطی دکھائی۔ وہ مضبوطی جو اس نے اپنے سجدوں اور دعاؤں سے لی تھی۔

وہ بیٹھا رہا۔ یوں جیسے کوئی آواز اس تک نہ پہنچ رہی ہو۔ اس کے اندر سب کچھ ایک دم سے تھما ہوا تھا۔ نہ شور، نہ آوازیں۔ نہ جی نہ پکار۔ وہ اس کی آنکھوں میں حزن کا سمندر دیکھ سکتی تھی۔ اس کے چہرے سے کرب کی تحریر کھوج سکتی تھی۔

اس نے قارس کا ٹھنڈا پڑتا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس نے ہاتھ نہیں جھٹکا۔ غصہ نہیں دکھایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ وہ دہرا رہی تھی۔

"آئی بہت بہادر ہیں۔ وہ اپنی بیماری سے لڑنا جانتی ہیں۔ وہ جلد اٹھ جائیں گی۔"

وہ چپ رہا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ جنت کی گرفت اس کے دانے ہاتھ پر مضبوط ہونے لگی۔ اسے رونا آ رہا تھا مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھی۔

"قارس!" لرزتی آواز میں پکارا۔ کچھ تو کہے۔

اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ جیسے کچھ بولنے سننے کی ہر صلاحیت ختم ہو چکی ہو۔

☆☆☆

ان کے حواس بیدار ہو رہے تھے۔ سفید دھند میں۔ روشنی کا مبہم سا تصور تھا۔ آوازیں تھیں۔ اور مدھم مدھم سا شور تھا۔ شیرازی مینشن کا باغ۔ گھوڑے۔ طویل رابدار یوں میں بھاگتے دوڑتے حماد کا تصور۔ اس کی ہنسی۔ مسکراہٹ۔ اور پھر بھاگ کر ان سے لپٹنے کا وہ منظر بند آنکھوں پر ٹھہر گیا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے سن رہی تھی۔ وہ ایک مکمل فیملی۔ ایک مکمل زندگی کو ماضی کے پردوں پر ایک بار پھر ابھرتا ہوا دیکھ رہی

تھیں۔ وہ حماد۔ وہ ایک دم سے چھوٹا سا بچہ ہو گیا۔ وہ بے بی کاٹ میں تھا۔ وہ اسے اٹھا رہی تھیں۔ وہ دروازے میں ہارون شیرازی کو کھڑا ہوا دیکھ سکتی تھیں۔ سورج کی زرد کارروشنیوں میں وہ منظر۔ وہ زندگی۔ وہ سکون بھرے لمحات انہیں وہیں کہیں معلق کر گئے۔ وہ بس وہیں کہیں ٹھہر جانا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹے۔ اپنے شوہر کے ساتھ۔ اپنے ہی گھر میں۔ اپنی ہی زندگی میں۔ وہ اس مکمل تصویر کا ہی ایک حصہ ہو جانا چاہتی تھیں۔

"مئی!"

گرد و نواح میں وہ آواز بہت آہستگی سے گونجی تھی۔ ان کے ہاتھ میں پینٹنگ پرش تھا۔ وہ سفید کیونوس پر مہارت سے سمندر کی لٹاٹھیں مارتی لہروں کا منظر بنا رہی تھیں۔

منظر بدل گیا تھا۔ اب وہ کچن میں تھیں۔ وہ حماد کے لیے منڈو وچ بنا رہی تھیں۔

"مئی پلیز!!"

وہ کشادہ سے کمرے میں۔ کارپٹ پر بکھرے کھلونوں کو باسکٹ میں ڈال رہی تھیں۔ حماد ان کے آس پاس ہنستے ہوئے بھاگتا پھر رہا تھا۔ وہ ان کی گردن میں بازو ڈال لے بھول گیا تھا۔

ہارون کافی کامک تھا۔ کمرے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کی نرم مسکراہٹ زندگی کا احساس دلا رہی تھی۔

"وہ ایک غلطی تھی" ہارون کہہ رہا تھا۔

"کیا!؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آرزو سے شادی۔ وہ ایک غلطی تھی۔"

ان کے لبوں کی مسکراہٹ۔ ایک دم سے معدوم ہو گئی۔ خوشیوں کے رنگ۔ کہیں کہیں سے ٹھکے اور ماند پڑنے لگے۔ روشنیاں مدھم ہونے لگیں۔ ننھے حماد کی قلقاریاں ختم ہو گئیں۔

"کون آرزو؟؟۔ کیسی شادی؟؟" ان کے لب

ہلے۔

"آنکھیں کھولیں مئی!" انہیں اپنا ہاتھ مضبوط

گرفت میں محسوس ہوا۔ ان کے ہاتھ کی پشت پر آنسوؤں کے قطرے بکھرنے لگے۔
اور پھر منظر بدل گیا۔ وہی تصویر۔ وہی زندگی۔ وہی خواب۔ اور چاہت۔ وہ ایک دائرہ تھا۔ بار بار گھوم رہا تھا۔ وہ اس کے وسط میں کھڑی۔ زندگی کے حسین ترین لمحات کو جی رہی تھیں۔ وہ اس دائرے سے اب بھی لکنا نہیں چاہتی تھیں۔
"مئی!"

منظر بس ایک لمحے کے لیے بدلا۔ دیواروں میں دراڑی نظر آئی۔ وہ آواز جو بہت ہلکی تھی۔ وہ ایک دم سے بلند ہوئی۔
"آپ میرے ساتھ ایسے نہیں کر سکتیں۔ آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔"

وہ حماد کو سننے سے لگائے۔ وہیں ٹہل رہی تھیں۔ رک گئیں۔ گردن موڑ کر ادھ کھلے دروازے کو دیکھنے لگیں۔

"چلیں؟" آونگ کا پروگرام تھا۔ ہارون پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے سر ہلایا۔

وہاں کوئی تھا۔ انہوں نے حماد کو بے بی کاٹ میں سلا دیا۔ آہستگی سے قدم اٹھائی دروازے تک آئیں۔

پھر راہداری میں اور اب وہ دیوار کے ساتھ لگی بند الماری کے سامنے کھڑی تھیں۔

"جیل!؟" ہارون ان کے پیچھے آئے۔ مگر دکھائی نہ دیے۔ حماد کی آواز بھی کہیں گم ہو گئی۔

خوف اور ہراس سے بھری ہوئی ہیزل آنکھیں۔ تر چہرہ۔ بکھرے ہوئے بال۔ اور اپنے آپ میں سمٹا ہوا وہ بچہ۔

وہ کرنے کے سے اعزاز میں نیچے بیٹھ گئیں۔ شیرازی مینشن اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دم سے وہاں اکیلی رہ گئیں۔

"قارس!" آواز دیتے ہوئے انھیں۔

"قارس!" اس کی تلاش میں وہ یہاں وہاں بے تابی سے قدم اٹھانے لگی تھیں۔ انہوں نے ہر ایک منظر کو

آہنی کی سطح پر ابھرتے، ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ دھیمی دھیمی سکپاں تھیں جو سماعت سے ٹکرائی تھیں اور اگلے ہی لمحوں ان کی آنکھ کھل گئی تھیں۔ انہوں نے ایک دم سے سانس کھینچتے ہوئے داپنے ہاتھ کو جنبش دی تھی۔ مانیٹر کی بیپ۔ ڈاکٹر زرنسز کی آواز۔ ان کا وجود بھاری ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ لب بکپا رہے تھے۔ وہ آواز دینے سے قاصر تھیں۔

جو منظر روشنیوں کی زد میں تھا۔ وہ آہستگی سے تاریک ہونے لگا۔ ان کے آس پاس اندھیرے چھانے لگے۔ شور ختم ہونے لگا۔ وہ سکون کی وادیوں میں اتر رہی تھیں

داہتا ہاتھ ابھی بھی کسی کی گرفت میں تھا۔

"مئی!" وہ ان کا ہاتھ پکڑے جھکا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحوں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئیں۔ پھر انہیں جانے دینی دیر بعد ہوش آیا۔

وہ ان کا ہاتھ پکڑے جھکا ہوا تھا۔ کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ انہوں نے آنکھ کھلی تو انہوں نے لیوں کو جنبش دی۔ الکلیاں متحرک ہوئیں۔ نیم تاریکی میں قارس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گردن موڑے وہ اسے دیکھنے لگیں۔ ان کے برابر میں ہی کرسی پر بیٹھے وہ وہیں سو گیا تھا۔ ان کا داہتا ہاتھ پیٹ پر دھرا تھا۔ آہستگی سے حرکت دیتیں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ خند سے کچھ چونک کر بیدار ہوتے اس نے سر اٹھایا۔ اور پھر اتنی ہی سرعت سے کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"مئی!"

اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، شیو بومی ہوئی تھی۔ شرٹ کے کالر درست نہیں تھے۔ رت جگے کی گواہی دیتی آنکھوں میں بہت سادہ دھمرا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہیں۔ کچھ کہنے کی سکت نہ تھی۔ بس اس پر گرفت بڑھائے رہیں۔

کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر آ گیا تھا۔ وہ ان کے سوالات کا جواب سر کی جنبش سے دے رہی تھیں۔

انہوں نے اپنے ہاتھیں اور پھر دیا ہے ہاتھ کی انگلیوں کو بھی حرکت دینے کی کوشش کی تھی۔ ان کا بیڈ سینک پوزیشن میں ایڈجسٹ ہو چکا تھا۔ نرس ڈرپ بدل رہی تھی۔ فارس قدرے فاصلے پر ہی کھڑا رہا تھا۔ پھر وقفے وقفے سے جتنی بار وہ نیند سے بیدار ہوئیں۔ انہوں نے اسے ہی دیکھا۔ وہ وہاں تھا۔ ان کے بے حد قریب۔ ان کی کھلتی بند ہوتی آنکھوں کو بہت ٹرپ اور انتظار سے دیکھتا ہوا۔ بہت سے کچھتاؤں اور اذیتوں میں گھرا ہوا۔

☆☆☆

موبائل فون کان سے لگائے مدینہ اپنی جگہ سے صدمے سے گنگ ہوئی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ریان کا چچا اسے لے گیا ہے۔"

وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر لیے۔ ایک دم سے محسوس ہوئی تھی۔ "آپ نے کیوں لے جانے دیا ہے اسے۔ میں کہہ کر گئی تھی۔ ریان کو میں نے جاؤں گی۔"

"بس کرو مدینہ!" طارق صاحب جو اس ممکنہ صورتحال سے پہلے سے گھبرائے ہوئے تھے جھنجھلا کر بولے۔ "بچے کا چچا ہے۔ ہم کیسے منع کر سکتے تھے۔"

"لیکن میں نے آپ سے کہا تھا۔"

طارق صاحب نے ضبط کر کے اپنی پیشانی مسلی "تو کیا ہم اسے منع کر دیتے؟ کس حق سے منع کرتے کہ اس کی ماں کی اجازت نہیں ہے؟ تم تو اسے اپنے ساتھ رکھنا ہی نہیں چاہتی تھیں؟" اس نے غصے سے کال ہی کاٹ دی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا، فارس شیرازی اس کے بیٹے کو لے گیا تھا۔ یہ صدمہ تھا۔ اور یہی صدمہ اس کے حواس پر بھاری ہو رہا تھا۔

گہری سانس لیتی وہ ابھی بھی بے یقینی کی سی کیفیت میں تھی۔ جنت کا وہاں آنا۔ اور پھر فارس کا اس بچے کو اس گھر سے۔ خود لے جانا۔ اس کا سر نہی

میں ہلا تھا۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔ آنکھوں میں غصہ اتر آیا۔ لب سختی سے بھج گئے تھے۔

وقت جیسے لمٹ رہا تھا۔ فارس وجدان کے ساتھ گزاری گئی زندگی، حماد سے نکاح سب آنکھوں میں آ رہا تھا۔ جس رات حماد سے طلاق دے کر گھاٹا اسی رات اس نے ابارشن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر اگلے دن شہ سرخیوں میں نظر آئی اس کی حادثاتی موت کی خبر اس کا ارادہ بدل گئی تھی۔ اپنے خسارے میں اسے بہت بڑا فائدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ حماد کی ہی اولاد کا استعمال کر کے اس خاندان سے جڑ سکتی تھی۔ وہ اس بچے کے ذریعے پوری جائیداد پر قابض بھی ہو سکتی تھی۔

آنکھوں میں اس نے پلاننگ کر کے تمام حساب کر لیے۔ وہ اس خاندان کی جاہ و حشمت اور امارت سے واقف تھی۔ بیٹے اور پوتے کا غم لیے اعظم شیرازی اپنی نسل کی بقا کے لیے اسے رو نہیں کریں گے۔

وہ جو طلاق کے غم اور صدمے میں تھی، ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی۔ کندھوں سے ہر یو جھ سرک گیا۔ اسے فلیٹ میں خوشی سے گھومتی رہی۔ جھومتی رہی۔ سوچتی رہی۔ سب اس کا ہو گا۔ اس کی اولاد کا ہو گا۔ انتظار ایک ہفتے تک تھا۔ اس نے کر لیا۔ اتوار کی شب اس کا اسلام آباد جانے کا ارادہ تھا۔ وہ جیلہ داؤد اور اعظم شیرازی سے ملتے جلتے تھے۔ نکاح، طلاق کے کاغذات اور پریکٹس رپورٹ۔ اس نے سب کاغذات اٹھا لیے۔ کیا کہنا ہے سوچ لیا۔ کس طرح سے بات کرنی ہے طے کرنا۔

مگر اس رات اجانک بریک ہونے والی خبر نے اس کے حواسوں پر بجلی گرا دی تھی۔

حماد شیرازی اکلوتا نہیں تھا۔ ہارون شیرازی کا دوسرا بیٹا منظر عام پر آ چکا تھا۔ وہ صدمے سے گنگ اور ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ فارس وجدان کی تصویر تھی جو دکھائی جا رہی

تھی۔ وہ فارس وجدان کا ہی ذکر تھا جو ہر جگہ ہو رہا تھا۔ اپنے باپ اور بھائی کا قاتل۔ شیرازی خاندان کی اولاد۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ چکر اکر رہ گئی تھی۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا، ایسا کچھ ہو جائے گا۔ جسے سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ چکی ہے۔ اس کا تعلق اسی خاندان سے نکل آئے گا۔

اس نے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا۔ توجہ خبروں پر لگا کر بیٹھ گئی۔ فارس وجدان پر قتل کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ اسے اپنے باپ اور بھائی کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ دانتوں سے ناخن کاٹنے، بالوں میں ہاتھ پھیرتے، بے قراری سے اپنے کمرے میں گھلتے وہ پوری کہانی کو جیسے اب سمجھ پارہی تھی۔

حماد نے اسے ایسے ہی نہیں اپروچ کیا تھا۔ وہ فارس کی حقیقت سے واقف تھا۔ اس کے قلم میں سب کچھ تھا۔

وہ اس کی خوبصورتی نہیں تھی جو حماد کو اس کی طرف لائی تھی۔ وہ بھائی سے عصمت تھی جس نے اسے مہرہ بنا دیا تھا۔ وہ انتقام کے اس کھیل میں بس صرف استعمال ہی ہوئی تھی اور یہ انداک اسے انگڑوں پر لارہا تھا۔

غلطی اس کی تھی۔ منصوبہ اس کا تھا۔ حماد شیرازی نے اسے طلاق کے لیے فورس نہیں کیا تھا۔ ابارن کا فیصلہ اس کا بھی تھا۔ فارس وجدان کے مقابلے میں حماد شیرازی اپنے خاندانی اسٹیٹس کی وجہ سے اسے بہتر لگا تھا۔ وہ اسے اپنانے کے لیے ہر حد سے گزر رہا تھا۔ اتنے امیر نوجوان کی ایسی دیوانگی کے بعد۔ وہ اور کیا چاہ سکتی تھی؟

وہ ہر صورت فارس وجدان سے جان چھڑا کر حماد شیرازی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنا پیشہ و عشرت کی زندگی گزارنی تھی۔ وہ اولاد کی کسی زنجیر میں نہیں جکڑنا چاہتی تھی۔ وہ فارس وجدان کے ساتھ مزید کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے طلاق دینے کو تیار نہیں تھا۔ ابارن کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

رکاوٹ صرف اولاد ہی تھی۔ وہ اولاد جسے وہ اب نہیں چاہتی تھی۔

اس رات پڑنے والا وہ تھپڑ بس آخری حد ثابت ہوا تھا۔ وہ لمحوں میں فیصلہ کر لی تھی۔ ٹانگوں میں اسٹیپ اٹھاتی تھی۔ اس نے ابارن کو روک کر اپنے راستے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کر دیے تھے۔ اس نے ہر وہ رکاوٹ مٹا دی تھی جو اس کے اور حماد کے راستے میں آ سکتی تھی۔

رکاوٹ ختم۔ شادی بھی ہو گئی۔ محض چھ ماہ تک اس کے ساتھ رہنے کے بعد حماد شیرازی نے اسے طلاق دے دی تھی۔ اس کی پلاننگ میں اس کا وجود بس یہیں تک تھا۔ حسن کا جادو۔ بس جادو ہی تھا۔ ذرا دیر تک اثر دکھا کر۔ ختم ہو جانے والا۔ حماد شیرازی مر چکا تھا۔ مگر جو مار وہ اسے دے کر گیا تھا، وہ اس سے منجھل نہیں ماری تھی۔

"کیسا لگتا ہے۔ جب آپ کو آپ کے جیسا انسان مل جائے؟"

یادوں کو جھٹک کر اب وہ لیپ ٹاپ اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔ فارس وجدان پر اپنے باپ اور بھائی کے قتل کا الزام تھا۔ نچلا لب کاٹنے، ذہن میں ابھرتے بے تحاشا خیالات کی زد میں اب وہ جاہنے لگی تھی یہ الزام سچ ہو جائے۔ فارس وجدان کو سزا ہو۔ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ اور تمام جائیداد اس کی اولاد کے حصے میں آ جائے۔

مگر جیسا وہ چاہ رہی تھی، ویسا نہیں ہوا تھا۔ پہلے اس کی ذات پر لگنا جائز اولاد کا شبہ دور ہوا تھا کہ آرزو جہانگیر اور ہارون شیرازی کا نکاح نامہ پبلک کر دیا گیا تھا۔

اور اس کے چند ہی دنوں بعد اعظم شیرازی نے اپنی تمام جائیداد فارس وجدان کے نام کر دی تھی۔

اس نے شدید فحشے میں لیپ ٹاپ فرش پر دے مارا تھا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ جو سوچ رکھا تھا، وہ اب ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے

خیال آرہے تھے۔ قصہ آرہا تھا۔

اسے اپنے اندر غصے اور آگ کی وجہ پہلے سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب آ رہی تھی۔ قارس وجدان کو چھوڑنے پر اب وہ بے طرح سے پچھتا رہی تھی۔ جلد بازی میں فیصلہ نہ کرتی تو آج بھی اس کی بیوی ہوتی۔ حماد کے چکروں میں نہ پھنستی تو آج سب کچھ اس کا ہی ہوتا۔

وقت ملت نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کو اب بدل نہیں سکتی تھی۔ مگر اپنے مستقبل کے لیے اب وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

وہ پہلی فرصت میں اسلام آباد روانہ ہوئی تھی۔ ہاتھ میں نکاح کا پیپر تھا۔ طلاق کے کاغذات۔ ریسی رپورٹ۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ مگر اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بار بار مختلف فون نمبرز ٹرائے کرتی رہی۔ پیغام بھجوایا رہی۔ کسی طرح جیلہ داؤد یا کسی سے اس کا رابطہ ہو سکے۔ مگر اس کے مقابلے میں بھی قارس وجدان ہی تھا۔ اس کے تمام تر ارادوں کو خاک میں ملاتا۔ اس کے لیے شیرازی خاندان کا ہر دروازہ بند کرتا ہوا۔

اب ضروری ہو گیا تھا وہ اس کی شبہات دور کر دے۔ اپنی محبت کے جال میں جس طرح پہلے پھنسا چکی تھی۔ ویسے ہی دوبارہ پھنسالے۔ وہ اس کی بیوی رہ چکی ہے۔ ڈیڑھ سال کا ساتھ ہے۔ وہ ساری غلطیوں کا لمحہ حماد کے سر ڈال دے گی۔ معافی مانگ لے گی۔

اسے دولت، پیسہ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ صرف قارس کا ساتھ چاہیے۔

اس نے فون کالز کیں۔ مسیج بھیجے۔ اس کے آفس میں گئی۔ اس نے ہر جگہ پر اس کا راستہ روکا۔ ہر جگہ پر آنسو بہائے۔ وضاحت دینا چاہی۔ مگر اس کے ہاتھ سوائے نفرت اور دھکار کے کچھ نہ آیا۔

اسے اپنے خسارے کا احساس جیسے اب شدت سے ہو رہا تھا۔ کچھ بھی اس کے حساب سے نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ہر تدبیر الٹی جا رہی تھی۔ صرف جیلہ داؤد سے ملاقات ہی اس کی جگہ شیرازی ہاؤس میں بنا سکتی تھی۔ ایک بار وہ شیرازی ہاؤس میں داخل ہو جائے۔ قارس تک رسائی خود ہی حاصل ہو جائے گی۔ جیلہ داؤد اپنے بیٹے کی اولاد کو کسی طور بھی کھونا نہیں چاہیں گی۔ وہ اپنے بیٹے کی اولاد کے لیے۔ ان کا بیچ اب بھی کروا سکتی ہیں۔

وہ رابطے کی کوشش میں لگ گئی۔ قسمت اچھی تھی کہ کامیاب ہو گئی۔ فون پر انہیں سب بتا دیا۔ اپنی رپورٹس بھی ارسال کر دیں۔ اس کے حالات تک ہیں۔ اس کے خاندان کے لوگ قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس نے روتے ہوئے دھکم اور پچھتاووں کی زد میں اپنے لہجے کو حتی الامکان تسکین کر کے بات کی۔ انہوں نے کال کاٹ دی۔ کچھ نہ کہا۔ وہ ہلکے رسی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اسے گھر بلا لیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ پہلی فرصت میں ہی شیرازی ہاؤس پہنچ گئی تھی۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے جس پہلے انسان پر اس کی نظر پڑی وہ قارس ہی تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ پتھر ہوا تھا۔ اس کی اولاد کی جان لینے والی۔ اس کے گھر میں۔ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جس نے اس کی زندگی جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اب ہم سے غر حال اور کرب میں ڈوبی پچھتاووں کی زد میں نظر آ رہی تھی۔ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی۔ روتے ہوئے معافی مانگنے لگی۔

"قارس۔ پلیز۔ میری بات سنو۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا۔ حماد نے تمہارے خلاف بہت بھڑکایا۔ میں۔ میں جھٹک گئی۔ میں آج بھی تم سے۔ محبت۔"

شدید غصے کے عالم میں قارس نے انتہائی نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ وہ سامنے تھی تو اس کا گلا گھونٹ

دینا چاہتا تھا۔ وہ اس سے ایک ایک جرم کا حساب لے لیتا چاہتا تھا۔ مگر ضبط پکڑ کر پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے آغا علی کو اسے گھر سے نکالنے کا حکم دے دیا تھا۔ اور تب ہی جلیلہ داؤد آگئی تھیں۔ انہوں نے فارس کو روک دیا تھا۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں می!" آنکھوں میں وحشت لیے وہ بے یقین سا کھڑا رہ گیا تھا۔

"ماں بننے والی ہے!!" ان کی آنکھیں پروردگار سوچی ہوئی تھیں۔ چہرہ اتر اتر ہوا تھا۔ بیٹے کے غم سے نڈھال وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھیں۔ وہ حماد کی اولاد کو نہیں کھونا چاہتی تھیں۔ وہ عدینہ زہیر کو اس گھر میں رکھنے کے لیے تیار تھیں۔

"آپ اسے جانتی بھی ہیں می!" اس کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ "خوسے دیکھیں کون ہے یہ۔"

"فارس۔" وہ سسک پڑیں۔

"می! یہ عورت ایک بربادی ہے۔"

وہ ہتھیلیوں پر سر گر کر رانی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ ان کا دل پھٹ رہا تھا۔ انہیں اپنے بیٹے کی یاد آ رہی تھی۔

"فارس۔ حماد نے مجھے۔۔۔ اس نے بھڑکایا۔"

"ایک لفظ نہیں۔" اب کے بہت ضبط اور تحمل سے اپنے غصے کی آگ میں جھلتے ہوئے وہ اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے نظر آ رہے تھے۔

"کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟" قریب پہنچ کر سنسناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں کا قہر بھرا تاثر اس لمحے عدینہ زہیر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ڈرا گیا۔ فارس اب وہ نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔

"فارس۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں یہاں۔"

اس لیے نہیں آئی۔

"تمہاری قیمت بہت آسانی سے لگ جاتی ہے بتاؤ اب کتنے میں بکنا چاہتی ہو؟"

وہ کرخت لہجے میں پوچھا جانے والا سوال عدینہ زہیر کے منہ پر زمانے دار پھنکر کی طرح لگا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ذلت کی توقع تھی۔ مگر وہ اسے اپنی نظروں میں اتنا گرا دے گا۔ اس کی توقع نہیں تھی۔

"حد میں رہو۔" بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔

"حد میں تم رہو۔" درستی سے ہات کاٹ کر اس نے انکشت شہادت لہرائی۔

"دوبارہ اس گھر میں آئیں۔ تو میں بھول جاؤں گا تم ایک عورت ہو۔ پھر میں تم سے۔ تمہارے حساب سے نمٹوں گا۔"

اس کی کرخت آواز۔ سخت لہجہ۔ اور انداز۔

"ناؤ گیٹ آؤٹ!" اس نے صدر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت پچھتاؤ گے تم!" آنکھوں میں آنسو لیے سخت لہجے میں کہہ کر وہ تن کن کرتی گھر سے نکل گئی تھی۔

بے عزتی کا غصہ ایک طرف۔ اپنی پلاننگ ناکام ہونے کا دکھ زیادہ تھا۔ جو کچھ سوچ رکھا تھا۔ کسی طور ممکن نہ تھا۔ فارس وجدان اس کے ہر راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ اس بچے کے ہوتے ہوئے بھی کچھ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

تاہم اس نے بھی انتقام کا فیصلہ کر لیا۔ ضد باندھ لی۔ ایسے ہے۔ تو پھر ایسے ہی سہی۔ ابارشن کا ارادہ ایک بار پھر کرنے ترک کر دیا۔ بچے کو دنیا میں لا کر فارس کی زندگی جہنم بنائی جاسکتی تھی۔ وہ اس کا مقابلہ ایسے ہی کر سکتی تھی۔ اپنی تذلیل کا بدلہ ایسے ہی لے سکتی تھی۔

وہ اسلام آباد میں شفٹ ہو گئی۔ اس نے اپنے اور حماد کے تعلق کو پبلک کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایلٹ کلاس کے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی۔ دوستیاں بنانے لگی۔ خبریں پھیلانے لگی۔ وہ شیرازی انٹر پرائزز کے سی ای او فارس وجدان کی بیوی ہے۔ اس سے طلاق لے لی۔ وہ تشدد

"تمہارا صاحب کیا چاہتا ہے، میں لوگوں کو اس کی اصلیت نہ بتاؤں؟"

"صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ آج کے بعد آپ جیلہ میسرے رابطے کی کوشش نہیں کریں گی۔"

وہ لب بلیج کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اور حماد کا بیٹا۔"

"قارس صاحب اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔"

وہ آنکھوں میں سختی لیے چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ رقم بہت زیادہ تھی۔ انکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سودا منظور کر لیا۔ جیلہ داؤد سے رابطہ کرنے میں ویسے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب سب معاملات قارس وجدان کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے پیسے رکھ لیے۔ اپنے دو ماہ کے بچے کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر لندن چلی گئی۔ اور بھول گئی ایک بیٹا بھی ہے۔ وقفے وقفے سے اس کی ماں کی کال آ جاتی۔ وہ بچے کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔

"میں ریان کی دادی سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں!"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ریان کا چچا آپ کی بات نہیں ہونے دے گا۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بال بتا رہی تھی۔

"تمہارے بھائی بہت پریشان کر رہے ہیں عدینہ۔ تم ریان کو اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتیں۔"

"میں یہاں مصروف ہوں۔ جاب کر رہی ہوں۔ پچھنیں سنبھال سکتی۔"

وہ بار بار کال کرتیں اور ان کا مطالبہ ایک ہی ہوتا۔

"میں ریان کو اس کے دوھیال بھیجتا چاہتی ہوں!" انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"بھیجتا چاہتی ہیں تو بھیج دیں۔ لیکن یاد رکھیں۔ وہ اسے مار دے گا۔"

اس نے اس قدر سخت جملہ کہا وہ اپنی جگہ دہل گئیں۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

کرنا تھا بھی اسے چھوڑنا پڑا۔ حماد شیرازی نے اس کی جان بچائی۔ حماد شیرازی نے ہی اسے سہارا دیا۔ وہ اس کا اتھک جتنا خراب کر سکتی تھی اس نے کیا۔ جتنی افواہیں پھیلا سکتی تھی اس نے پھیلائیں۔ جتنی باتیں وہ اس کے کردار پر کر سکتی تھی۔ کرنی رہی۔ اس نے اپنی شادی کی تصاویر کسی ویب سائٹ پر ڈال دیں۔ خیال تھا اب کے قارس اسے ضرور ابرو چ کرے گا مگر وہ اس کی کسی بھی بات پر کوئی رد عمل نہیں دے رہا تھا۔

ڈیوری کے بعد وہ بچے لے کر اس کے آفس گئی۔ وہاں ملاقات نہ ہوئی تو وہ گھر پہنچی۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ جیلہ داؤد کو فالج افک ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں تھیں۔ اس نے ایک ماہ کے انتظار کے بعد ریان کی تصاویر جیلہ داؤد تک بھجوا دیں۔ وہ برے حالات میں ہے۔ وہ بچے کے ساتھ شیرازی ہاؤس میں آنا چاہتی تھی۔ ایک اور وار۔ ایک اور کوشش۔ کمزور بدف جیلہ داؤد ہی تھیں۔ وہ ان کے احساسات کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف بھی قارس وجدان ہی تھا۔ مضبوط چٹان کی طرح ایسا وہ۔ جیلہ داؤد کو اس کی پہنچ سے دور رکھے ہوئے۔

گمان تھا اپنے پوتے کی تصاویر دیکھنے کے بعد وہ ضرور اس سے رابطہ کریں گی۔ مگر ان کی طرف سے خاموشی تھی۔ غالباً وہ قارس وجدان کے آگے بے بس ہو گئی تھیں۔

اس رات وہ گھر پہنچی تو اس نے حیدر کو اپنے قلیٹ کے دروازے پر کھڑے ہوئے پایا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بیگ تھا۔ پیسوں سے بھرا ہوا۔ اتنی خطیر رقم دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گئی تھی۔

"یہ کافی ہے یا کچھ اور بھی چاہیے۔" وہ کمر درے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں سرد مہری کا تاثر لیے حیدر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے قارس وجدان کی دلگی چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہلی گئی تھی۔

"یہ کون ہے۔"

"یہی تو ریان کی امی ہے۔" روبی نے بتایا اور جنت کے حواسوں پر جیسے بجلی آگری۔ عدینہ زہیر کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ قدم اٹھاتی اس کے سر پہ پہنچ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

جنت کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اسے کوئی بھی جواب دیئے بنا سرعت سے قدم اٹھاتی گھر سے نکل گئی تھی۔

"یہ یہاں کیا کر رہی تھی۔ کیوں آئی تھی وہ یہاں؟" کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو مشتعل ہو کر روبی پر برس پڑی۔

"وہ جی۔ ریان سے ملنے آئی تھیں۔"

عدینہ اپنی جگہ گم گئی۔ اسے اپنے اندر خطرے کی گھنٹی محسوس ہوئی۔ کیا وہ اس بچے کو اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہیں؟ اس کا سر بے اختیار فنی میں ہلا۔ قارس اس کی اولاد کو کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اور اگر کر لیا تو؟ ساری رات وہ بے چین رہی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے گھر والوں کو اپنا فیصلہ بتا دیا۔ اسے ضروری کام سے کراچی جانا تھا۔ ریان کوئی الحال وہ ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی مگر واپسی پر وہ اسے اپنے ساتھ رکھے گی۔

اس کے بھائیوں کو اس کے فیصلے پر اعتراض ہوا۔ بچے کو وہ اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ذرا سی بحث کے بعد بات ختم ہو گئی تھی۔ اس کی اولاد تھا وہ۔ اسے اپنے ساتھ رکھنے کا حق صرف اس کے پاس تھا۔ وہ کراچی چلی گئی۔

ایسا کیسے ممکن تھا؟ وہ شخص جو اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس کی اولاد کو کیسے رکھ سکتا تھا؟ ہو کیا رہا تھا؟ یہ کیسی چال تھی جو وہ چل رہا تھا۔ اس کے لیے صبر مشکل ہو رہا تھا۔ وہ پہلی فرصت میں اسلام آباد جانا چاہتی تھی۔ وہ ریان کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ وہ ریان کو اپنے ساتھ لندن لے جائے گی۔ اس نے

"اس نے اپنے بھائی کی جان لے لی۔ بچے کو

کیوں بچھے گا؟"

کئی دنوں تک اس کی ماں عجیب شش و پنج میں مبتلا رہیں۔ گھر کے حالات کچھ تنگ تھے۔ بچہ بیمار تھا۔ مجبوراً خرچے کے لیے رابطے کی کوشش کی۔ اپنا پیغام ایک ملازم کے ذریعے اس تک پہنچا دیا۔ جمعہ کی شب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ کوئی شخص انہیں پیسے دینے آیا تھا۔ ماہانہ خرچا ریان شیرازی کے لیے اس کے چچا کی طرف سے تھا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ فوری شکریہ ادا کیا۔

بیسویں کا آٹما ہی تھا کہ وہ گھر جو اپنی ماں پر اس لیے تنگ پڑ رہا تھا کہ وہ عدینہ کے بچے کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ ایک دم سے کشادہ ہو گیا۔ بہوؤں کا رویہ اچھا ہو گیا۔ بیٹے منسوب ہو گئے۔ اب اس ننھے سے وجود کے لیے کسی کا دل تنگ نہ تھا۔ انہوں نے فون پر عدینہ سے دوبارہ کوئی شکایت نہ کی۔

ماں کے انتقال پر وہ پاکستان آئی اور ریان سے ملے بغیر ہی ہلی گئی۔ اس کے بھائیوں نے بھی بچے کے حوالے سے کوئی دباؤ نہ ڈالا کہ خرچا باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ جسے گھر والے اب اپنی شہ خرچوں پر اڑانے لگے تھے۔ گاڑی خرید لی۔ فرنیچر بدل لیا۔ مٹکڑ لگوا لیں۔ کاروبار شروع کر دیا گیا۔ بھائیوں کے حالات بدل گئے مگر اس نے پلٹ کر ریان کی کوئی خبر نہ لی۔ اسے اب اپنے بچے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں مصروف ہو چکی تھی۔

اور اب پورے ایک سال بعد وہ اپنی بیٹی کی شادی پر بھائیوں کے گھر آئی تھی۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس گھر میں اس کی ملاقات جنت کمال سے ہو جائے گی۔

جنت کمال۔ قارس وجدان کی دوسری بیوی۔ وہ وہاں ریان سے ملنے آئی تھی۔ بیرونی دروازے سے اندر بھاڑے پر رکھی چارپائی پر بیٹھے اس کی نظر جیسے ہی عدینہ پر پڑی تھی۔ وہ صدمے میں

اچانک ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

جنت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

کشادہ ساوی آئی بی روم دنگ۔ جس کی دیوار گیر کھڑکیوں پر پردے کرے ہوئے تھے۔ تمام سہولیات سے مزین کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف وہی حصہ روشن تھا جہاں مسز شیرازی کا آئی سی پو بیڈ رکھا تھا۔ اس کی نگاہیں قارس کی تلاش میں مشرقی دیوار کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ آہستگی سے دروازہ بند کرتی وہ اس کے پاس ہی چلی آئی۔ سچ باکس اور پرس اس نے میز پر رکھ دیا۔ شال اتار کر اس پر پھیلا دی۔ گردن ایک طرف کوجھکی ہوئی تھی۔ اس نے بے حد احتیاط سے سیدھا کرنا چاہی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ جس طرح سے جھکی ہوئی تھی گھبراہٹ کے عالم میں فوراً سے سیدھی ہو گئی۔

وہ آنکھیں مسلا سیدھا ہو بیٹھا۔

بال پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں سو جن کا شکار لگ رہی تھیں۔ کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ رات کے لونج رہے تھے۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟ سات بجے وہ اسے ریان کے ساتھ گھر پہنچا چکا تھا۔

"کچھ کھا لو۔" وہ بیک کھول رہی تھی۔ کور پیپر بنا کر برگر اس کے داہنے ہاتھ میں تھما دیا۔ فریج فرائز باکس بھی کھول کر پیش کر دیا۔

کچھ دیر تک وہ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آہستگی سے بائٹ لیا تو اس نے بیک سے کین کی بوتل نکالی۔ ڈھکن کھول کر میز پر رکھ دیا۔

وہ اس کی آنکھوں میں تھکان اور فکر دیکھ سکتا تھا۔ شرمندگی، پچھتاوا۔ دکھ۔ اس کے چہرے پر ہر تحریر نظر آ رہی تھی۔ وہ سامنے بیٹھی تھی تو اضطراب ابھی بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے نظریں ہٹالیں۔ وہ مسز شیرازی کے پاس کچھ دیر تک بیٹھی رہی تھی۔ پھر وہ اس کے پاس آ گئی تھی۔

"نیچے کینٹین سے کافی لے آؤں؟" وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔ اسے سر درد کی گولی تو نہیں چاہیے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ وہ لنگی میں سر ہلاتا کھڑکیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ گویا خرید کسی سوال کی حاجت نہ تھی۔

وہ کچھ دیر تک الگیاں مسلتی بیٹھی رہی۔ معافی، معذرت، دکھ اور پچھتاویں۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر کر نہیں پا رہی تھی۔

"ریان کی چوٹ کبھی ہے؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ قارس پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے سوال پر لمبے بھر کے لیے تعجب میں آئی تھی۔

"ہی از قائن!" اس نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر نے کہا اس کا ہاتھ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

گھر جانے سے پہلے اس کا چیک اپ ہوا تھا۔ ہاتھ پر بینڈج لگی تھی۔ کافی خوف زدہ تھا۔ اور بہت پریشان بھی کیا تھا۔ ابھی بھی وہ اسے گھر میں بہت مشکل سے سلا کر آئی تھی۔ مدحت نہ ہوئی تو وہ دوبارہ ہاسپٹل بھی نہ آ پائی۔

اپنے سوال کا جواب لے کر وہ دوبارہ رخ موڑ گیا۔

وہ اس کی پشت کو دبھتی رہی۔ ایک بار پھر دل چاہا۔ اٹھ کر جائے۔ اس کا ہاتھ پکڑے۔ اور بات کرے۔ معافی ہی تو ہے۔ مانگ لے۔ یہ جو دوری سی آگئی ہے۔ مٹ جائے گی۔ اور یہ جو اجنبیت سی ہے۔ ختم ہو جائے گی۔

وہ جیبوں سے ہاتھ نکالتا واپس آ گیا۔ اس نے بہت جستجوع کرتے کچھ کہنے کو سر اٹھایا۔ مگر وہ کاؤچ سے اپنی جیکٹ اور موہائل اٹھاتا اسی لمحے روم سے چلا گیا۔

وہ آنکھوں میں نمی لیے اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

قارس وجدان ریان شیرازی کو گھر میں لے آیا تھا۔ مگر جو درازان کے سچ آچکی تھی، اسے بھرنا اب

ماہنامہ شعل نومبر 2022 176

جلد 111

اسے مشکل سا لگ رہا تھا۔ شاید یہ خوف ہی تھا جو اسے پرے دھکیل رہا تھا۔ یا وہ دکھ جو وہ اسے دے چکی تھی۔ مسز شیرازی کی اس حالت کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ مچلا ب کا نچے آنکھیں مسل ڈالیں۔ جانے کچھ ٹھیک ہوگا بھی یا نہیں۔ اس کی تو اب بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ان کے حواس بیدار ہوئے تو انہوں نے جنت کو دیکھا۔ نیلگوں روشنی میں وہ اس کی آنکھوں میں آنسو اور لیوں پر نرم مسکراہٹ دیکھ سکتی تھیں۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" مدہم آواز میں ان کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے آنکھیں سے سر کو جھپٹ دی تھی۔ آنکھیں کچھ بو جھل۔ اور وجود بھاری تھا۔ نگاہیں فارس کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکی تھیں۔ جنت نے پردے پیچ کر ہٹا دیے۔ ان کا بیڈ سنگ پوزیشن میں ایڈجسٹ کیا۔

"فارس کہاں ہے؟" نحیف آواز میں بمشکل لفظ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ ساری طاقت جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ صدمہ کم تھا۔ نہ جھٹکا کم تھا۔ کمزور دل پر وہ پتھویشن بچہ بھاری پڑی تھی۔ "باہر گیا ہے!" جھک کر بے حد آہستگی سے کہا۔ جب سے انہیں روم میں شفٹ کیا گیا تھا، وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

سلائیڈ ٹیبل پر نرس ان کا لچر رکھ رہی تھی۔ پاس ہی بیڈ کر وہ اپنے ہاتھوں سے انہیں سوپ پلانے لگی۔ ساتھ میں بوتلی بھی جا رہی تھی۔ "زندگی کتنی خالی سی ہے۔ گھر کتنا دیران ہو گیا ہے۔ اس کا تو اب کہیں دل بھی نہیں لگتا۔"

"آپ گھر میں نہیں ہیں تو ہم بھی بے گھر ہو گئے ہیں!" آنکھیں نم تھیں۔ مسکراتا چاہا۔ مسکرا نہ سکیں۔ بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ فارس کا وجود

آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا۔ اس کا قصہ۔ اشتعال۔ انہوں نے خشک لبوں کو تر کرتے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ پتھویشن تصور میں بھی دل پر بھاری پڑنے لگی تھی۔ "آپ کو کسی سے ملوانا چاہتی ہوں!" لچ کے بعد اس نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھول کر مدحت احمد آئی تھی۔ اس نے چھوٹے سے بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نا بچی کا تاثر ابھرا تھا۔ دوسرے ہل خیرت۔ اور پھر بے یقینی کا۔

"یہ ریان ہے۔ ریان شیرازی!!" جنت نے بھی بتائی وہ پہچان گئی تھیں۔ وہ ان کے حواد کا بیٹا تھا۔ ان کا دل ایک دم سے ڈوبنے لگا۔ بے اختیار انکسے کی کوشش کی۔ اٹھ نہیں سکتی تھیں۔

جنت نے ریان ان کے حوالے کر دیا۔ اس نے سفید شارٹس پر آسانی رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بال سلپتے سے جھے ہوئے تھے، دو دو ہمارنگت۔ بڑی بڑی آنکھیں تو ان کے جیسی تھیں۔ اس میں انہیں حواد کی ہیبرہ نظر آئی۔ اس کا ماتھا چمکا۔ اس خوشبو کا اندازہ اتارا۔ رونے لگیں۔

"آئی!!" جنت فکر مندی سے پکارا۔ ریان ان کے سینے پر سر رکھے۔ بہت خاموش۔ پرسکون سا تھا۔

"کون لایا ہے؟" وہ کپکپاتی آواز پوچھ رہی تھیں۔

"فارس لایا ہے۔" ساعت پر لے کر بھر کے لیے یقین نہیں آیا۔ دکھا اور اذیت انگ انگ میں اتر گئی۔

"آپ کے لیے لایا ہے۔" ریان ایک دم سے رونے لگا تو مدحت اسے اٹھائے باہر چلی گئی۔

کمرے میں حمل خاموشی تھی اب۔ تاریکی بھی تھی۔ وہ تاریکی جو بہت اندر تک اتر رہی تھی۔ خوشی کا احساس ایک طرف۔ دل پر ایک بھاری بوجھ سا پڑ رہا

تھا۔ کچھ ہی دیر میں نرس آگئی تھی۔ جنت ان کے پاس تب تک بیٹھی رہی جب تک کہ دعا پڑی اور واپس کے زیر اثر سو نہیں گئی تھیں۔

دو بار وہ آنکھ کھلی تو کمرے میں صرف قارس تھا۔ وہ ان کے پاس ہی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔ انہیں دیکھتا ہوا۔ جانے کب سے وہ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ مسکرایا۔

طبیعت میں پہلے سے کچھ بہتری تھی کہ اب وہ اگلیوں کو حرکت دے پا رہی تھیں۔ قارس کو اسے ہاتھ پر ان کی گرفت بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اٹھ کر پاس بیٹھ گیا۔

وہ اپنے بیٹے کو دیکھتی رہیں۔ جانے کن طوفانوں سے لڑ کر آیا تھا وہ۔ لیوں پر کپکپاہٹ سی ٹھہر گئی۔ بہت کچھ کہتا چاہتی تھیں۔ پر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔

”می!“ نفی میں سر ہلایا۔ جیسے وہ ان کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھنا چاہتا ہو۔

”بہت بڑی قربانی مانگ لی میں نے تم سے۔“
”ان کی آواز بھیگ ہوئی تھی۔“ بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے میں نے تمہیں۔“

نفی میں سر ہلاتے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

”سب کچھ لے لیں۔ سارے امتحان۔ ساری قربانیاں۔ لیکن چھوڑ کر مت جائیں مجھے!“ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپاتی۔

”آٹم سوری بیٹا!! آٹم رینگی سوری“ ان کی آواز لرز رہی تھی۔

اس نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

”کیا آپ میرے لیے اتنا نہیں کر سکتیں؟؟ اپنی بیماری سے نہیں لڑ سکتیں؟؟“

انہوں نے اس کے گال پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”آٹم سوری۔ پتا نہیں کیا ہوا مجھے۔“ اسے

اس حال میں دیکھ کر یوں یوں جیسے بے حد شرمندہ

ہوں۔ ان کی طبیعت خراب کیوں ہوئی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو پریشان کیوں کر دیا۔

وہ اب اسے دیکھ رہی تھیں۔ بہت غور سے۔ بہت دکھ اور کرب سے۔ بظاہر وہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مسکراہٹ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ پھر بھی ان کا دل واہموں میں گمراہ ہوا تھا۔ انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔

”قارس!“

”می می!“

وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ بہت غور سے۔ سنجیدگی سے۔ فکر مندی سے۔ وہ جو اس کے اندر کی حکایتوں کو اکثر بھانپ لیا کرتی تھیں۔ آج کا کام ہو رہی تھیں۔

”کیا تم ٹھیک ہو؟“ ان کے لب ہلے۔ اس نے کچھ حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھا۔ پھر اثبات میں سر کو جنبش دی۔

انہیں یہ جواب نہیں چاہیے تھا۔
”کیا بات ہے می!! آپ پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟؟“

انہوں نے کئی آنسو اپنے اندر اتار لیے۔

”میں اپنے بیٹے سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا وہ ٹھیک ہے۔“

زردی بائل مدھم سی روشنی میں ان کی آنکھوں میں آنسو نما یاں ہو رہے تھے۔ بہت ضبط سے پوچھ رہی تھیں۔ بہت کرب سے گزر رہی تھیں۔ ریان شیرازی اس کے گھر میں تھا۔ اس کی نظروں میں تھا۔ وہ اس کے دکھ، اس کے کرب سے واقف تھیں۔

”اگر۔ اگر بہت مشکل ہو رہا ہو تو تم مجھے بتا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتی میرا بیٹا کسی تکلیف سے گزرے۔“ بھاری دل سے۔ بے بس ہو کر۔ کہہ دیا۔ ان کے کپکپاتی اگلیوں کی گرفت بہت مضبوط ہونے لگی۔ وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں می!“ مسکرا کر بولا۔ اس کی مسکراہٹ انہیں آنکھوں میں بھی نظر آئی۔ حزن میں

ڈوبی ہوئی۔

کیسے؟ وہ ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے؟ جس نے کا وہ نام تک نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس نے کدوہ گھر میں کیسے لاسکتا ہے۔ اس طرح۔ اچانک کیا ہوا تھا۔ کیا وہ ان کی وجہ سے۔ اس فیصلے پر مجبور ہوا ہے؟؟ کیا وہ ایک بار پھر کسی آزمائش سے گزر رہا ہے؟ اپنے آپ کو مار رہا ہے؟؟

"تم ریان کو لے آئے۔" ان کے لب بٹے۔ وہ جیسے اب سمجھا تھا انہیں کس بات کا خوف تھا، کس بات کی فکر لاحق تھی۔ وہ اپنے آپ میں جیسے اب تھا تھا۔

منظر ذہن میں ابھر آیا۔ اس رات کی تاریکی آنکھوں میں اتر آئی۔ جان گیا وہ کیا سوچ رہی تھیں۔ کیا پوچھ رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک چپ رہا۔ احساسات بتانے کو نہ مناسب لفظ تھے۔ نہ کوئی بات ذہن میں آ رہی تھی۔ "میں نہیں چاہتا شیرازی خاندان میں کوئی اور قارس ہو!"

جیلہ داؤد کی آنکھوں میں آنسو قلم گئے۔ اپنی جگہ ٹھہری گئیں۔ توقع نہیں تھی ایسا جواب ملے گا۔ جو وضاحت ہوئی۔ وہ اتنی مختصر ہو کر بھی دل پر نکل ہو جائے گی۔ اس کا ماضی۔ اب ان کے سامنے آ رہا تھا۔

"آپ چاہتی تھیں، میں اسے خود لے آؤں۔ میں اسے لے آیا ہوں۔"

پلوں کی باز بھلاکتے آنسو ان کے گالوں پر پھیل گئے۔ لبوں میں جنبش ہوئی پر کچھ کہہ نہ سکیں۔

"وہ آپ کا ہے۔ آپ کے پاس ہی رہے گا مجھے معاف کر دیں کہ میں آپ دونوں کے درمیان آ گیا۔"

ان کا دل ایک دم سے بھاری ہوا۔

"نہیں۔ تم درمیان میں نہیں آئے۔" نفی میں دوبارہ سر ہلایا۔ "میں نے تمہیں چنا تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں تم دونوں

کو ساتھ دیکھنا چاہتی تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑیں۔ "میں مرنے سے پہلے۔ تمہیں اور ریان کو ساتھ دیکھنا چاہتی تھی۔"

"مئی پلیز۔ ایسے تو مت کہیں" تڑپ کر انہیں روکا۔ "آپ مجھ سے موت کی کوئی بات نہیں کریں گی۔" واضح کر دیا۔ مگر وہ بہت حساس ہو رہی تھیں۔ "مئی! آپ پھر سے رو رہی ہیں" وہ فکر مند ہوا۔ "ڈاکٹر نے آپ کو اسٹریس لینے سے منع کیا ہے۔"

انہوں نے آنسو صاف کرتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ گہری سانس لی۔ قارس کی آنکھوں میں دیکھا۔

الحمد للہ! کتنی بڑی خوشی مل گئی تھی انہیں۔ جو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ ہو گیا تھا۔

"آپ بس ٹھیک ہو جائیں!" ان کی آنکھوں میں دیکھتے تاکید کی۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے تم ابھی گھر لے چلو!"

اور وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ "یہ کام تو ڈاکٹر کی اجازت سے ہی ہو سکتا ہے!" وہ غم آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن جنت آئی تو ریان بھی ساتھ ہی تھا۔ وہ پہلے سے قدرے بہتر تھیں۔ ریان کو گود میں لیے اس کا منہ چومتی رہیں۔ باتیں کرتی رہیں۔ اس کے ہاتھ پر جینڈیج لگی تھی۔ ٹھوڑی پر بھی نشان نظر آ رہا تھا۔ پیشانی پر بھی۔ اس عمر کے بچوں کو۔ ایسی چوٹیں تو نہیں لگتیں۔ اس کا ننھا سا ہاتھ پکڑ کر رونے لگیں۔ دادی تھیں۔ دل جان گیا تھا اس کا ننھال میں خیال نہیں رکھا جاتا۔ جنت نے انہیں سلی دی تھی کہ اب تو وہ گھر آ گیا ہے۔

ان سے بات کرتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ قارس کا موبائل والٹ وہیں رکھا تھا۔ مگر وہ خود وہاں نہیں تھا۔ وہ جب

بھی ہاسپل آتی تھی وہ کہیں نہ کہیں چلا جاتا تھا۔
 مسز شیرازی سے ہاتھیں کٹی ان کے پاس ہی
 بیٹھی رہی۔ جانے لگی تو وہ اسے راہداری میں بیٹھا ہوا
 نظر آیا۔ کھڑکی کے پاس ہی۔ سینے پر بازو
 باندھے۔ بالکل خاموش۔
 وہ آنکھوں میں حزن کی نمی لیے کھڑی رہی۔
 پھر آنسو صیاف کرتی ریان کا ہاتھ تھامے جانے کے
 لیے مڑ گئی تھی۔

☆☆☆

جیلہ داؤد ہاسپل سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گئی
 تھیں۔ جو دوست احباب ہاسپل ملنے نہیں آ سکے
 تھے۔ وہ انہیں گھر پر ملنے آرہے تھے۔ پھولوں کا ڈھیر
 تھا جو ان کے کمرے میں لگ چکا تھا۔ مہمانوں کی
 خاطر مدارت میں وہ دن بھر مصروف رہی۔ سب سے
 آخر میں مسز عثمان گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد
 مسز شیرازی اپنا پرہیزی کھانا کھانے کے بعد سو گئیں
 تو وہ باہر آ گئی۔ اس نے قارس کو کچن کی طرف جاتے
 دیکھا تو اس کے پیچھے وہیں آ گئی۔
 "میں کھانا لگا دیتی ہوں۔"

"میں خود کر لوں گا۔" سنجیدگی سے کہہ کر اس
 نے کینٹ کھول کر برتن نکالے۔ مائیکرو ویو میں پلاؤ
 گرم کیے، کیا پلیٹ اٹھائے عین سامنے شیشے کی دیوار
 کے پاس رکھے صوفے پر جا بیٹھا۔ وہاں سے سوئمنگ
 پول اور عین لان کا وسیع و عریض منظر نظر آتا تھا۔
 وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

"جائے پوگے؟" کافی تردد کے بعد وہ کچھ
 ہمت مجتمع کرتی اس کے پاس دوبارہ آئی۔ اس نے
 سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پیشانی پر ہال بے ترتیبی سی
 لیے ہوئے تھے۔ قدرتی خم آنکھوں میں سرخ
 ڈوریاں نظر آرہی تھیں۔
 "خود بنا لوں گا۔"

رخ موڑ کر کھانا کھانے لگا۔ جنت نچلا لب
 کاٹ کر رہ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جائے بنا کر
 اپنی اسٹڈی میں بند ہو گیا۔ گزشتہ کئی روز کا یہی معمول

تھا۔ دونوں کے مابین اب کوئی بات نہیں ہوتی
 تھی۔ وہ کرنا بھی چاہتی تو قارس نظر انداز کر دیتا
 تھا۔ غلطی اس کی بھی تھی کیسے۔ نے ابھی تک اپنی
 رویے کی معافی نہیں مانگی تھی۔ کچھ دیر تک وہ یونہی
 بے مقصد راہداری میں چلتی رہی۔ پھر کافی بنا کی اور
 دروازے پر آہستہ سے دستک دیتی اندر داخل ہوئی۔
 وہ سامنے ہی آفس ٹیبل پر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا
 تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کی بھنویں غیر محسوس
 انداز میں سکڑ گئی تھیں۔

"مجھے کافی نہیں چاہیے۔" لیپ ٹاپ پر
 قارس کی انگلیاں تیزی سے محرک رہیں۔ جنت نے
 لگاس کے سامنے رکھ دیا۔
 خطاب کاٹتے ہوئے وہ چند لمحوں تک اس
 کے پاس کھڑی رہی۔

"کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟" نرمی سے
 پوچھا۔ جنتی دیر ہو چکی تھی۔ اب مزید دیر نہیں کرنا
 چاہتی تھی۔

"میں مصروف ہوں!" سرد سا لہجہ۔ جنت کی
 ہمت ختم ہونے لگی۔ جو لفظ ترتیب دے رکھے تھے کم
 ہونے لگے۔ جو سوچ رکھا تھا وہ بھونے لگا۔
 "صرف پانچ منٹ۔" منت بھرے لہجے میں
 کہا۔

وہ سنی ان سنی کیے اپنا کام کرتا رہا۔
 "پلیز! قارس۔" کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس
 نے لیپ ٹاپ بند کر کے اپنی آفس چیر کر رخ اس کی
 طرف گھما دیا۔ سینے پر بازو باندھے اسے دیکھنے
 لگا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر جنت کو پریشان کر گیا۔
 ایسی سرد مہری تھی ان میں۔ اور ایسا خالی پن تھا جیسے
 ان میں بھی کچھ تھا ہی نہیں۔
 "آٹم ریلی سوری۔"

"کس لیے؟" اس کا لہجہ اجنبی سا تھا۔
 "مجھ سے جو غلطی ہوئی۔" وہ بے حد شرمندہ
 تھی۔

"کیا تم سے بھی غلطی ہوتی ہے؟" اس کا

سردیوں میں پوچھا جانے والا سوال اس کے اعصاب پر بھاری پڑا۔ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

"میں مانتی ہوں میں نے تمہیں ہرٹ کر دیا۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر۔"

"میری اجازت کے بغیر تم میرے بچے کو میرے ہی علم سے بچانے لگی تھیں۔ اس میں یہ غلطی کہاں سے آئی؟"

جنت کمال لا جواب ہو کر رہ گئی۔ فارس و جہان نے اس کے لیے ہر جت، دلیل کا جواز ہی ختم کر دیا۔ اس نے چلک چکا کر آنکھوں کی نمی کو دبایا۔

"فارس۔"

"مجھے تمہارے وہاں جانے سے اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے تھا بھی تو اب نہیں ہے۔ یوے لیونڈا!" اس نے لب پٹاپ دو بارہ کھول لیا۔ جنت نے آنسو ضبط کیے۔

"میں مانتی ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ کرنا چاہیے تھا۔" اس کی آواز کمزور ہو رہی تھی۔

"میں تمہارے اس بھروسے کے لائق نہیں ہوں!"

جنت کو اپنا دل مٹھی میں جکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

"ایسے نہیں کرو پلیز!! میں اپنی غلطی تسلیم کر رہی ہوں۔" مضطرب ہو کر کہا۔

"جب غلطی تھی ہی نہیں تو تسلیم کیا کر رہی ہو؟"

جنت کمال کچھ کہہ نہ سکی۔

"میں صرف آنٹی کے لیے۔ وہاں گئی۔"

لب بے بہت ختم ہو رہی تھی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ کیا میں اب کوئی شکوہ یا اعتراض اٹھا رہا ہوں؟"

وہ آنکھوں میں کی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اب تم جاسکتی ہو۔" وہ اپنا کام کرنے لگا۔

وہ کچھ دیر تک کھڑی رہ گئی۔ پھر آہستگی سے قدم اٹھاتی اسٹڈی روم سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

سارا دن مسز شیرازی سے ان کی دوستی ملنے آتی رہی۔ ان کا موبائل اس کے پاس تھا۔ کالز وہ اٹینڈ کر رہی تھی۔ ان کی صحت یابی کے تمام پیغامات بھی وہی لکھ رہی تھی اور فارس کی موجودگی میں اپنے آپ کو یہاں وہاں گم کر لینے کی جستجو بھی جاری تھی۔

رات جو بات ہوئی تھی اس کے بعد سے وہ اس کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔ سختی ہر دمہری۔ اور بے گامگی کا تاثر اس کی آنکھوں میں آنسو لارہا تھا۔ کتنی ہمت کر کے وہ اس کے پاس گئی تھی اور اس نے دو منٹوں میں ہی سب فنا کر دیا۔ ایسی بات کہہ دی جسے رد کرنے کو کچھ باقی ہی نہ رہا۔

اب وہ کیسے یقین دلانے کہ وہ اس کے لیے غیر اہم نہیں ہے؟ اس نے سوچا اور دماغ نے ایک ایسی سی چارج شیٹ دکھا دی۔

وہ اہم ہوتا تو وہ اس کی بات کو اہمیت دیتی۔ اس کی ناراضی سے ڈرتی۔ اس کا لحاظ کرتی۔ جھوٹ نہ بولتی۔ پلاننگ کر کے نہ جاتی۔ سارا دن وہ دھکی اور پریشان سی رہی۔ شام میں مسز شیرازی کے کمرے میں بھی جب وہ دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ موبائل سامنے کر لی اپنی نظروں جھکا گئی۔

ریان اس کی گود میں سر رکھے اپنا فیڈر لپی رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے بالوں میں چل رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے ٹائپنگ ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ فارس کو بھی دیکھ لیتی۔ وہ بیڈ پر ان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ چہرے پر زری تھی۔ مسکراہٹ بھی۔ اسی دوران اس کے موبائل پر آئمر کا میسج آ گیا۔

"میں نے فارس بھائی کو سوری کا اتنا بڑا میسج لکھ کر بھیجا اور انہوں نے مجھے بلاک کر دیا۔" ساتھ ہی روتے دھوتے ایو جی موصول ہوئے۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے جنت۔ بھائی کو پتا چلے گا تو وہ مجھے بہت ڈانٹیں گے!"

اس نے چپکے سے اس کا ڈر کر اس کا پھٹک

کے بعد کچھ دیر تک سوچوں میں گہری وہیں بیٹھی رہی۔

ریان شیرازی اس کے پہلو میں نے خبر سو گیا تھا۔ دوسرے جھکا کر اسے دیکھنے لگی۔

اس کے آس پاس نہ کوئی شور تھا، نہ گہری کی پیش۔ اس نے تو دودھ بھی سیر ہو کر پیا تھا۔ اس میں کوئی ملاوٹ بھی نہ تھی۔ اسے وہاں ڈانٹ بھی نہیں پڑ رہی تھی اور بچے اسے تنگ بھی نہیں کر رہے تھے۔ اور اسے مار بھی نہیں رہے تھے۔ اور روٹی ذرا ذرا سی دیر بعد اسے بھول کر اور بھاگتے ہوئے پاس بھی نہیں آ رہی تھی۔

جنت اسے دیکھتی رہی۔ جتنے سکون سے ریان سو رہا تھا وہ بھی اس لمحے اتنے ہی سکون سے سونا چاہتی تھی۔ مگر اس کا سکون اور آرام تو فارس و حیدان کی ناراضی میں ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ گہری سانس لے کر اٹھ گئی۔ ریان کو مسز شیرازی کے پاس سلا کر باہر آئی تو فارس اسٹڈی روم میں تھا۔ اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بار بار اس کے بائیں ذہن میں آ رہی تھیں۔ اس کا اچھی سرد لہجہ دل میں خوف سا بٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں سب کیسے ٹھیک ہو گا؟ وہ بے بسی سے بند دروازے کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو بیڈ پر جنت کونہ پا کر فوراً اسے اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ بڑھا کر لیب آن کر دیا۔ میل کلاک پر وقت دیکھا تو ڈھائی بجے رہے تھے۔ یہ کہاں چلی گئی؟ تیزی سے اٹھ کر وہ باہر آ گیا۔ راہداری سنسان تھی۔ بچن کی لائٹس آف۔ نماز والے کمرے میں بھی کوئی نہ تھا۔ مسز شیرازی کے کمرے میں بھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں سرعت سے قدم اٹھاتا لالہ بھیری تک گیا۔ ڈرائنگ روم بھر محبتی دیوار کا شیشے کا دروازہ کھولتا دامن طرف مڑا اور جھٹکے سے رک گیا۔ وہ اتنے سامنے ہی بیٹھی دکھائی دی۔ سوئمنگ پول کے مین سامنے۔ پول چیمبر پر

نمبر کھولا یہ جاننے کے لیے کہ کہیں وہ تو بلاک نہیں ہو گئی۔ ۲۲؟ اس نے بھی تو کل رات ہی بات کی تھی اس سے۔

صد شکر کہ ریچ روڈ کی ڈی پی نظر آ رہی تھی۔ دل کو سکون سا ملا۔

بلاک ہو کر زیادہ دکھ ہونا تھا اسے۔ "فارس بھائی کے ساتھ صلح ہو گئی؟" اس نے اگلا سوال کیا۔ ان کے معاملات ٹھیک ہو گئے تو گوار اس کے سر پر سے بھی ہٹ جائے گی۔ "ابھی تک تو نہیں!" اس نے کچھ مایوسی سے جواب لکھا۔

"تو نہیں مٹاؤ تا۔"

"کیسے مٹاؤں۔ وہ اب کوئی بات ہی نہیں کرتا!"

"تم ان کے لیے کوئی گفٹ لو۔ یا ڈرائنگ کر لو۔" اس نے بڑی فکر مندی سے اسے مشورہ دیا۔ اگلے ہفتے وہ اپنے بھائی کے پاس دینی جا رہی تھی۔ اور چاہتی تھی اس سے پہلے ہی یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے۔ بھائی کوئی الحال تو کچھ پتا نہیں تھا۔ مگر فارس پر کیا بھروسہ۔ اس کے وہاں پہنچنے ہی فون کھڑکا دے۔

"گفٹ! جنت کی آنکھیں چمکیں۔" یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں آیا۔ مجھے کیا لینا چاہیے؟" "اب یہ بھی میں بتاؤں؟" آئمہ کا صد سے بھرا جواب آیا۔

"گھڑی۔ پرلیوم۔ یا پھر کف لکس۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "ڈیپائڈ کر کے جلدی سے انہیں راضی کرو!" آئمہ کہہ رہی تھی۔

"تم تو جیسے اپنے فارس بھائی کو جانتی ہی نہیں ہو!" جنت چڑ گئی۔

"میں نہیں جانتی۔ تم تو جانتی تھی نا۔ پھر بھی انہیں ناراض کر دیا۔"

جنت کے لب بھنج گئے۔ آئمہ سے بات کرنے

میٹھی۔ پلیٹ ایک ہاتھ میں۔ دوسرے ہاتھ میں بیج لیے۔ مزے سے بریانی کھا رہی تھی۔ کین پاس ہی رکھا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو۔ تاثرات بدل گئے۔ جس طرح وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ فیصے سے تو اسے لگا۔ وہ بری پھنسی۔ کیا سوچے گا روٹی آنکھوں کے ساتھ اسٹڈی روم سے نکلی تھی اور اب اتنے مزے سے کھلی فضا میں کھانا کھا رہی ہے۔

"میں بیج میں بہت دھمی ہوں۔" اس نے طلق سے بمشکل نوالہ اتارتے ہوئے تیزی سے بولی۔ "مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا میں تھوڑا سا کھا لیتی ہوں۔ ورنہ میں۔ میرا مطلب ہے۔ بیج میں اس بات پر ادا اس ہوں کہ تم ناراض ہو۔"

"کیا میں نے کچھ کہا؟؟؟" دانت چس کر پوچھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ وہ اسے سرد نگاہوں سے گھورتا واپس پلٹ گیا۔ کچن میں تپ کر فریزر کھولا۔ ڈرامی دیا تھا اس نے تو۔ اب رات کے اس پہر لان میں کھانا کون کھاتا ہے بھلا؟؟؟

"کیا تم میری گھر میں اٹھ کر آ گئے؟" بے حد قریب سے آواز گونجی۔

"پانی بنے آیا ہوں۔"

"پانی تو گمرے میں بھی رکھا ہے۔"

دانت چس کر وائر بول کا ڈھکن کھولا۔ "مجھے ٹھنڈا چاہیے تھا!"

"روم فریج میں بھی ٹھنڈا ہی رکھا ہے۔"

وہ ضبط کر کے مڑا۔

"کیا تمہیں مجھ سے کوئی مسئلہ ہو رہا ہے؟"

اس نے فوراً سے نشی میں سر ہلایا۔ "مجھے بھلا کیا مسئلہ ہوگا؟ بھلے سے تم سوئمنگ پول کا پانی پیو۔ میں کون ہوتی ہوں اعتراض کرنے والی؟" بہت سمجھ داری اور سنجیدگی سے اپنے لہجے کو ڈھالتے ہوئے بولی۔ کہ مزید کوئی بد مزگی نہ ہو۔ مگر اس کا آخری جملہ قارس کا پارہ چڑھا گیا۔

"یعنی میرا رات کو اٹھ کر پانی پینے کے لیے کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟"

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

کچن میں آنا مارل نہیں ہے؟

"میں نے یہ کب کہا؟"

"تم بھی کہہ رہی ہو۔"

اس نے پہلے نشی میں سر ہلا کر۔ پھر فوراً سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "مارل بات ہے۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔" پلیٹ ہاتھ میں تھی۔ چمچ منہ میں ڈالا۔ اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ "کچھ کھاؤ گے؟"

"تم بس اپنی فصل کم کر لو۔" اس نے ہاتھ

کے اشارے سے اسے وہاں سے جانے کو کہا۔

"اگر پاس کھڑی رہوں گی تو کیا ہو جائے گا؟"

"میرا دماغ اڑ جائے گا۔" واسنے ہاتھ کو

پیشانی تک لاتے بھٹا کر جواب دیا اور کچن سے چلا

گیا۔ وہ بریانی کھاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے

کمرے میں آ گئی۔

"اصل میں باہر صرف کھانا نہیں کھا رہی تھی۔

ہینڈ کر سوچ بھی رہی تھی۔ کہ تمہارے ساتھ میری صلح

اب کیسے ہو سکتی ہے؟؟؟ وغیرہ وغیرہ۔ پہلے میں نے

سوچا آٹھی سے بات کرنی چاہیے۔"

"ڈونٹ بوڈیر۔" اس نے لحاف ہٹا کر بیڈ پر

بیٹھتے اسے کڑے تیوروں گھورا۔ جنت کے طلق میں

بیج کچھ کھا تک گیا۔ ڈر کر فوراً بات بدلی۔

"ہاں ہاں بالکل! مجھے بھی لگا کہ یہ اچھا

آئیڈیا نہیں ہے۔ آٹھی کو ٹینشن دینا بالکل بھی درست

نہیں ہے۔"

وہ لحاف تان کر لیٹ گیا۔

"پھر میں نے سوچا کہ تمہیں تھوڑا سا وقت اور

اپیس دینی چاہیے۔"

"تھینک یو ویری میچ" اس نے جس طرح سے

سلک کر کہا تو اسے لگا اس بات پر وہ راضی ہو رہا ہے۔

نام اور اپیس چاہیے موصوف کو۔

"لیکن پھر میں نے سوچا۔ کتنا نام اور

اپیس؟"

"دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟" اس نے لحاف

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

دل یو پلیزی سلیپ ناؤ؟

ہٹا کر غصے سے کہا تو جنت کی آنکھوں میں خفگی درآئی۔
بے عزتی جیسی لیلیٰ نکلی تھیں۔

"شیوہ!" آہستہ سے بولی۔ "میں کون سا
کہہ رہی تھی۔ میرے ساتھ جاگو۔ خود ہی تو اٹھ کر آ
گئے۔ میں تو لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔" بڑبڑا کر اٹھ
گئی۔ کچھ قدم چل کر واپس پلٹ آئی۔ اس کے
سرہانے بڑی مشکل سے جھکی۔

"آر پو شیوہ تمہیں نام اور آپس چاہیے؟؟"
وہ لب بھنج کر رہ گیا۔

"اب میرا کوئی میکہ بھی نہیں ہے جہاں میں
کچھ دنوں کے لیے چلی جاؤں۔" بڑی بے چارگی
سے کہہ کر سیدھی ہوئی۔ فارس کی لاف میں بند
آنکھیں کھل گئیں۔

"مدحت ہانو کے ساتھ اپنے دوسرے گھر
شفٹ ہو جاؤں کچھ دنوں کے لیے؟؟؟ میرا مطلب
ہے اگر تم جاہو تو اس طرح تم مجھے بار بار نظر آتے
ہو تو میرا بات کرنے کا دل چاہتا ہے۔ اور تم غصے میں آ
جاتے ہو۔"

اس نے چہرے سے لاف ہٹا دیا۔ اس کے
تاثرات سے اسے ایک دم اپنی بے وقوفی کا احساس
ہوا کہ اس گھر میں اس نے ناراض ہو کر ہی جانا تھا۔
ناراض کر کے تو نہیں۔ اب جو اگر اس نے کہہ دیا کہ
ہاں! چلی جاؤ تو پھر کیا کرے گی وہ؟

"آئی تھنک تجھے ہی گھر چھوڑ دینا چاہیے" وہ
اٹھنے لگا تو وہ فوراً سے منع کرنے لگی۔ "نہیں نہیں آتم
سوری۔ تم آرام کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ کچھ نہیں
بولوں گی۔ گڈ نائٹ اللہ حافظ" فوراً سے اسے کہتی
باہر نکل گئی۔ دروازہ بھی بند کر دیا۔

وہ لب بھنجے اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن اس نے جیسے تیسے خود پر ضبط کیا اور
فارس سے مخاطب نہیں ہوئی۔ سارا دن وہ ادا اس رہی
اور فارس آفس روم میں کیک، پیسٹریز اور جانے کیا
کچھ منگوا کر کھاتا رہا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سوئمنگ بھی

کی۔ شام تک کہیں گھومنے بھی چلا گیا۔

وہ بہت صبر سے سب ملاحظہ کرتی رہی۔

کوئی بات کہیں جنت۔ دل دکھایا ہے تم نے
اس کا۔ اعتبار توڑا ہے۔ ذرا صبر کرو۔ سب ٹھیک
ہو جائے گا۔ وہ خود کو سمجھاتی بچھاتی رہی۔

رات کا کھانا اس نے ڈائننگ ٹیبل میں اکیلے
بیٹھ کر کھایا کہ موصوف نے گل خان سے پیرا بنوا لیا
تھا۔ اور اب لان میں اکیلے تاول فرما رہا تھا۔ وہ کئی
بار ضبط کرنے کے دروازے تک گئی اور پھر زبردستی کی
سکراہٹ لیوں پر سجائے واپس پلٹ آئی۔

"وقت اور آپس!" گہری سانس لے کر
دہرایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ہاتھ پھیلا کر خود
سے کہا۔ قاصد بس ایک دن تک ہی رکھ سکی کہ اگلے
دن صبح سویرے ہی اس کے جم پہنچ گئی۔

"ایچی پرا بلیم؟؟"

وہ چٹ برکس مشین پر تھا اور اسے دیکھتے ہی
ہینڈل چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔

"کیا ہمارے درمیان اب کچھ بھی ٹھیک نہیں
ہوگا؟؟" بہت بے چارگی بھرے دکھ سے پوچھا۔
وہ آنکھوں میں خفگی لے لے دیکھا رہا۔
"اب میں تم سے معافی مانگ تو رہی ہوں۔"

اسپیس اتر کر نیچے آ گئی۔
"کیا میں نے کہا مجھے معافی کی ضرورت ہے
یا میں تم سے ناراض ہوں؟؟"

جنت کی بھنویں سکڑ گئیں۔
"میں مانتی ہوں میں نے غلط کیا۔ مجھے تمہاری
بات مانتی چاہیے گی۔"

"کیا میں کوئی شکوہ کر رہا ہوں؟۔"

جنت کچھ کہہ نہ سکی۔
"اور اگر تمہیں اپنی کسی ڈیل یا وعدے کی پرواہ
ہے تو فکر مت کرو۔ مجھے سب یاد ہے۔"

جنت نے رو ہانسا ہو کر اسے دیکھا۔ وہ کیا کہہ
رہی تھی اور وہ اسے کیا سن رہا تھا۔

"کیسی ڈیل؟ کیا وعدہ۔ ہمارے درمیان

۱۸۴ 2022 نومبر

سب ٹھیک تو ہو گیا تھا۔

قاری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کب ٹھیک ہوا تھا؟"

"وہ۔ میری اس آخری غلطی سے پہلے۔"

شرمندہ ہو کر بولی۔

"اگر سب ٹھیک ہوتا تو کیا تم وہ حرکت کرتے جو تم نے کی۔"

جنت اپنی جگہ قائم تھی۔

"ابھی تم کہہ رہے تھے تم مجھ سے ناراض نہیں ہو" روہانسا ہو کر بولی۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟" اس کی پیشانی پر تل آگئے۔

"تو جس وجہ سے ناراض ہو۔ اس وجہ پر۔ آتم رنجی سوری۔"

"یوے لیو ناڈا!" اس نے کہہ دیا۔ حکم سے۔

وہ نیچے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

"کیا بنا؟" کچھ ہی دیر میں آتمہ کی کال آگئی تھی۔ وہ دعی میں تھی۔ اور چونکہ ابھی تک بڑے پچالی نے باز پرس نہیں کی تھی تو کچھ مطمئن لگ رہی تھی۔

"مجھے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

اس نے موبائل کو ہٹا کر گھورا۔ اور پھر کان سے لگایا۔ "جنت تم۔"

"آتمہ میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔ پلیز مجھے کچھ مت کہو۔"

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ دوپہر میں اس نے دوبارہ کال کی۔ وہ پریشان سی لاؤج میں بیٹھی تھی۔

"اچھا تم ایسا کرو۔ مجھے بتاؤ وہ کس براڈ کی ایسیریز استعمال کرتے ہیں۔ میری دوست کل پاکستان جا رہی ہے میں اس کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں!" پیچھے سے کچھ شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ وہ کسی مال میں بھی شاید۔

"براڈ تو میں نہیں بنا سکتی۔"

آتمہ نے ہلکویٹر میکوین کے کف لکس بھیجے۔

بس انسانی کھوپڑیاں تھیں جو اسے نظر آئیں۔

"کون لیتا ہو گا یہ؟" اس کی آنکھوں میں ناگواری اتر آئی۔ "مسلمان پہنتے ہوں گے تو نماز تو نہیں ہوتی ہوگی۔" کچھ اور تصاویر کو بھی رد کر دیا۔

"تم مجھے ٹھیک سے بتاؤ گی تو میں کوئی بہتر گفت لے سکوں گی نا۔" آتمہ جگ آگئی۔

"مجھے کیا پتا میں خود پہلی بار یہ خرید رہی ہوں۔" اس نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ "پاکستان کی کوئی چیز ہوتی تو مجھے سمجھ میں بھی آتی۔ اس کا تو سب کچھ باہر کا ہی ہے۔"

"نہ سمجھیں کار لیپے کی سمجھ میں آ رہی ہے۔ نہ ہلکویٹر میکوین کی۔ تم قاری بھائی سے پوچھ لو۔ انہیں کس براڈ کی پسند ہیں تو وہی بتا دو۔ میں لے آؤں گی!"

"اگر وہ میرے کسی سوال کا جواب دیتا۔ تو کیا ہی بات تھی۔" ٹھنڈی آہ بھر کر آہستگی سے دروازہ کھولتی کمرے میں داخل ہوئی۔ لائٹس آف تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔

"ایک سیکنڈ۔" سرگوشی میں کہتے ہوئے وارڈروب کا رخ کیا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے مگر زرد روشنی پھر بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ سے وارڈروب سلاٹ کی دروازہ کھولے۔ اس کے کف لکس کا شان دار سائیکلشن سامنے تھا۔ موبائل کی فلیش لائٹ آن کیے۔ کچھ تصویریں کھینچ کر بھیجیں۔

آتمہ کچھ دیر تک تو الجھتی رہی پھر اسے چھ ایک سمجھ آ گئیں۔

"ہاں یہ تو cartier کی ہی لگ رہی ہیں۔ اور اس طرف dunhill کی ہے۔ بھائی پہنتے ہیں اسے۔ اور یہ۔ اومیگا ہے آئی کیس۔ اور یہ پتا نہیں کس براڈ کی ہے۔"

"میں دیکھتی ہوں!!"

چند ایک سیاہ رنگ کے ہا کس تھے۔ انہیں کھول کر دیکھا۔ براڈ کا نام چیک کیا۔ بھول گئی کمرے میں ہے۔ اور قارس بھی سو رہا ہے۔ پہلے جو جیٹا ہو کر چیک کر رہی تھی۔ اب بے احتیاطی سے اٹھا بیٹھ ہونے لگی تھی۔

"مونٹ بلاک!" اس نے نام پڑھ کر بتایا۔

"میں بلاں!" عقب میں گیسری آواز میں کچھ جھنجھکی سے صحیح کی گئی۔ "لی اور سی ساکلف ہیں!"

وہ ایک ہاتھ میں موبائل دوسرے ہاتھ میں ہا کس لیے اپنی جگہ پھر ہوئی۔ منہ بند کر کے آنکھیں میچ لیں۔ وہ لحاف ہٹاتا اٹھ گیا۔ لائٹس آن کر دیں۔ "کیا کر رہی ہو؟" گردن موڑ کر اپنی وارڈ

روپ پر سرسری سی نگاہ دوڑائی۔ اب وہ بتا دیتی کیا کر رہی تھی تو سر پرانز کا تو یہیں بیڑہ غرق ہو جاتا تھا۔ تیزی سے ہا کس اٹھ کر رکھا۔ دھماکا بند کی۔ وارڈ روپ بند کر دی۔ پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے مڑی۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی۔ دیکھ رہی تھی۔ تمہارے کف ٹکس کافی اچھے ہیں مگر اس لیے۔" مسکراہٹ۔ وہ پھونپ سکیڑے سے دیکھتا رہا۔ "میرے کف ٹکس کا تم نے کیا کرنا ہے؟"

اکڑا ہوا لب۔

"کچھ نہیں۔ میں بھلا کیا کروں گی۔ یہ تو ایسے ہی بس۔ میں چلتی ہوں!! تم آرام کرو" کھسکتا چاہا تو وہ راستے میں ایسا دھو گیا۔

"کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ آرام کر رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔" لہجہ سخت تھا۔ "ہاں۔ بالکل۔ کہا تھا۔ میں بس۔ وہ۔ غلطی سے۔ سو رہی!!"

اپنی جان بچاتی دائیں طرف سے کھسک کر باہر نکل گئی۔ اف!! سانس بحال کرتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا۔ پھر آئینہ کو کال کی۔ اس نے تینوں براڈز کے کف ٹکس کی مختلف تصاویر بھیجیں۔ اب وہ بغور

دیکھتے ہوئے پسند کر رہی تھی۔ موب بلاں کا اسے پسند آ گیا۔ ایک اومیکا کالیا۔ سب ڈن کر کے مطمئن ہو گئی۔ شام تک آئینہ نے بتایا اس کی دوست کل کی فلائٹ سے واپس نہیں آ رہی تھی۔

"یہ آج کل میرے ساتھ اتنا ہمارا کیوں ہو رہا ہے!" وہ رو دینے کو تھی۔ سوچا تھا کل ہی گفٹ دے کر بات کرے گی مگر۔

اب وہ شیشے کی دیوار کے سامنے دائیں سے بائیں۔ اور بائیں سے دائیں مارچ کرنے لگی تھی۔

بہتر ہے کہ وہ یہیں سے کچھ خرید لے۔ اچھا سا قلم۔ یا پھر گھڑی۔ کل اسے ہاسٹل چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ اس نے پرسوں کا پلان بنا لیا۔ قارس قریب سے گزر رہا تھا تو مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے آئی۔ "ہیلو مسٹر شیرازی! پانچ منٹ ہوں گے آپ کے پاس؟"

"نہیں!" صاف انکار۔

خجل سے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

"اس طرح منہ بنا کر رہنے سے بہتر نہیں ہے کہ تم مجھے تھوڑا سا ڈانٹ دو۔ غصہ دکھا دو۔ تھوڑا سا لڑ جھگڑ لو۔ میں چپ چاپ سن لوں گی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گی۔"

"اور میں ایسا کیوں کروں؟"

"تاکہ ہمارے درمیان سب ٹھیک ہو جائے!"

"کیوں ٹھیک ہو جائے؟؟"

جنت نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "قارس!"

ایک ہاتھ جیب میں ڈالے، دوسرا ہاتھ ریلنگ پر رکھا سے گھورتا ہوا بیڑہیاں چڑھ گیا۔ وہ لب بچ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

مسز شیرازی کی صحت بہتر ہوئی تو وجدان ہاؤس میں دعوت رکھ لی گئی تھی۔ گھر دشمنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ دوست احباب اور کچھ رشتہ داروں کو مدعو کیا

گیا تھا۔ اس کی طرف سے سائرہ خالہ اور ابراہیم انکل بھی آئے تھے۔

کھانے کا انتظام وسیع لان میں کیا گیا۔ گول میزوں کے گرد ترتیب سے کرسیاں رکھی گئیں۔ ملازم مستعدی سے اپنا کام سرانجام دیتے مہمانوں کا بہت اچھے سے استقبال کر رہے تھے۔ مہمانوں کی توجہ کا مرکز ریان بنا ہوا تھا۔ سب اس سے مل رہے تھے۔ اسے پیار کر رہے تھے۔ وہ اپنی دادی کی گود میں تھا۔ اور اتنے سارے بچوں کی موجودگی میں نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ وہ بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ کھیلا نہیں چاہتا تھا۔ بھاگتا نہیں چاہتا تھا۔ چند ایک بار مسز شیرازی نے اسے نیچے اتارا تھا مگر وہ رونے لگ گیا تھا۔

کیا وہ ڈر رہا ہے؟ جنت پریشان ہوئی۔ روبی نے بتایا تھا اوصاف منزل کے بچوں کی وجہ سے ہی اسے کئی بار چوٹیں آئی تھیں۔ مسز شیرازی کے سینے پر سر رکھے۔ وہ جس طرح سے کچھ پریشان سانس کو دیکھ رہا تھا۔ تو اس کے دل کو کچھ ہوا۔ حالانکہ سارا دن وہ کافی فرلش رہا تھا۔

اسی دوران اپنے بھائی اور پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلتی زویا کی نظر اس پر پڑی اور وہ سب چھوڑ چھاڑ کر رک گئی۔ اس پر ایک دم سے انکشاف ہوا کہ وہ بہت چھوٹا سا بے بی ہے۔ اپنے سفید فراق میں بھاگتی ہوئی پاس آکھڑی ہوئی۔

مسز شیرازی باتوں میں مصروف تھیں۔ پہلے وہ بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی رہی۔ "بے بی!" اسے وہ اچھا لگا۔ ہاتھ اٹھا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو ریان نے فوراً سے منہ منہ لیا۔ وہ گھوم کر دوسری طرف آئی۔ تو ریان بھی گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے پھر اپنے ننھے سے سر کی زب کھول کر اس میں سے ٹانی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"بے بی یہ لو!" پیاری سی آواز میں پکارا۔ دائیں جانب سر جھکا کر۔ محبت سے اسے دیکھتے۔ قریب ہو کر اپنا ہاتھ مزید اوپر کیا۔ پھر خیال آیا کھول

کر دینا چاہیے۔ کھول کر دیا تو مسز شیرازی متوجہ ہو گئیں۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں سے لے کر ریان کے منہ میں دی۔ میٹھی سی نرم چیز تھی۔ اس نے چبا چبا کر کھالی۔ پھر وہ بھاگ کر گئی۔ اور اپنی می کے بیک سے ایک چاکلیٹ اور چپس کا آدھا کھلا ہوا پکٹ نکال لائی۔ مسز شیرازی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر ریان کو نیچے اتار دیا۔ وہ ان کے گھنٹوں سے لگ کر کھڑا رہا۔ اب وہ چھوٹے چھوٹے چپس کے ٹکڑے اس کے منہ میں دے رہی تھی۔ بہت سنجیدگی اور بڑی ذمہ داری سے۔

"بے بی یہ بھی لو۔" ریان اس کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گیا۔ وہ اس کے منہ میں جو ڈال رہی تھی وہ کھا رہا تھا۔ جنت کو وہ منظر بہت پیارا لگا۔ مسز عثمان کی ہاتھیں سختی مسکراتے ہوئے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے نہیں پتا تھا یہ کیوٹ سا انٹرکشن کچھ ہی دیر میں ایک خطرناک موڑ لینے والا تھا کہ جب مہمانوں کے لیے کھانا لگایا جا رہا تھا تو زویا نے ایک الگ ہی قسم کا مطالبہ رکھ دیا۔ اس کے پاس آگئی تھی۔

"جنت ہابی!! میں بے بی کو اپنے گھر لے جاؤں"

وہ جو تھکاوٹ کا شکار سارے انتظام دیکھ رہی تھی رک گئی۔ آنکھیں پھیلا کر زویا کو دیکھا۔ کچھ حیرت سے۔ اسے ریان چاہیے تھا۔ ایسے نہیں کہ کھیلنے کے لیے یاد دہانی کے لیے چاہیے تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتی تھی۔

"زویا! وہ تو بہت چھوٹا ہے۔ آپ اسے گھر کیسے لے جائیں گی؟"

"میں اسکا کھیاں رکھوں گی۔ کھانا بھی دوں گی۔ بہت شاری چاکلیٹ (چاکلیٹ) دوں گی۔ پشٹ (پشٹس) دوں گی۔"

جنت کو ایسی آگئی۔

"لیکن وہ بہت چھوٹا ہے۔ بہت روئے گا!"

"میں اسے چپ کروالوں گی!" وہ پراحماد تھی۔

"آپ روزیہاں آجایا کریں ریان کے ساتھ
یہاں کھیلنا چاہیٹ اور سلسلے بھی دیتا۔" دلیل سے
سمجھانا چاہا مگر زویا کو اور کوئی حل قبول نہیں تھا۔ ضد
باندھ لی۔ رونے لگی۔ اپنی ماما کو کھانا بھی کھانے نہیں
دے رہی تھی۔

"اے جو بچہ پسند آتا ہے کہتی ہے می گمر لے
چلیں!" وہ ہنس کر بتانے لگیں۔

جنت کی کچھ اور سمجھ نہ آیا تو کہہ دیا ریان قارس
کا ہے۔ زویا قارس سے بہت ڈرتی تھی۔ قوی امید
تھی کہ اپنی ضد سے پیچھے ہٹ جائے گی۔ مگر وہ جوتی
اپنے سفید فرائ میں گھومتی قارس کے پاس پہنچ گئی۔
"قارش اکل!" اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر
متوجہ کیا تو وہ ہات ادموری چھوڑتا اس کی طرف مڑا۔
"جنت بابی نے کہا ہے بی آپ کا ہے!"

پہلے سمجھ میں تو اسے کچھ نہ آیا وہ کیا کہہ رہی
ہے۔

"وہ والا بے بی آپ کا ہے؟" تعذیبی کے
لیے دور اشارہ کیا۔ مسز شیرازی کی طرف۔ قارس کی
بھنویں سکڑ گئیں۔

"میں بے بی کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤں؟"
اب وہ بڑی سنجیدگی سے اجازت چاہ رہی تھی۔
ایک تو اس کی جنت بھابی۔

اس نے دانت چیں کر جنت کی تلاش میں نگاہ
دوڑائی تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھی مخاطب دانتوں میں
دہائے جمیلہ داؤد کے پیچھے چھپ گئی۔ اللہ!! یہ کیا ہو
گیا!! اب اور ناراضی۔ کیا سوچے گا بچی کو سکھا کر بھیج
دیا کہ بے بی اس کا ہے۔ اب اسے پوری بات کون
سمجھائے؟؟

"آپ اٹھے مجھے دے دو۔ میں کھیلوں گی۔
میں بہت خائف ڈکھوں گی!" وہ اس سے ڈر رہی تھی
تھی۔ جھجک جھجک رہی تھی۔ اور مطالبہ بھی کر رہی تھی۔
اس کے والد صاحب وہیں بیٹھے تھے۔ "چلو
قارس جلدی سے مجھ سے میری بیٹی کا رشتہ مانگو اور
بس!"

"آپ کے دونوں بچوں کے رشتے اسی گمر
میں ہوں گے؟" اس نے جس طرح سے تپ کر
پوچھا۔ عید بھائی کا قبضہ سابلند ہوا۔
وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔
جنت نے زید کو بھیج کر زویا کو مشکل سے وہاں
سے ہٹا دیا۔

کھانا لگ چکا تھا۔ وہ اب تمام انتظامات دیکھ
رہی تھی۔ گوکہ ملازم موجود تھے مگر پھر بھی اسے گمرائی
کرنی پڑ رہی تھی۔

مہمان کھانا کھانے لگے تو وہ سائرہ خالہ کے
پاس ہی بیٹھ گئی۔ پاؤں دکھ رہے تھے۔ اور تھکاوٹ کی
وجہ سے کمر میں بھی درد ہو رہا تھا۔ مہمانوں میں بیٹھنا
بھی ضروری تھا۔ اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ
مسز شیرازی نے کہا تھا وہ کچھ دیر آرام کر لے مگر اسے
مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

سائرہ خالہ اب اس سے بات کر رہی
تھیں۔ ان کے علم میں نہیں تھا قارس کا بھتیجا بھی
ہے۔

"اپنے بھتیجا میں تھا!" اس نے بتایا۔
"تو اب نہیں رہے گا؟"

اس کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی قارس تک گئیں۔
"جی۔ ان شاء اللہ۔ نہیں رہے گا!" اس نے

کہا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر
چپ ہو گئی۔

"وہاں سب کسے ہیں؟" آہستہ سے پوچھا۔
"سب" سے مراد اس کی بیٹھنیں تھیں۔

"سب ٹھیک ہیں۔ حانیہ کی ماشاء اللہ ہے۔
بیٹی ہوئی ہے۔ پچھلے مہینے سب اس کی طرف تھے۔"

وہ ذرا سا مسکرائی لیکن آنکھوں کی نمی نہ دبا
سکی۔ نہ کوئی لفظ ادا کر سکی۔ نہ جذبات کے اظہار کے
لیے کچھ کہہ سکی۔ وہاں سب اکٹھے تھے اور وہ نہیں

تھی۔ غم۔ خوشی۔ دعوت۔ یا ملاقات۔ کوئی تعلق ہی
اس سے نہیں رکھا گیا تھا۔ اس کی خوشی میں بھی ان

میں سے کوئی نہ پہلے شامل ہوا تھا۔ نہ اب ہو سکتا تھا۔

اس کے بچے کی چھ خالائیں تھیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس کی پیدائش پر نہیں ہوئی۔

گہری سانس لے کر اس نے خیالات کو جھٹک دیا۔ وہ ان معاملات سے نکل چکی ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ وہ آگے بڑھ چکی ہے۔ بار بار دہرایا۔ اب وہ کھانا کھا رہی تھی۔ سائرہ خالہ اسے دیکھ رہی تھیں۔

بہنوں کے سوا اس نے کبھی بھی خاندان کے کسی دوسرے فرد کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ ماجین۔ برحان۔ اپنے تایا کی فیملی کے بارے میں بھی نہیں۔ ان کی آنکھیں سوچ میں ڈوب رہی تھیں۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھیں۔ کچھ ایسی باتیں۔ جو تاحال اس کے علم میں نہیں تھیں۔ مگر پھر انہوں نے ارادہ ترک کر دیا۔ جن کا ذکر تکلیف سے دوچار کر دے۔ وہ ذکر بہتر ہے کیا ہی نہ جائے۔

کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر مہالوں کو دیکھنے لگی۔ کسی کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔ ملازم سلاوہ راسیہ، اور مختلف ڈشز سرو کرتے نظر آ رہے تھے۔ پانی کو بوتل پکڑے سبز شیرازی کے پاس بیٹھ گئی۔ ریان ان کی گود میں ہی سو گیا تھا۔ زویا اپنی ماما کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ریان کو بھول گئی تھی۔ جنت نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اطراف میں چہل چہل۔ اور رونق سی نظر آ رہی تھی۔ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے۔ تکلیف وہ چھپاتے ہوئے اس نے پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔

"تم جاؤ اب۔ تھوڑا آرام کر لو۔" سبز شیرازی نے فکر مندی سے کہا۔

"جیسے بس ٹھیک ہے۔" کھائی موڑ کر وقت دیکھا۔ سبز شیرازی کی دوست سے باتیں کرنے لگیں۔ پانی کے چند گھونٹ لیے۔ اور تب ہی اسے قاریس اندر جاتے ہوئے دکھائی دیا تو معذرت کرنی فوراً سے اٹھ کر اس کے پیچھے صدر دروازہ عبور کرنی رابداری میں چلی گئی۔ وہ فون کال انینڈ کر رہا تھا۔

مٹھری کھڑی رہی۔ اس کا برٹش لہجہ دماغ کھارہا تھا۔ کچھ باتیں سمجھ میں آ گئیں۔ کچھ نہیں آئیں۔ مٹھلو کاروباری نہیں تھی۔ کسی راحم کا ذکر ہو رہا تھا۔ جس سے غالباً قاریس کا رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ بات کرتے کرتے جونہی مڑا تو نظر جنت پر پڑی۔ وہ الرٹ ہو گئی۔

"فرمائیے!" کال ڈسکلف کرتا اس کی طرف مڑا۔

ایک تو اتنا قاریل اور اجنبی سا رویہ ہوتا تھا اس کا کہ بس۔ آہستہ سے مسکرائی۔

"میں نے سوچا پوچھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے!"

"کچھ چاہیے ہو گا تو خود لے لوں گا تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں!" سرد لہجے میں جواب دیتا ریخ بدل گیا۔ نکاہیں سو بائیل اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

"کیوں فکر نہ کروں۔ آخر کو تم میرے شوہر ہو!" جتا کر کہتے ہوئے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"پتا نہیں کتنے دلوں تک ہوں!" اس کی بڑبڑاہٹ واضح تھی۔

"کتنے دلوں تک سے کیا مطلب؟ ہمیشہ کے لیے ہو۔"

"کسی نے خلع کے لیے کورٹ بھی جانا تھا!" اس نے یاد دلایا۔

"اچھا!" وہ انجان بن گئی۔

"اور جس کے خلاف جانا تھا وہ کوئی وحشی ظالم اور درندہ تھا۔" اسکو دلتک کرتے کچھ اوکے کر کے سینڈ کر دیا۔

"صرف ظالم!" جنت نے فوراً سے ٹوک دیا۔

"میں نے وحشی درندہ نہیں سمجھا۔ ہاں یہ ضرور سوچتی تھی کہ کتنا کھڑوس ہے۔ ضدی اور بد مزیز ہے اور کتنا مغرور ہے یہ۔ بات بھی نہیں کرتا۔ جواب نہیں دیتا اور دیکھو میری چائے پی گیا۔ بھوکا کہیں کا۔" اپنی دھن میں بول رہی تھی زبان کو بریک لگی کہ

لی۔ جیسے نظر لگ جانے کا خدشہ ہو۔
بھرو پشدرست کرتی باہر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

آسمان کی اجلی نیلی رنگت میں کہیں کہیں سفید
بادل پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چمکیلی دھوپ لان
کا سبزہ نگار رہے ہوئے تھی۔ مسز شیرازی گلاس والٹر
کے سامنے بیٹھی تھیں۔ مدحت ان کے سامنے چائے
کا کپ رکھ رہی تھی۔

قارس لاڈلج میں بیٹھا چمیل سرنگ کر رہا تھا۔
نیوز چمیل لگا کر کشن کو سر کے نیچے رکھتا ایزی ہو کر بیٹھ
گیا۔ ملازمہ فریج فرائز کی پلیٹ نیل پر رکھ کر چلی
گئی۔

اسی لمحے جنت بیڈروم سے نکل کر بکن کی طرف
جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ریان اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ
اس کا فیڈر بنانے لگی تھی۔

ریان ڈینم اور آل میں لمبوس اس کے پاس ہی
کھڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بکن سے باہر آ
گیا۔

وہ سائڈ نیل تک گیا۔ پھر گھوم کر دوسری طرف
کشادہ کھڑکیوں کی جانب۔ جہاں نیلا آسمان نظر آ
رہا تھا۔ شیشے پر ننھے ننھے ہاتھ رکھے اپنی ناک ٹکا کر
باہر دیکھا۔ پھر اس کی توجہ کا مرکز قارس بن گیا۔ وہ
میز بھی جس پر فریج فرائز کی پلیٹ رکھی تھی۔ موبائل
اور چند ایک دوسری اشیاء بھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم
اٹھاتا نیز تک گیا۔ چند لمحوں تک آنکھوں میں
معصومیت لیے اسے دیکھا پھر اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھا کر
پلیٹ پر رکھ دیا۔ قارس کی نظر اٹھی تو وہ ہاتھ رکھے
اسے دیکھنے لگا۔ یوں جیسے اس کے رد عمل کا اندازہ کرنا
چاہ رہا ہو کہ کہیں کچھ کہے گا تو نہیں؟

میگزین سائڈ پر کرتے اس نے کچھ اب سے
خالی فریج فرائز کا قدرے نرم کٹا توڑ کر اسے دیا۔ ذرا
ساقریب ہو کر اس نے پورے استحقاق سے لے لیا۔
پہلے انگلیوں میں لے کر دیکھا، غور سے کہ کیا چیز
ہے؟۔ پھر منہ میں ڈالا۔ مزے کا لگا تو مزید پاس آ

مٹھاپا بند کرتے ہوئے قارس نے جس طرح سے
لب بچھ کر سر اٹھایا تھا تو اسے لگاب اس کی خیر نہیں۔
"یہ تو میں پرانی باتیں کر رہی ہوں۔ جج میں پہلے
سوچتی تھی۔ تب تو میں بہت ہی پاکل تھی۔" توڑا
اعتراف کیا۔ بڑی ہی معصوم سی مسکراہٹ دکھائی۔
جس کا کوئی قاعدہ نہ ہوا۔

"اور رہ کیا گیا ہے؟" قارس کا پارہ چڑھ گیا
تھا۔

"تم رہ گئے ہو۔ باقی جو کچھ بھی سمجھتی تھی وہ ختم
ہو گیا۔"

وہ اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے
اسے سمجھتی رہی۔ دوسرے جھک کر رخ بدل گیا۔

"ایسا کب تک چلے گا؟" بہت ہی نرمی اور
پیار سے پوچھتے ہوئے اپنی گردن کو دائیں طرف
جھکایا۔

"بہت لمبے عرصے تک۔" جواب فوراً مل
گیا۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ سر اٹھا کر
اسے بغور دیکھا۔

"میں نے پہلی بار غور کیا ہے۔ تم ناراض ہو کر
زیادہ اچھے لگتے ہو۔" ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگی ٹاٹ
درست کی۔

"تم بھی بہتر لگو گی۔ اگر مجھ سے دور رہو گی
تو۔" تحمل سے وارنگ دی۔

"پھر میں بری ہی ٹھیک ہوں!" خوشی خوشی
اس کا بازو پکڑ کر دابٹا گال کندھے سے لگایا۔

قارس کا موبائل بج اٹھا۔ کسی جیو اینڈرسن کی
کال تھی۔ اس نے بازو چھوڑ دیا۔ وہ کال ریسیو کرتا
گیلری میں جا کھڑا ہوا۔

جنت گہری سانس لیتی صوفے پر جا بیٹھی۔
گردن کو پیچھے کئے۔ ٹکے کو گھورنے لگی۔ پتا نہیں اس
کی ناراضی کب ختم ہو گی۔ نگاہیں گیلری تک گئیں۔

وہ فون کان سے لگائے بات کر رہا تھا۔ اس کے لبوں
پر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ کتنے
دکوں بعد وہ اس طرح مسکرا رہا تھا۔ اس نے نگاہ ہٹا

گیا۔ اس نے دوسرا توڑ کر دیا، پھر تیسرا، اس کے
تاثرات بتا رہے تھے اسے فریج فرائز کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے کتنے پسند آ رہے تھے۔ مسز شیرازی
بالکل سامنے ہی گلاس والٹر کے پاس بیٹھی تھیں۔ ان
کی نگاہیں دونوں پر جمی رہ گئیں۔ ریان اور
قارس۔ قارس اور ریان۔ خواب سا منظر تھا۔ گمان
میں بھی نہ تھا وہ انہیں ایک ساتھ اس طرح بھی دیکھ
پائیں گی۔ اتنے قریب اور اس طرح سے اس نعمت پر
وہ اپنے رب کا جتنا شکر ادا کر رہی تھیں۔

جنت نے ایک طویل گہری سانس لی۔ ذرا
دیکھو تو پتہ چلے گا کہ دوستی ہو گئی، مگر وہ پھر بھی ولن
رہی۔

پھر ریان کو ہی جنت کا خیال آیا تو اب کے جو
تکذبات اس نے دیا تو اسے لے کر اس کے پاس چلا
گیا۔ تمنا سا ہاتھ اوپر کر کے دیا۔ کہ لو آپ بھی کھاؤ۔
جنت کا دل محبت سے بھر گیا۔
"ریان! آپ اتنے پیارے کیوں ہو ہاں؟"
جھک کر اس کے گال کھینچے۔ پھر منہ کھول کر اس کے
ہاتھوں سے کھالیا۔ غالباً وہ گھر میں اس کے ہاتھوں
سے کئی بار چیزیں لے کر کھا چکی تھی۔ نظر آ رہا تھا وہ
ان چند دلوں میں اس کے ساتھ کتنا مالوس ہو چکا تھا۔
قارس کے سوا بال پر کال آئی تو وہ اٹھ کر باہر چلا
گیا۔ جیلہ داؤد کی مسکراتی منظر نگاہیں دور تک اس پر
جمی رہی تھیں۔

☆☆☆

اس نے جنت کو اس تمام عرصے میں پہلی بار
اسلام آباد میں دیکھا تھا۔ وہ زنیہ آیا کی طرف آئی
تھی۔ چیک اپ کے لیے اسے ہاسٹل جانا پڑا تھا۔
بیچ پر برحان کے ہمراہ بیٹھے۔ اپنی باری کا انتظار
کرتے اس کی نظر جو بھی اٹھی وہیں ٹھہر گئی۔ جنت
کمال دروازہ کھول کر باہر نکل رہی تھی۔ اس کے
سر آپے پر نظر ڈالتی وہ پتھر اٹھاتی تھی۔

گمان تھا وہ اسے بہت دکھ اور تکلیف میں
دیکھے گی۔ در بدر دور دور کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔

بے عزتی اور دھکار سہتے ہوئے۔ مگر جو آنکھیں دیکھ
رہی تھیں۔ وہ منظر کچھ اور ہی تھا۔ اس نے سنا تھا اس
کی شادی کسی امیر شخص سے ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی
سنا تھا وہ اپنے گھر سے نہیں بھاگ گئی تھی۔ یہ بھی کہ
اس کا کردار کتنا برا ہے۔ اس کی سزا میں کتنی مختصر۔
اس کا عذاب کتنا ادھورا ہے۔

ماہین عبد الکریم جنت کمال کو دیکھ رہی تھی۔
برحان واصف کی ساکت نگاہیں بھی اس پر ٹھہر گئی
تھیں۔

کتنا مطمئن تھا اس کا چہرہ۔ اس کی مسکراہٹ
کتنی گہری تھی۔ اسے اپنے کیے پر پچھتاوا تھا نہ کوئی
الٹوس۔

صدہ تو اس بات کا تھا کہ وہ پر یکھٹ تھی۔
وہ بانجھ لڑکی جس پر دنیا کی ہر محرومی کا اختتام
سمجھا جاتا رہا۔ وہی لڑکی ماں بننے والی تھی۔ ماہین کا
پورا وجود شعلہ ہو رہا تھا۔ کیوں؟؟ کیسے؟؟

بیگ میں پیپر ز رکھتے جنت نے سر اٹھایا تو اپنی
جگہ ختم گئی۔ اس کی نظر ساکت ہوئی۔ اس کے چہرے
کا ہر رنگ مفقود ہو گیا۔ انسانی جو اس کے انتظار میں
بیٹھی تھی فوراً اٹھ کر پاس آ گئی۔

برحان واصف۔ اور ماہین عبد الکریم۔ جن دو
چہروں کو وہ بھی نہیں دیکھتا چاہتی تھی۔ وہی دو چہرے
اس کے سامنے تھے۔ وہ برحان کی آنکھوں میں اپنے
لیے نفرت ابھی بھی دیکھ سکتی تھی۔ وہ لڑکی جس نے
اسے چیٹ کیا۔ دھوکا دیا۔ بچے کو مارنے کی کوشش
کی۔ وہ لڑکی۔ اس کا چہرہ۔

"آئی! آئی! انسانی نے اس کا ہاتھ ہلایا تو وہ جیسے
ہوش میں آئی۔ اپنی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے
بہت ضبط اور ہمت سے۔ وہ برابر سے گزر کر باہر نکل
گئی۔ ماہین نے گردن موڑ کر اسے نظروں سے
اوجھل ہو جانے تک دیکھا تھا۔ برحان کے تاثرات
سخت پتھر لیے سے ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں جو
حکایت تھی۔ وہ ماہین کی سمجھ سے باہر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ماہینہ شعلہ نومبر 2022 191

جنت کمال کی سائیں بھاری ہو رہی تھیں۔
اس نے گاڑی میں بیٹھنے تک اپنی چال کو مضبوط۔
اپنے کندھوں کو سیدھا کیے رکھا تھا۔ اب جب وہ
نظروں سے اوجھل تھی تو ہر پردہ اٹھ گیا تھا۔ ہر کیفیت
اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔ وہ خوف
اور دہشت کا تاثر نہیں تھا۔ غم اور غصے کی آگ تھی جو
اسے اندر ہی اندر جلا رہی تھی۔ اذیتوں کا احساس تھا
جو ماضی کی رنج یادوں میں دھکیل رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے اس طرح کیوں آگئے۔ اس
نے کیوں دیکھ لیا انہیں۔ کیوں منجید ہو گئی۔ کیوں کچھ
کہہ نہ سکی۔ جو غصہ تھا۔ جو نفرت تھی ان کے لیے۔
چند نظروں کا اظہار ہی سہی۔ کچھ تو کرتی وہ۔ وہ اندر
ہی اندر سے جیسے خود کو نوچ رہی تھی۔ اس کی زندگی
بر باد ہوئی۔ اس کی ماں دنیا سے چلی گئی۔ بدنامی الگ
حصے میں آئی۔ اور وہ۔ وہ ان دونوں سے کچھ کہہ ہی نہ
سکی۔ اسے برحان کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت
اور حقارت کا تاثر ابھی بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ نگاہیں
وجود کو چھلٹی کر رہی تھیں۔

ابھی تک اپنے ہی زعم میں تھے وہ۔ ابھی تک
کچھ بھی تو نہیں بگڑا تھا ان کا۔ کوئی حساب نہیں ہوا
تھا۔ کوئی احساس نہیں ہوا تھا انہیں۔ ابھی بھی وہ
مظلوم۔ ایک دہی ظالم تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں آپ؟" اقصیٰ کو پریشانی
ہوئی۔ ڈاکٹر کے آفس سے نکلے وقت تو وہ بالکل
ٹھیک تھی۔ اچانک کیا ہوا۔ وہ دو لوگ کون تھے جنہیں
دیکھتے ہی اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی۔

وہ نمالاب بے دردی سے کاٹی کھڑکی کی
جانب رخ کر گئی تھی۔

گھر پہنچ کر بھی وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ سبز
شیرازی اس کے روئے کا بدلاؤ محسوس کر لیں۔ کھانا
بھی ٹھیک سے نہ کھا پائی۔ لان میں جائے کا دور چل
رہا تھا تو وہ ان کے پاس غافل سی بیٹھی رہی۔ کچھ
باتوں کا جواب دیتی۔ کچھ پر خالی الذہنی کے عالم میں
چومک پڑتی۔ وہ بچن میں گئی اس سے گھاس ٹوٹ گیا۔

چوہے پر دودھ چڑھا رکھا تھا اٹل کر پھیل گیا۔ وہ
واش بیسن کاٹل بند کرنا بھول گئی۔ وہ جو روز قاری کی
اسٹڈی میں جانے۔ اس سے بات کرنے کی کوشش
کر رہی تھی۔ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

وہ سیر حیاں اتر کر نیچے آیا تو اس نے جنت کو
سنگ ایریا میں کارخ کے بیٹھا ہوا دیکھا۔ چہرہ بے
تاثر سا تھا۔ نگاہیں کسی نقطے پر جمی ہوئیں۔ ساکت
اور ویرانی لیے ہوئے۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ آہستہ سے قدم
اٹھاتا اس کے پاس آ رہا۔ وہ جو قدموں کی آہٹ پر
چومک پڑتی تھی، متوجہ نہ ہوئی۔

اس نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ایک دم سے
بوکھلا کر گردن موڑی۔ قاری اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس
کی آنکھوں میں جانے کب سے ٹھہرے ہوئے آنسو
گالوں پر پھسل گئے تھے۔ اس نے فوراً سے آنسو
صاف کر لیے۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"ایسے ہی۔ کچھ بے چینی ہو رہی تھی تو۔"
آواز بھگی ہوئی تھی۔ انگلیاں مسل کر گھبراہٹ پر قابو
پانے کی کوشش کی۔ قاری نے کلائی موڑ کر وقت
دیکھا۔ عموماً وہ اس وقت تک سو جاتی تھی۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔
"تم آج چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔" از
ایوری تھیک الرائنٹ؟ "اسے احساس ہی نہ ہوا۔
وہ جواتنے دنوں سے خاموش تھا وہ اب خود سے بول
رہا تھا۔ آج وہ اسے اپنی رپورٹس بھیجنا بھول گئی تھی۔
اثبات میں سر کو جنبش دی۔ سب ٹھیک تھا۔ لیکن وہ
ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

کھوئی ہوئی بھگی ہوئی سی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ تمام کراہیوں سے
اٹھ گئی۔ لب بھینچ کر خود پر ضبط کرتی ہوئی۔ پلکیں جھپکا
جھپکا کر آنسوؤں کو روکتی ہوئی۔ دل چاہا۔ لب
کھولے۔ اور بتا دے وہ بہت تکلیف میں ہے۔

اسے بملگ رہا ہے۔ اسے غصہ آرہا ہے۔ اسے وحشت ہو رہی ہے۔ اسے رونا آرہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ کمرے میں آگئی تھی۔ لفافہ ہٹاتے، ہنگیدرست کرتے وہ آرام سے لیٹ گئی۔
"کچھ چاہیے؟"

اس نے گئی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی طرف کا لیمپ آف کر دیا۔
وہی منظر۔ وہی نگاہیں۔ وہی تھپڑ۔ طلاق۔ اور آوازیں۔
اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆

زنیرہ آپا کے گھر میں وہ بیڈ پر بیٹھی لب کاٹ رہی تھی۔ برہان لان میں اہل رہا تھا۔ وہ اندر نہیں آیا تھا۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ اس کا موڈ بری طرح ہے آف تھا اور وہ اس سے کوئی بھی بات کر نہیں پا رہی تھی۔

جنت کمال!! جس کے ساتھ ایک لڑکی اور گارڈ تھا۔ جو شان دار گاڑی میں بیٹھ کر ہسپتال سے روانہ ہوئی تھی۔ جس کے گھر میں ایک خوشخبری آنے والی تھی۔ جس لڑکی کو برباد کر کے اس نے گھر سے نکلوا دیا تھا وہ اسے مکمل طور پر آباد نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ بے بسی سے لب کاٹتے وہ اندر سے جل رہی تھی۔ بھسم ہو رہی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی وہ اپنی آنکھوں سے ایسا کوئی منظر دیکھے گی۔ جسے ادھورا سمجھا تھا۔ اسے مکمل دیکھے گی۔

حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اٹھ کر باہر زنیرہ آپا کے پاس جا بیٹھی۔ برہان گاڑی نکال کر کہیں چلا گیا تھا۔

"ہاں نہیں برہان کو کیا ہوا ہے۔ مجھے اس کا موڈ ٹھیک نہیں لگ رہا!" زنیرہ آپا بیٹی کو سلا رہی تھیں۔ مدھم آواز میں بولیں۔
"جنت کو جو دیکھ لیا۔"

بیٹی کی پشت تھپکتے زنیرہ آپا کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ حیرت سے ماہین کو دیکھا۔ "جنت کو؟ کہاں

دیکھ لیا تم لوگوں نے؟"
"ہسپتال آئی ہوئی تھی وہ آپا۔ اللہ کی پناہ وہ پہچانی ہی نہیں گئی۔ اتنی آزاد خیال اور ماڈرن۔ اتنے چست کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے۔" اس کی زبان اب نہ ہر اگل رہی تھی۔ جو ہاتھ پہلے کرتی رہی تھی۔ اب پھر سے کر رہی تھی۔ وہ آگ جو اندر جل رہی تھی۔ وہ ایسے ہی کم ہو سکتی تھی۔
"استغفر اللہ! مجھے تو دیکھ کر شرم آئی۔"
زنیرہ آپا اپنی بیٹی کو چھوڑے اس کی طرف گھوم گئیں۔

"اور برہان۔ انہیں تو غصہ آ گیا!"
"تو اس لیے موڈ آف ہے اس کا!" آپا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "اللہ کا شکر ہے جان چھوٹ گئی اس بد کردار لڑکی سے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی چکر چلاتی رہی۔ اب آزاد ہو کر تو گل کھلانے ہی ہیں اس نے۔" آپا کے لہجے میں حقارت تھی۔

"سچ میں آپا رشتہ ختم ہو گیا اس کا؟" کھوجے ہوئے سوال کیا۔ ایک خبر جو پہلے ملی تھی اس کی تصدیق ضروری تھی۔ "اور نہیں تو کیا۔ گھر سے بھاگ گئی تھی یہ۔ اس کا شوہر ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی لیے وہ لاہور گیا تھا۔"

آپا کو بس اتنا ہی پتا تھا۔ جنت کے بارے میں حریف انہیں کوئی خبر نہ تھی۔ اڑنی اڑنی خبر بس یہ تھی کہ اس کی دوسری بار بھی طلاق ہو چکی۔

وہ لب بچنے کمرے میں آگئی۔ اپنی کزنز کو فون گھما ڈالا۔ وہ ایک بار پھر اس کے کردار پر آگئی تھی۔ کچھڑا اچھا ل رہی تھی۔ جن باتوں کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ انہیں حقیقت بنا کر پھیلا رہی تھی۔ جنت کمال۔ ایک آزاد خیال۔ ایک بد کردار لڑکی۔ اس کا لباس کتنا برا تھا۔ وہ مردوں میں گھوم رہی تھی۔ اس کا فیشن۔ اس کے مینے کپڑے۔ اس کی ادا میں جو وہ لوگوں کو دکھا رہی تھی۔ زبان سے جو کہہ سکتی تھی کہہ دیا۔ مگر نہ آگ کم ہوئی۔ نہ جلتی ختم ہوئی۔ نہ ذہن سے بوجھ سرکا۔ نہ دل میں سکون اتر۔ جو خوشی

واضح نہیں ہو رہی تھی۔ مایہن عبد الکریم کو اس لیے اپنا آپ فنا ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا

"برہان!! اس نے ہم سب کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ اسپیشلی آپ کے ساتھ۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ کس چیز کی کمی ہونے دی آپ نے۔ اور اس نے۔ اس بھر بھی آپ کو چیٹ کیا۔ آٹم سو سو ری آپ کو ان سب سے گزرتا پڑا۔" لہجہ کو نرم کر لی ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ مگر دل دھڑکے جا رہا تھا۔ سانسیں تیز چل رہی تھیں۔ برہان واصل کا یہ رویہ اسے ہمیشہ میں ڈال رہا تھا۔ جس لڑکی کا وہ نام تک نہیں سنتا چاہتا تھا۔ اس کا ذکر کیسے کر رہا تھا۔ طلاق کے بعد جنت کمال کی صرف ایک جھلک۔ کہاں لے گئی تھی اسے؟

"آپ نے کتنا خیال رکھا اس کا۔ اور اس نے آپ کے بچے کو ہرٹ کرنے کی کوشش کی۔ مجھے تکلیف پہنچائی۔" آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

"اسی بات کا تو دکھ ہے مجھے! لب بھینچ کر بولا۔" اس نے ہمارے رشتے کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ جتنی محبت میں نے اسے دی۔ اس کے باوجود۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔!"

جنت کمال اور اس کی خوش گواری زندگی۔ وہ مسکراہٹ جو ہونٹوں پر بھی اور اس پر نظر پڑتے ہی اڑ چھو ہوتی تھی۔ وہ آنکھیں جن کا نرم تاثر اسے دیکھ کر سخت ہوا تھا۔ وہ جنت کمال جو اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے بنا۔ کتنی خوش، کتنی مکمل نظر آ رہی تھی۔ جانے وہ کیسا احساس تھا جو ایک دم سے حاوی ہوا تھا۔ سلگتا ہوا۔ انگاروں جیسا۔ رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا۔ آنکھوں میں لہو بھرتا ہوا۔

مایہن تو پھر بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ مگر وہ آنکھوں میں شعلے لیے رات گئے تک جاگتا رہا تھا۔

☆☆☆

ناشتے کے بعد وہ کمرے میں تھی۔ ریان پاس

جنت کی طلاق پر ہوئی تھی۔ وہ خوش محسوس کرنے سے قاصر رہی۔ بس نہیں چل رہا تھا وہ ایک بار پھر اسے سب کی نظروں سے گرا دے۔ ایک بار پھر وہ کہانی دہرا دے۔ اب کے دل چاہا وہ اپنے دوسرے شوہر کی نظروں سے گرے۔ اسے اب کئی بار بچ بچ میں طلاق ہو جائے۔ وہ بات جو افواہ ہے۔ وہ حقیقت بن جائے۔ اس کے متعفن خیالات کا اثر چہرے پر نظر آنے لگا۔ اس کی شکل عجیب ہیئت سی اختیار کرنے لگی۔

جنت خوش کیوں ہے؟؟ وہ مطمئن کیوں ہے؟؟ اس کے پاس تو اب برہان بھی نہیں ہے۔ دروازہ کھول کر برہان اندر آیا تو وہ بھی جیسے خیالات کی دنیا سے نکل آئی۔ سونے کی کوشش کی تو نیند نہ آئی۔ اٹھ کر بیٹھی تو معلوم ہوا برہان بھی جاگ رہا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کیا سوچ سکتا ہوں؟"

اس کے لب بھینچ گئے۔

"اس فضول لڑکی کی وجہ سے اپنا سکون کیوں

برہا کر رہے ہیں؟"

"اس فضول لڑکی کے ساتھ میں نے پانچ سال

گزارے ہیں مایہن۔ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کر کے۔ مجھے اس طرح سے اذیت دے کر وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ کوئی احساس ہی نہیں اسے۔"

مایہن کی آنکھوں میں تعجب سا اثر آیا۔ کیا وہ اسے شرمندہ دیکھنے کا خواہش مند تھا؟؟ اسے اپنے آس پاس ایک دم سے دھماکے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کیا وہ چاہ رہا تھا جنت کمال اس سے معافی مانگے اپنی غلطیوں کا ادراک کرے؟ وہ متوحش لگا ہوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

"شی از پر یکھٹ! یہ سب۔ کیسے۔" اس کا

دماغ جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ اسے غصے کی آگ میں دیکھ سکتی تھی۔ مگر اس آگ میں کچھ اور بھی تھا۔ کوئی ایسا جذبہ اور احساس۔ کوئی ایسی کیفیت۔ جو

پر سینے پر بازو باندھے۔
 "مطلب ہر بندہ واقف تھے شاید۔ وہ جنت
 آپنی کو دکھ رہے تھے اور جنت آپنی انہیں دیکھ رہی
 تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ تو بس پتھر ہی ہو گئیں۔
 پھر سارا وقت گاڑی میں بھی بالکل چپ رہی ہیں۔
 حالانکہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا اقصیٰ! واپسی پر آپس
 کریم بھی کھا میں گے۔" ایک ہی سانس میں سب
 بتادیا۔

فارس نے اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔ ساتھ
 ہی ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ اسے اس کے کالج ڈراپ کر
 دے۔ اتنی بڑی گاڑی میں کالج جانے کے تصور سے
 خوش ہوئی وہ اٹھلائی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دوستوں
 کے علاوہ جو بھی لڑکی اسے اس گاڑی سے لگا دیکھے
 گی۔ جل کر سواہی ہو جائیں گی۔
 آپس پہنچ کر فارس نے ڈاکٹر شازیہ کا نمبر
 ملا یا۔ وہ مسز شیرازی کی دوست تھیں۔ سلام دعا کے
 بعد وہ بے حد سنجیدگی سے اصل مددے پر آ گیا۔
 "آپ سے ایک ہیلپ چاہیے گی۔"

"جی بیٹا کیا ہیلپ چاہیے؟"
 وہ جنت کے بعد چیک اپ کی لیے آنے والی
 خواتین کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ان کے نام
 حانا چاہ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی اسٹنٹ سے لسٹ
 منگوائی۔ چند ایک ناموں کے بعد ہی ماہین عبدالمکریم
 کا نام آ گیا۔ مسز برحان و امف۔

وہ موبائل فون کان سے لگائے اپنی جگہ بیٹھا رہا
 گیا۔ "آپ کا بہت شکریہ" اس نے کال کاٹ
 دی۔ آنکھوں میں عجیب سا تاثر اتر آیا۔
 کیا اس کی یہ حالت اس لیے ہے کہ اس نے
 اپنے سابقہ شوہر کو دیکھ لیا ہے؟؟ اپنی آفس چیئر پر
 بیٹھے فارس وجدان کی مٹھیاں تلخی سے جھنجھکی گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ کچھ دیر تک مسز
 شیرازی کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ پھر لان میں ٹھہرنے لگی
 تھی۔ اس کے بعد اس نے لائبریری کا رخ کیا

میں بیٹھا ہوا تھا۔ فارس اپنے لے سائے مڑائی لی
 ٹاٹ باندھ رہا تھا۔ جو میگزین ہاتھ میں تھا۔ اس کا
 صفحہ گول گول کھانے لگی۔ کلائی پر گھڑی پہنتے ہوئے
 فارس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ مکمل طور پر اتر
 ہوا تھا۔ وہ پتا نہیں کن سوچوں میں گم تھی۔
 وہ سر جھٹک کر باہر چلا گیا۔ ملازم اس کا
 بریف کیس گاڑی میں رکھ رہا تھا۔

اقصیٰ مین گیسٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ رک
 گئی۔ مودب سی۔ نہیں ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ (بغیر کسی
 وجہ کے)۔ اس کی دین آچکی تھی۔ ڈرائیور ہارن
 دینے جا رہا تھا۔ "میں جاؤں صاحب۔ دین آ
 گئی!"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلایا تو
 ڈرائیور اس کا اشارہ سمجھتے دین کو لے گیا۔
 "اب کیا میں کالج پیدل جاؤں گی؟" وہ
 بوکھلائی۔ اس کی سہیلیوں نے دین سے گردن نکال
 نکال کر اسے دیکھا کہ وہاں کس کے ساتھ کھڑی ہے
 اور کیا کر رہی ہے۔

"ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں وہ ڈراپ کر دے
 گا نہیں!" اقصیٰ کی جان میں جان آئی۔
 "کل تم اپنی آپنی کے ساتھ ہاسپٹل گئی
 تھیں؟"

"جی صاحب!!"

"وہاں کچھ ہوا تھا کیا؟؟"

"نہیں تو۔ بس سیر میوں پر ایک بڑے بابا جی
 بے ہوش ہو گئے تھے۔ تو جو بڑی اماں ان کے ساتھ
 تھیں۔ انہوں نے شور مچا دیا۔"

"میں اس کی بات نہیں کر رہا۔" ضبط کر کے
 اسے روکا۔ "تمہاری آپنی سے کوئی ملا تھا کیا؟؟" اس
 نے اپنا سوال مزید واضح کیا۔

اقصیٰ نے رک کر آسمان کی طرف دیکھتے
 ہوئے اپنا ذہن یہاں وہاں دوڑایا۔

"اوہ ہاں!! یاد آیا۔ ایک میاں بیوی تھے۔"
 ایک میاں بیوی افسانے نے برداشت کی انتہا

تھا۔ کتابوں کی سیٹک بدل ڈالی تھی۔ شاور لے کر کچھ دیر تک آرام کیا اور پھر جب ابھی تو دماغ لپکا تھا۔ وہ ہر طرح کے مٹی خیالات کو بار بار جھٹکتی اپنی توجہ واپس اپنی حالیہ زندگی کی طرف لارہی تھی۔ اسے فارس کی ناراضی کا خیال آیا۔ آہستہ سے مسکرائی۔ نئے سرے سے کچھ سوچا۔ یاد آیا گفت لپٹا تھا۔ کارڈ۔ پھر معافی۔ شاید یہ دوری اس لیے بھی تھی کہ اس نے ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ جذبات کا اظہار کیا تھا۔ نہ احساسات۔ اس نے سوچا۔ اور سوچ کر تہیہ کر لیا۔ سبز شیرازی سے اجازت لے کر مال چلی گئی۔ آج آرام اور تسلی سے بات کرے گی۔ اس نے تاحال گلہ شکوہ نہیں کیا۔ تو وہ اسے موقع دے گی۔ اس کی سننے کی۔ اور اپنی سنائے گی بھی۔ وہ ریان کے لیے شاپنگ کر رہی تھی۔ کپڑے، کھلونے اٹھا کر دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ چند ایک تصویریں سبز شیرازی کو بھیج کر ان سے رائے لی۔ اور تب ہی فارس کی کال آگئی تھی۔

"اف!" گڑبڑا کر فوراً سے کال ریسیو کی۔

"ہیلو؟"

"کہاں ہو تم؟"

"میں؟۔ وہ میں شاپنگ کے لیے آئی ہوں!"

"کس فلور پر ہو؟" گویا جانتا تھا ڈریوار

اسے کہاں چھوڑ کر گیا تھا۔

اس نے کان سے ہٹا کر موبائل اسکرین کو اچھپے سے دیکھا۔ کیا وہ یہاں آ گیا ہے؟ فوراً سے اپنی نوکیشن بتائی۔ پھر ایسے ہی ٹپکتے ہوئے کپڑے دیکھنے لگی۔ دل شدت سے دھڑکے جارہا تھا۔ ڈانٹ الگ سے پڑے گی کہ وہ بتائے بغیر کیوں آگئی۔

"بہت خوش نظر آ رہی ہو تم؟؟ آنا بھی چاہیے۔ کہ احساس شرمندگی نام کی کوئی چیز تم میں ہے بھی تو نہیں۔"

اس کے ہاتھ میں ایک چدرہ ماہ کے بچے کا ڈریس تھا۔ چھوٹ گیا۔ وہ برحان واصف کو اتنے قریب سے دیکھنے پر، اس کی آواز سننے، اس کی

آنکھوں میں اترنے پر بے طرح سے بوکھلائی تھی۔ وہ قدم پیچھے ہوتے اس نے کپکپاتے ہاتھوں کو بھیج لیا تھا۔ وہ آنکھوں میں غصے کی سرخی لیے لب بھیج کر اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ضبط کے کسی کڑے امتحان سے گزر رہا ہو۔

"میں نے تمہیں کس چیز کی کمی ہونے دی اور تم نے۔ تم نے کیا کیا؟؟"

آنکھوں میں وحشت لیے، بھاری سانسوں کے ساتھ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی تھی۔ مخاطب ہونے کی۔ راستہ روکنے اور بات کرنے کی بھی۔ مڑ کر جانے لگی تو اس نے راستہ روک لیا۔ "بات کر رہا ہوں میں تم سے۔"

"برحان!" شاپنگ بیگ ہاتھ میں لیے مابین فوراً سے آگئی تھی۔ جلن کی آگ میں۔

"آپ بھی کس لڑکی کے منہ لگ رہے ہیں۔ جس کو اپنی ماں کی عزت کا لحاظ نہیں تھا۔ اس سے آپ بات ہی کیوں کر رہے ہیں۔"

جنت کی تر آنکھوں میں مابین کا عکس ابھرا۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا اندر سر اٹھاتا غصے کا، نفرت کا غم کا طوفان محض آنکھوں اور چہرے پر اٹھتا آ رہا تھا۔ مگر وہ ساکت تھی۔ وہ خاموش تھی۔ وہ زور سے چیختا جا رہی تھی۔ مگر چیخا نہیں جا رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر بولا نہیں جا رہا تھا۔

برحان اور مابین۔

"برحان یہاں سے چلیں!!"

"تمہاری محبت کے سارے دعوے جھوٹے تھے۔ تم معافی مانگ سکتی تھیں مجھ سے۔ تم کہہ سکتی تھیں غلطی ہو گئی۔ لیکن تم نے کیا کیا؟؟ اس لائف اسٹائل کے لیے۔ وہ سارے تماشے کیسے تم نے۔ اپنی ماں کا بھی خیال نہیں کیا۔ اپنے نانا کی تربیت۔"

برحان واصف۔ وہ کرکیر رہا تھا۔ کہہ کیا رہا تھا۔

بات ماں کی تھی۔ ذکر نانا کا تھا۔ ان کی تربیت

کا تھا۔ اس کے کردار کا۔ گناہوں کا۔ غلطیوں کا تھا۔
اس نے گھر، شہر، خاندان۔ سب چھوڑ دیا۔ مگر
وہ لوگ اپنی زبانوں سے اس کا ذکر نہ چھوڑ سکے۔ وہ
فحش۔ جس کی صورت وہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔
جس کی آواز وہ بھی نہیں سنتا چاہتی تھی۔ جس کا تصور
ہمیشہ اس پر پہاڑ بن کر ٹوٹا تھا۔ جس کی محبت کا خیال
وحشت ناک اندھیروں میں ڈبوتا تھا۔ وہی
فحش۔ اس کے سامنے کھڑا بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ اور
وہ کھڑی تھی۔ وہ اسے کہنے دے رہی تھی۔ بیوی بن کر
بھی اس نے سب خاموشی سے سنا تھا۔ بیوی نہ ہو کر
وہ ایک بار پھر وہی کر رہی تھی۔ اس کا طریقہ پھر سے
ایک سا ہو رہا تھا۔ وہی خوف۔ وہی دہشت۔ وہی سر
جھکا کر۔ سب تسلیم کر لینے کی عادت۔ وہی عادت
پھر سے سراٹھار رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر قدموں میں جا
رہی تھی۔

قارس وجدان کی نگاہ سے دور اس پر پڑی تھی۔
اس کے ساتھ کھڑے اس شخص پر بھی۔ جسے وہ دیکھ
رہی تھی۔ موبائل جیب میں رکھتے وہ غلٹ میں قدم
اٹھاتا آگے بڑھا تھا۔

"تم سے محبت۔ اور شادی۔ میری زندگی کی
سب سے بڑی غلطی تھی!"

ماں۔ اور نانا۔ اور تربیت۔ بات کردار کی تھی۔
اس الزام کی بھی جو اس پر لگایا گیا تھا۔ پورا مکمل
ماہین عبدالکریم کا سجایا ہوا تھا۔ پوری پلاننگ اس کی
تھی۔ اس کے آس پاس لوگوں کی آمد رفت،
ملبوسات کی قیمتیں، قیمتی خواتین۔ کاؤنٹر پر
کیشیئر۔ مشین کی ٹائپنگ۔ ٹائلز پر کھنٹی ٹرائیز کا شور
سب مدھم اور مانند پڑنے لگا۔ ہر ایک شے تاریکی کا
حصہ ہو گئی۔ ماہین کا وجود بھی عدم ہو گیا۔ روشنی اگر
کہیں تھی۔ تو وہ برحان واصف کے وجود پر پڑ رہی
تھی۔ ساڑھے پانچ سالوں کا اعتماد۔ محض چند مہینوں
میں خاک ہوا تھا۔ ساڑھے پانچ سالوں تک جو
کردار زینت بنا رہا تھا۔ وہی کردار۔ برحان واصف
کی آنکھوں میں دھول مٹی ہوا تھا۔ کوئی شے سالوں

سے مضبوط رہنے کے بعد ایک ہلکی سی ضرب سے ٹوٹی
تھی۔ اور وہ آج بھی وہیں تھا۔ اسی مقام پر۔ اسی
گمان میں۔ اسی خوش نہی اور خیال میں۔ کہ مجرم وہی
تھی۔ ہر سزا۔ ہر عذاب۔ ہر مصیبت کی حق دار بھی
وہی۔

وہ اس کے گھر میں تھی۔ وہ اس پر چیخ رہا تھا۔
وہ چلا رہا تھا۔ وہ خطوں کو اس کے منہ پر مار رہا تھا۔ وہ
پھولوں کے کچے اور کارڈ کو پھاڑ کر اس سے استفسار کر
رہا تھا۔

وہ جمود سا ایک جو طاری ہوا تھا۔ اس جمود پر
ایک دراڑ سی پڑی۔ اس نے بہت عرصے تک سب
خاموشی سے سہا تھا۔ اب نہیں سہہ سکی تھی۔ اس نے
ایک دم سے قوت پکڑی۔ اور پورے زور سے
برحان واصف کے گال پر پھنجر جڑ دیا۔ ماہین نے ایک
دم سے منہ پر ہاتھ رکھا۔

بھرے خاندان میں رسوا کر کے طلاق دی تھی
جس نے۔ اس نے گردن موڑ کر صدمے سے گنگ
اس کی طرف دیکھا۔

غلٹ میں قدم اٹھا کر اس کی طرف بڑھتے
قارس وجدان کے قدموں کی حرکت ختم ہو گئی۔ مدھم
سے شور میں پھنکر کی آواز تو کہیں دب گئی تھی مگر پاس
میں کھڑے چند ایک لوگ ان کی طرف متوجہ ضرور
ہوئے تھے۔

جنت نے اپنا کیک پانا ہاتھ نیچے کر لیا۔ اس کی
سانسیں چمکی ہوئی تھیں۔ اس کی رگوں میں
انکارے دوڑ رہے تھے۔ اس کے آنسو جانے کسے
پلکوں کی یاڑ پر اٹکے ہوئے غم پر ٹھہرے رہ گئے
تھے۔ وہ جتنی مضبوطی دکھا سکتی تھی۔ اس نے دکھا
دی۔

اس کا پورا وجود طوفانوں کی زد میں لگ رہا تھا
مگر وہ کھڑی تھی۔ وہ ڈٹ کر اور سراٹھائے اس
انسان کے سامنے کھڑی تھی جو اس کی زندگی کی تباہی
کا سبب بنا تھا۔ پہلا مرد۔ زندگی میں آنے والا۔ پہلا
رشتہ۔ پہلی محبت۔ پہلا گھر۔ پہلا شوہر۔ وہ اسے دیکھ

رہا تھا۔ ماہین اس کی جرات پر ساکت تھی۔
 "تمہاری یہ ہمت۔" ماہین مستعل ہوئی۔

جنت کمال نے کچھ نہ کہا۔ کوئی گلہ شکوہ۔ کچھ بھی نہیں۔ ہمت پکڑ کر رخ بدلا اور پھر فارس پر نظر پڑتے ہی رک گئی۔

وہ آنسو جو برحان اور ماہین کے سامنے آنکھوں میں ٹھہرے رہے تھے۔ وہ اب اس کی گالوں پر پھسل گئے تھے۔ وہ سسکیاں جو سینے میں دبی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔ وہ اس کی جنگ تھی۔ اسے لڑنے دے دی گئی۔

اس نے فارس کی طرف ایک قدم اٹھایا۔ پھر دوسرا۔ اور رک گئی۔ اس کی سسکیاں اب جھکیوں میں بدل چکی تھیں۔ سر جھک گیا تھا۔ مزید آگے بڑھنے کی اب ہمت نہیں رہی تھی۔

بقیہ فاصلہ فارس و جدان کا تھا۔ اس نے طے کر لیا۔ اس کا ہاتھ گرفت میں لیتے ہوئے برحان واصف کی طرف قدم اٹھائے۔

"آئندہ میری بیوی کا راستہ روکنے اور اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا!" اس نے انتہائی درشت لہجے میں اس کے قریب رک کر یوارن کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔ برحان واصف کا وجود جنت کمال کے آس پاس اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں ہوا تھا۔

یہی وقت ہے۔ ماہین کو لگا۔ یہی لمحہ ہے۔ وہ اپنا کام دکھا سکتی ہے۔ وہ جنت کمال سے اپنے شوہر کی اس بے عزتی کا بدلہ لے سکتی ہے۔ وہ ایک بار پھر اس کی شادی شدہ زندگی کو آگ لگا سکتی ہے۔

"بہت شوق ہے آپ کی بیوی کو شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی شادی شدہ مردوں پر ڈورے ڈالنے کا۔ ہمارے خاندان کی ہے۔ تو جانتے ہیں کس کردار کی ہے۔ آپ پتا نہیں اس کے چکروں میں کیسے آگئے۔" اس نے زہر خند لہجے میں انتہائی حقارت سے جنت کا ذکر کیا۔

و جاہت کا پیکر۔ وہ شان دار سامرد جنت کمال کے پہلو میں کھڑا اسے حسد کی آگ میں جلا رہا تھا۔
 "آر یو ٹاکنگ اپاؤٹ مائی وائف؟" (کیا آپ میری بیوی کے بارے میں بات کر رہی ہیں؟)
 وہ اس کی طرف مڑا۔ ماہین کو لگا تھا وہ اس شخص کو ایک دم سے غصے اور اشتعال میں آتا ہوا دیکھے گی۔ اس کی آنکھوں میں شک ہوگا۔ بدگمانی کے تاثرات ابھریں گے۔ مگر وہ مرد اس کی آنکھوں میں دیکھتا محل سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا آپ بھی انہی لوگوں میں سے ہیں جن سے یہ شادی سے پہلے رابطے میں تھی؟" مستعل کر دوسرا نقطہ جوڑا۔ "اس کے تو کافی فیئرز تھے۔ برحان نے اس لیے نہیں اسے طلاق دے دی تھی۔ اور اس نے تو ہمارا بچہ تک ضائع کرنے کی کوشش کی۔ شاید آپ کو یہ سب کسی نے بتایا ہی نہیں۔"

جنت کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ فارس کے پیچھے کھڑے اس نے آنکھیں میچ کر خود پر ضبط کا پہرہ بٹھایا تھا۔ ماہین کو جواب دینے کے بجائے اس نے برحان کو دیکھا۔

"کیا آپ کی بیوی کو ہمیشہ سے جنت پر کچھ اچھالنے کا شوق تھا یا آپ سے شادی کے بعد ہوا ہے؟"

وہ سوال۔ ماہین پر کسی نکوار کے وار سے کم نہیں تھا۔ برحان واصف کی نگاہیں اس پر جمی رہ گئیں۔
 "کیونکہ میں نے اپنی بیوی کے کردار میں آج تک کوئی جھول نہیں دیکھا!"

ماہین پھٹی پھٹی نگاہوں سے فارس کو دیکھ رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا اس طرح اس کے شوہر کے سامنے منہ کھولنا اسے اتنا بھاری پڑ جائے گا۔

ایک سخت اور سرد پڑتی نگاہ برحان واصف پر ڈالتے ہوئے وہ جنت کو بازو کے حصار میں لیتا جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

برحان واصف کی نگاہیں فارس و جدان کی

بشت پر جہی رہ گئی تھیں۔
وہ شخص اس لڑکی کو اپنائے ہوئے تھا جو اس کے لیے بدکردار ہو چکی تھی۔
جسے اس نے چھوڑ دیا۔ اسے کسی اور نے اپنا لیا تھا۔ جسے اس کے گھر میں کچھ نہ ملا۔ اسے کسی اور کے گھر میں آباد کر دیا گیا تھا۔
وہ لڑکی۔
وہ جنت کمال۔

نہ وہاں غصہ تھا۔ نہ خفگی۔ نہ شک کی کوئی لہر اور نہ ہی کوئی استہزاء۔
"تمہیں اکیلے مال آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"
"تم ناراض تھے۔ تم سے کیسے کہتی؟" اس نے رومال دیا تو آنسو صاف کر لیے۔
وہ چند لمحوں تک لا جواب ہو کر بیٹھا رہا۔
"کہہ سکتی تھیں۔ میں کوئی ایسا ناراض بھی نہیں کہ ساتھ نہ آتا!"

اس کی سابقہ بیوی۔ کسی پچھتاوے کی زد میں نہ کل تھی نہ آج نظر آ رہی تھی۔ وہ جو اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے مکمل اور زندہ نظر آ رہی تھی۔

وہ ذرا سا چپ ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو ٹھہرے رہے۔
"تمہارے لیے گفت لینا تھا۔ تمہیں کیسے لاتی؟" اصل مسئلہ تو یہ تھا۔

"گفت؟" حیرت سے ابرو اچکا کر سیدھا ہو بیٹھا۔ "اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"
وہ ٹھیک ٹھاک باتوں میں الجھا کر اس کا ذہن بھٹکا چکا تھا۔

"برحمان!" ماہین عبدالکریم کی آنکھوں میں قہر کی نمی تھی۔ غصہ تھا۔ برحمان واصف سناٹوں میں گھرا کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔
☆☆☆

وہ پہلے انگلیاں مسلتی رہی۔ "میں نے سوچا تھا تمہیں گفت دوں گی۔ اور بات کروں گی اور۔"

مال کے ریسٹوران کے پرائیوٹ کیمین میں۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چہرہ سرخ، نم آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ دھیمی دھیمی سسکیاں۔ انگلیاں مسلتی وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا وجود ابھی بھی کپکپا رہا تھا۔
"تم مال آئی رہی تھیں تو مجھ سے رابطہ کر لیتیں!"

"معافی مانگوں گی۔" نظریں جھکائے رہی۔
وہ گہری سانس لیتا اسے دیکھے گیا۔
"میں ناراض نہیں ہوں۔"
"تو جو راضی ہوتے ہیں کیا وہ ایسے کرتے ہیں جیسے تم کر رہے ہو۔"

اس نے سر اٹھا کر قارس کو دیکھا۔ وہ خالی گلاس میں پانی انڈیل رہا تھا۔
وہ بتا نہیں سکتی تھی اس کے لیے تھوہ لینے آئی تھی۔ آج کے لیے کتنے پلانز تھے اس کے۔
آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ لب بچھ کر رونے پر قابو پانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔
"اچھا ٹھیک ہے چلو۔"
"کہاں؟" سر اٹھا کر پوچھا۔
"جو تم نے کام کرنے ہیں۔ وہ جلدی سے کرو۔ پھر گھر چلتے ہیں۔"

"لو پانی پیو!" گلاس تھا دیا۔ اس نے چند گھونٹ لے کر گلاس ہاتھوں میں دبائے رکھا۔ جیسے کسی مضبوطی کی ضرورت ہو۔ گہری سانس لیتے اس نے خود کو کس حد تک سنبھال لیا۔ سر اٹھا کر۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا

وہ آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
وہ کیمین کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تو ہینڈ بیگ اٹھاتی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔
"کیا خریدنا ہے تمہیں؟" لفٹ کا رخ کرتے ہوئے پوچھا تا کہ اسی حساب سے وہ اس کی مدد کر

"لو!" کرڈٹ کارڈ نکال کر دے دیا۔
 روکس یا راڈو کی لوگی تو۔ اچھا رہے گا!" مشورہ دے
 کر خود شاپ سے باہر نچر جا بیٹھا۔
 اس نے گہری سانس لے کر روکس کی چند
 گھڑیاں چیک کیں۔ قیمت دیکھی۔ اب رنگ دیکھ
 رہی تھی۔ ایک گولڈ کلر میں تھی۔ دوسری سلور۔
 "سلور بہتر رہے گی!" اس کے کندھے پر
 جھک کر بولا، اس کی آواز سختی ہو کھلا کر سیدھی ہوئی۔ پتا
 نہیں کب اندر آیا۔ ابھی تو باہر بیٹھا تھا۔
 "اوہ۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ سلور ہی ٹھیک ہے!"
 مشکل حل ہو گئی۔ گھڑی پیک ہو گئی۔ خرید کر باہر آ
 گئے۔

"دوسرا کیا کام ہے؟"
 "دوسرا کچھ زیادہ خاص کام نہیں تھا!" بیک کی
 اسٹریٹس پر گرفت بڑھائی۔
 "کام تو تھا!" اس نے کریدا!
 "ہاں وہ۔ اصل میں مجھے۔ کارڈ لکھوانا
 تھا!" جھجک کر بتا دیا۔ سارے پلانز ضمیر کرنے پڑ
 رہے تھے۔ سر پرانز کا بیڑہ غرق۔
 گاڑی کا دروازہ کھولتے اس نے رک کر جنت
 کو دیکھا۔ اچھے ہے۔

"کیسا کارڈ۔؟"
 "وہ لکھواتے ہیں کوئی اچھی سی بات۔ دعایا
 کوئی میسج۔۔۔" فیمبر سیٹ پر بیٹھ کر وضاحت دی۔
 "آل رائٹ۔ سمجھ گیا۔" اس نے گاڑی
 اشارت کر دی۔

جہاں کارڈ لکھوانا تھا۔ وہاں پہلے سیاہ رنگ کا
 کارڈ پسند کیا۔ اس پر نفرتی روشنائی سے اب کوئی
 عبارت لکھوائی تھی۔

وہ پیچھے دیوار سے پشت لگائے جھپوں میں
 ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اور وہ آگے میز پر کچھ دیکھتی سوچ
 رہی تھی۔ لکھوانا کیا ہے۔ پہلے تو ارادہ کیا تھا آئینہ سے
 پوچھے گی۔ آئینہ تو ساتھ ہی نہیں تھی۔ جو ساتھ تھا اس
 سے اپنی بے عزتی کروانے کا سوڈ نہیں تھا۔

سکے۔
 "گھڑی لینی تھی!" لب کاٹ کر بتا دیا۔ اسے
 پتا تھا کس فلور پر اسے کس طرح کی برائڈل جائیں
 گی۔ وہیں لے گیا۔
 سیلز مین انہیں تیس قیمتیں اور بے انتہاء مہنگی
 گھڑیاں دکھانے لگا۔

وہ ذرا سا کنفیوز ہوئی گھڑی تھی۔
 "تم اپنی پسند کا گفٹ لوگی۔ یا گفٹ میری پسند
 کا ہوگا؟" کتنے دنوں بعد وہ پہلے کی طرح بات کر رہا
 تھا۔

میز پر کہنی ٹکا کر پوچھا تو وہ پزل ہو کر گھڑی
 رہی۔ چہرہ ہنوز سرخ سا۔ پلکیں بھیگی ہوئیں۔

"تم۔ تم۔ تم خود پسند کر لو۔"
 "اوکے!" کہہ کر اس نے سب سے مہنگی
 ترین گھڑی پر ہاتھ رکھ دیا۔ نکال کر کلائی پر پہن کر بھی
 دیکھا۔ جنت نے قیمت پوچھی تو ہوش اڑ گئے۔ اتنے
 پیسے اس کے پاس اس وقت نہیں تھے۔

"ایسا کرنی ہوں میں گفٹ دے رہی ہوں۔ تو
 مجھے ہی پسند کرنا چاہیے۔" گڑبڑا کر اس کی کلائی
 سے گھڑی اتروا کر سیلز مین کو واپس کر دی۔ جیسے وہ
 کوئی دھماکہ خیز چیز ہو۔

"اتنے پیسوں سے تو اقصیٰ کے گاؤں میں دو
 تین گھربن جائیں۔" سوچ کر پھر دوسری طرف
 گئی۔ وہ اب جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

اس نے ایک گھڑی پسند کی۔ اس کی قیمت
 پوچھی۔ مناسب تھی۔ مگر اس وقت اس کے پاس بیک
 میں جتنی رقم تھی اس پر بھاری۔ نکال کر وہ
 گئی۔ اب اسے کیا پتا تھا یہاں اتنی مہنگی گھڑیاں ہوں
 گی۔ ابھی تو اسے اور بھی شاپنگ کرنی تھی۔

"گفٹ تم لے لو۔ بے منت میں کر دوں
 گا۔" اس نے جس طرح سے کہا جنت کا چہرہ خفت
 سے سرخ ہو گیا۔ وہ اس کی مسکراہٹ ابھری اور چپتی
 دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کے تاثرات سے محظوظ ہو رہا
 تھا۔

"کچھ نہیں نکھا؟" قریب آ کر خاکی صفحے پر
نظر دوڑاتے پوچھا۔

"ابھی سوچ رہی ہوں!"

"اتنا سوچ رہی ہو؟"

"تمہارا کیا بھروسہ اسی مان جاؤ!" جنادیا۔

"پیغام لکھنا ہے یا کوئی دھمکی دینی ہے؟"

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ "اچھا ٹھیک ہے

مجھے سوچنے دو اب۔"

"بس سہل سا لکھ دو۔ ڈبے میں ڈبے۔ ڈبے

میں یک۔۔۔۔۔" اس نے ایک دم سے قارس کو دیکھا

اور ہنس پڑی۔ ہنسی کی جلتی رنگ میں اس پاس زندگی

کے آثار بکھر گئے۔ جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آگئی

ہو۔ "اللہ! تم نے بھی یہ شعر سنے ہوئے ہیں؟؟" وہ

اس کی طرف گھوم گئی۔

"ہاں کسی نے لکھ کر دیے تھے مجھے۔ غالباً

فرینڈ شب ڈے تھا!" جیسوں میں ہاتھ ڈالے بولا۔

"میں تمہیں بتا نہیں سکتی یہ شعر میرا کتنا فیورٹ

تھا۔ میں اتنا عرصہ اپنی فرینڈز کو بھی بھتی رہی۔ ایک

اور بھی تھا۔" اب وہ یاد کر کے اسے سنانے لگی۔ وہ

مبہم سا بس مسکراتا رہا۔

"اب سچ میں یہیں لکھوا دوں؟" رک کر

شرارت سے پوچھا۔

"اپنے بچوں کو پھر سے دکھا سکو تو لکھ دو!"

وہ ہنسنے چلی گئی۔ پھر پچلا لب دبائے کاغذ پر

جھکی۔ اس نے لکھ کر دے دیا۔ کارڈ پرنٹ ہو

گیا۔ گفٹ کے ساتھ پیک کر کے رکھ رہی تھی وہ

بولا۔

"اب اور کیا ہاتی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں؟ کسی ریسٹوران میں کھانا کھا

لیں؟؟ کیا خیال ہے؟" اس کا لہجہ خوش گوار تھا۔ وہ

اب پریشان نہیں لگ رہی تھی۔

"قائن!!" اس نے گاڑی مرکزی شاہراہ پر

ڈال دی تھی۔ چند روٹ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک

ریستوران میں موجود تھے۔ کھانا کھانے کے بعد

جنت نے گہری سانس لی۔

جو گفٹ اس کے پیسوں سے خریدا۔ وہ اسے

پیش کر رہی تھی۔ جو کارڈ اس کے ساتھ لکھوا کر آئی۔

وہ اب اوپر رکھ رہی تھی۔ وہ بند منشی ٹھوڑی اسے دیکھ

رہا تھا۔ ہونٹ سنجیدگی سے پیچھے ہوئے۔ کمال

مہارت سے مسکراہٹ روکی گئی تھی۔ جنت کو ایسی

پتویشن میں پھنس کر اپنا آپ بہت ہی بے وقوف سا

محسوس ہو رہا تھا۔

"کیا مجھے گفٹ کھولتے وقت کچھ ایکنگ بھی

کرنا ہوگی۔ جیسے میں کسی شاک میں ہوں۔ یقین

نہیں آ رہا کہ تم مجھے گفٹ دے سکتی ہو۔ یا ایسا

کچھ؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

اللہ!! اس کی آنکھوں میں تارے ناچ

گئے۔ ٹھیک ٹھاک بے عزتی تھی۔ نفرت سے چہرہ

سرخ پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب۔ اس کی کوئی ضرورت

نہیں۔ بالکل بھی ضرورت نہیں۔" ضبط کر کے اس

نے کھڑی کا باکس اور کارڈ اٹھا کر اپنے بیک میں

واپس ٹھونس دیے۔ ابھی نہ دینے کا عزم کر کے۔ حد

ہے۔

"میں تو صرف تمہاری ایلپ کرنا چاہ رہا

ہوں!"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" زور دے کر

ناراضی سے بولی۔ "خود سے ساری باتیں اگوا لیں

تم نے۔ ورنہ میں نے تو تمہیں سر پرانزی دینا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آئم سوری۔ تم جو کرنا

چاہ رہی ہو۔ وہ کرو۔ میں چپ ہوں!"

"میں اب کچھ نہیں کروں گی۔" اسے

جواب دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کل عموماً ایک دوسرے کی پسند سے گفٹ

لیتے ہیں اور اکٹھے بھی لیتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بڑی

بات تو نہیں ہے!!" اس نے معاملے کو ٹھنڈا کرنا

چاہا۔

"ہاں مرد وہ یہ تو نہیں پوچھتے کہ گفٹ لیتے وقت مجھے کیساری ایکشن دینا ہوگا۔ حیران ہونا ہوگا یا پریشان ہونا ہوگا یا شاک میں جانا ہوگا!!"

جس انداز میں اس نے کہا۔ اور جس طرح آخری جملے میں اس نے نقل اتاری۔ وہ ہنس دیا۔

"ہاں ہاں اب ہنسو۔ مجھ پر ہنسو۔" وہ اچھا خاصا چڑ کر باہر نکل گئی۔

وہ بل ادا کر کے باہر آیا تو جنت گاڑی کے پاس ناراض سی کھڑی تھی۔

"میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا۔ جیساری ایکشن تم چاہو گی میں ویسا ہی دے دوں گا!" اس کے پاس آکر کہا۔

"تو تمہارے اپنے احساسات کا کیا؟؟" اس نے مڑ کر پوچھا تو وہ اپنی جگہ رک گیا۔

"میرے احساسات گئے بھاڑ میں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے گاڑی کا لاک کھول دیا۔

وہ اپنی جگہ قائم کر رہی تھی۔

"آئیں کریم کھانا چاہو گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ اپنے حواسوں میں لوٹتے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ لنگی میں سر کو جنبش دی۔ اس کا دل ایک دم سے بھاری ہو گیا تھا۔

"گھر چلتے ہیں!"

اس نے سر ہلا کر گاڑی اشارت کر دی تھی۔ دوران سفر ایک عجیب سی خاموشی چھائی رہی۔ وہ کھڑکی کی طرف رخ کیے گہری سوچ میں غرق تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف دہ تاثرات ابھرتے بیٹھے جا رہے تھے۔ اندر کا درد آنکھوں سے عیاں ہو رہا تھا۔

"کیا اب گفٹ دینے کا بیج میں کوئی ارادہ نہیں ہے تمہارا؟"

وہ بات کر رہا تھا تو جنت جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ گہری سانس لے کر اس نے گاڑی روک دی۔

"میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

جنت نے نہیں جھکا کر اسو روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک جیسے اپنے اندر ہمت جمع کی۔

"جب میں تم سے سوال کرتی تھی۔ تمہارے باپ، بھائی یا دادا کے بارے میں۔ اور تمہاری ایکس وائف کے بارے میں بھی۔ میں چاہتی تھی، تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں جانتا چاہتی تھی۔ مجھے لگتا تھا میں سوال کروں گی تو تم جواب دو گے۔ وضاحت دو گے۔

لیکن تم کچھ نہیں کہتے تھے۔ کسی سوال کا جواب نہیں دیتے تھے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا خاموش بیٹھا رہ گیا۔

"میرے ذہن میں ایسے چھوٹے موٹے سے اختلاف آ جاتے تھے۔ بھائی سویتلا ہے۔ اس لیے کوئی مسئلہ ہوگا۔ باپ کے ساتھ کوئی ایٹو۔ دادا سے کوئی ناراضی۔ لیکن میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا تمہارے ساتھ یہ سب ہوا ہوگا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا۔ ان کا ذکر تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ رہا ہو گا۔ تم سنتے رہے لیکن تم نے مجھے نہیں روکا۔" اس کی آواز ہلکی۔ "جب مدحت ہالو نے مجھے سب بتایا تو۔" رک کر لب بھینچے۔ "میں تب سے خود کو معاف نہیں کر پار رہی۔" وہ بہت تکلیف میں نظر آ رہی تھی۔

وہ اسٹیرنگ وھیل پر ایک ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ تاثرات سنجیدہ تھے۔ لبوں پر سکوت ٹھہرا ہوا تھا۔

"میں۔ میں عدینہ سے بہت جھگڑا رہی۔"

آنسو صاف کر کے لہجہ کو حتی الامکان مضبوط کرتے ہوئے بولی۔ "میں اس کی باتوں میں آ گئی۔ اس نے کہا تم دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ میں نے مان لیا۔ اس نے کہا تم اس کی وجہ سے کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے یہ بھی مان لیا۔ اس نے کہا وہ کسی بھی وقت تمہیں ہاں کہہ کر تمہاری زندگی میں واپس آ سکتی ہے۔ میں نے اس پر بھی یقین کر لیا۔ تمہاری نفرت نے مجھ سے سب منوالیا قارس۔"

وہ چھتاؤں کی زد میں بہت دمی نظر آ رہی تھی۔
اس نے شک کیا۔ غلط سمجھا۔ غلط سوچا۔
"میرے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ پہلی
شادی کا تجربہ اتنا برا تھا کہ تم دوبارہ کسی رشتے میں
نہیں پڑنا چاہتے تھے۔"

سڑک پر گاڑی گزر گئی۔ اندھیرے میں کہیں
تیاں روشن ہوئیں۔ قارس لمحے بھر کے لیے نظر ہٹا کر
کہیں اور دیکھنے لگا۔

"غلطی تمہاری بھی ہے۔ تم اپنے بارے میں
کچھ بتاتے بھی تو نہیں تھے۔ میں نے اپنی لاعلمی میں
تمہیں بہت ہرٹ کیا۔ جو بات تکلیف دیتی ہو۔
انسان اس کا ذکر نہیں کرتا۔ آئی بھی اس لیے خاموش
تھیں کہ بات معمولی نہیں تھی۔ حماد بھائی نے عدینہ
سے شادی کی۔ اور۔" وہ رک گئی۔

"میں سمجھتی رہی کہ سویتا بھائی ہے۔ شاید
اسی وجہ سے۔ کسی ناراضی یا اختلاف کے باعث تم
ریان کو گھر نہیں لارہے۔ مجھے یہ بات بہت ڈسرب
کرتی تھی کہ۔ وہ قسیم بچہ ہے۔ اور تم پھر بھی نہیں لا
رہے۔ یہ اس بچے پر غلط تھا۔ روٹی سے میری روز
بات ہوتی تھی۔ ریان وہاں ٹھیک تھیں تھا۔ اس کے
ہاتھ پر چوٹ لگی تو اسے ہاسپٹل لے کر جانے والا
کوئی نہیں تھا۔ تم مجھے بتاؤ۔ میں یہ سب سنتی اور کیسے
کیسے چپ بیٹھی رہتی؟

میں نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی۔ اور تم
غصے میں آ گئے۔ میں حقیقتاً نہیں چاہتی تھی اس
معالے کا اثر ہمارے رشتے پر پڑے۔ میں بالکل
نہیں چاہتی تھی۔ لیکن جب روٹی سے بات ہوئی۔
اور اس نے مجھے بتایا ریان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
اور اس کی کوئی فکر بھی نہیں کر رہا تو میں۔ تمہارے منع
کرنے کے باوجود۔ جھوٹ بول کر وہاں گئی۔

میں جانتی تھی جب اسے گھر لے آؤں گی تو تم
ضرور ناراض ہو گے۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا۔ میں سب
سنجال لوں گی۔ مجھے لگ رہا تھا۔ سب ٹھیک ہو
جائے گا۔ میں نے پورا پلان کر لیا تھا کہ اگر تم بچے کو

نہیں دیکھنا چاہو گے تو تمہارے سامنے نہیں آنے
دوں گی۔ لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے اسے وہاں
چھوڑ کر اس ظلم میں نہ خود شریک ہوں گی۔ نہ تمہیں
ہونے دوں گی۔"

اس نے رک کر خشک لبوں کو تر کیا۔ "میں
وہاں گئی۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے احساسات کا
خیال تھا۔

یا تمہاری ناراضگی کی پرواہ نہیں تھی۔ پرواہ بھی
تھی۔ فکر بھی تھی۔ لیکن میں پھر بھی گئی۔ یہ سب۔ بس
ہو گیا مجھ سے۔" قارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔
وہ رو رہی تھی۔

"اس طرح تمہیں ہرٹ کرنے پر تکلیف مجھے
بھی ہے۔ کیونکہ اب تمہیں لگتا ہے جیسے مجھے تمہارے
احساسات کی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن مجھے پرواہ ہے۔
" وہ اپنی بات کہہ کر نظر جھکا لی، آنسو صاف کرتی
چپ ہو گئی۔ "مجھے معاف کر دو قارس!! آئندہ تمہیں
ہرٹ نہیں کروں گی۔"

اس نے تم آنکھوں کے ساتھ قارس کے ہاتھ پر
اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی
جکائیں بہم سی تھیں۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر رہی
تھی۔ لب سنجیدگی سے بچنے ہوئے تھے۔ مگر چہرے
کے تاثرات سخت نہیں تھے۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا اور
ایک بار پھر وہ اسے مختلف اور منفرد سے روپ میں نظر
آ رہی تھی۔ وہ جنت کمال جو اس کی خاموشی سے
ناراضی کا عنصر کیے ہوئے بھی جانتی تھی کہ اس کا
وجود ہمیشہ سے اس کی زندگی میں ایسے ہی رہا ہے۔
اس کی دخل اندازی ہر بار اس کی زندگی کو کسی اور رخ
میں ڈال دیتی تھی۔

وہ جنت کمال جس نے سات سال کی عمر میں
اس کی سرد مہری کو کسی کھاتے میں نہ لاتے ہوئے
اسے ہنسا اور جینا سکھایا۔ وہی جنت کمال چودہ سال
بعد اس کی زندگی میں آئی اور اس کا جمود توڑ دیا۔ اس
کی نظروں کو دمودیا۔ اس کے اندر پابہر کی دنیا کو یکسر
بدل دیا۔ وہ جب اپنی من مانی کرتی تھی۔ یا ضد پکڑتی

تھی باڈیٹ کر فیصلہ کرتی تھی تو۔ اس کے خوف کے طوفان کھم جاتے تھے۔ وہ کام جو مشکل ہوتا تھا اس کا ساتھ آسان کر دیتا تھا۔ اس کی سنگت میں زندگی تاریکیوں میں بھی خوبصورت لگتی تھی۔ اس کا خیال۔ اس کے اردائے۔ اس کی باتیں۔ اس کا پر عزم انداز اسے نئے سرے سے جینا سکھادیتا تھا۔

دل کے معاملات دل میں تھے۔ محبت کی شدت بس آنکھوں سے نظر آسکتی تھی۔

اس نے بے حد نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ مبہم سا مسکرایا۔ "میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ میں ناراض نہیں ہوں۔ تھا بھی تو۔ اب نہیں ہوں۔" "پھر تم میرے ساتھ ٹھیک سے بات کیوں نہیں کر رہے تھے؟" "تم آنکھوں کے ساتھ شکوہ کیا۔ اب وہ وجہ بتا کر تیسری جنگ عظیم نہیں چھیڑ سکتا تھا۔

"شاید مجھے۔ وقت چاہیے تھا!" مختصر جواب دیا۔

وہ چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی "تم پکا ناراض نہیں ہونا؟" تصدیق چاہی۔ "نہیں!"

اس کا وہ مختصر سا پر یقین لہجہ میں ادا کیا ہوا وہ لفظ اس کے اندر سکون بٹھا گیا۔ دل سے بوجھ سرک گیا۔ وجود کا پھلکا سا ہو گیا۔

"اب گھر چلیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں ہاں چلو۔ لیکن مجھے آکس کریم بھی کھانی ہے۔" آکسو صاف کرنی۔ ہشاش بشاش ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں چمک اتری ہوئی تھی۔ لب بھی مسکرا رہے تھے۔ فوراً سے بیگ کھول کر اس کا ہاتھ کارڈ اسے واپس تھما دیا۔

"کیا کر رہی ہو؟" ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ وہیل سنبھالے۔ دوسرے ہاتھ سے چیزیں سنبھالتا تپ گیا۔

"آکس کریم، مت بھولو۔" وہ سیٹ پر ایڑی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

قارس گہری سانس لے کر رہ گیا۔ آٹھ بجے گھر پہنچے تو لاؤنج روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ لی دی آن۔ کارپٹ پر کھلوانے بکھرے ہوئے۔ ملازمہ ریان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مسز شیرازی وہیل چیمپر پر۔ وہ فون کال سن رہی تھیں۔ انہیں اندر داخل ہونا دیکھا تو ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرائیں۔

ریان تو فوراً سے اٹھ کر، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنت کی طرف لپکا۔ ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ پھر اپنے ننھے ہاتھ اوپر کیے۔ بیگ صوفے پر رکھتے اسے جھک کر اٹھالیا۔ ہاتھ میں گفٹ پیک لے، دوسرے ہاتھ سے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟" مسز شیرازی کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا! دوسرے ہاتھ سے ریان کے بال سنوارے۔

"میری جان مجھے پریشان کر سکتی ہے بھلا بار بار ہار تمھارے کمرے کی طرف جابرا ہوا تھا۔" مسکرا کر بتانے لگیں۔

"مس کر زبے تھے آپ مجھے؟ ہاں؟" اس نے ریان کا گال چوم لیا۔ "دیکھو تو میں کیا لالگی ہوں۔" شاپنگ بیگ کھول کر اس کی چیزیں نکالنے لگی۔ وہ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت پیاری تھی۔ اس کا کھٹا ہوا چہرہ زندگی کا احساس دلاتا تھا۔ مسز شیرازی مسکراتے ہوئے انہیں دیکھتی رہی تھیں۔

☆☆☆

اپنے کمرے کی کمرچیوں کے سامنے وہ صوفے پر بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ سوئمنگ پول کی دائیں طرف سنگ ایریا میں قارس کا وچ کے ساتھ فیک لگائے کارپٹ پر بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ لیپ ٹاپ ٹیبل پر رکھا تھا۔ فائلز کا ڈھیر تھا۔ کافی کاگ۔ قلم۔ وہ اپنے کام میں بہت مصروف نظر آ رہا تھا۔ مدحت ریان کو اٹھائے قارس کے پاس آگئی

تھی۔ اب وہ اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ خالی فیڈر ہاتھ میں تھا۔ فارس نے سرکواثبات میں جنبش دی تو وہ ریان کو اس کے چند کھلونوں کے ساتھ اس کے پاس ہی بٹھا کر چلی گئی۔ صوفے کی پشت کے ساتھ گردن نکائے وہ آنکھوں پر پڑتی دھوپ سے قطعی بے نیاز نہیں دیکھے گئی۔

پہلے تو ریان اپنے کھلونے کی طرف متوجہ رہا پھر اپنی کار اٹھائے فارس کی گود میں چڑھنے لگا۔ لیپ ٹاپ اسکرین سے نظر ہٹاتے اس نے ریان کو خود سے الگ کر کے نیچے بٹھا دیا۔ وہ پھر سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اب کی بار وہ اسے خود سے دور نہیں کر سکا۔

ریان اب پورے استحقاق سے گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی ہاتھ میں تھی۔ اپنی ٹانگ جھلاتے وہ آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ جیسے بہت اچھے سوز میں ہو۔ جنت کی نگاہیں فارس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اس کے تاثرات لمحے بھر کے لیے مبہم ہو گئے تھے۔

وہ اپنے کام پھر سے کرنے لگا تھا مگر۔ ریان کی وجہ سے اب توجہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی اسے دے رہا تھا۔ اس کے غیر مفہوم سے چھوٹے چھوٹے لفظ تھے۔ وہ ادا کرتا ہوا۔ اب اس کے لیپ ٹاپ پر ہاتھ رکھنا چاہ رہا تھا۔ فارس نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

اسی لمحے مدحت وہاں آگئی تھی۔ جھک کر اسے اٹھانا چاہا تو ریان نے ایک دم سے اس کا ہاتھ ہی جھٹک دیا۔ جنت کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھے رہتا چاہتا تھا۔

"فیڈر نہیں چاہیے کیا؟" مدحت نے پچکارا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے فیڈر لے لیا۔ لیکن اس کے پاس نہیں گیا۔

وہ آنکھوں میں دلچسپی لیے نہیں دیکھتی رہی۔ کیا اسے فارس میں اپنے ہاں کی خوشبو آتی ہو گی؟ اس نے سوچا۔ وہ بظاہر سب کے پاس چلا جاتا

تھا۔ کہ سب اٹھاتے تھے اور پیار بھی کرتے تھے۔ مگر فارس کے ساتھ اس کا معاملہ الگ تھا۔ وہ اس کے پاس خود جاتا تھا۔ اس نے کئی بار نوٹس کیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ریان نے کئی مرتبہ ہاتھ اس کی جانب اٹھائے تھے۔ فارس لاؤنج میں بیٹھا ہوتا تو اس کے پاس پہنچ جاتا۔ ٹانگ سے لگ کر کھڑا رہتا۔

اس مختصر عرصے میں اس نے ایک بار بھی فارس کو ریان کی طرف اس طرح سے متوجہ ہوتے نہیں دیکھا تھا جیسے آج دیکھ رہی تھی۔ مدحت اسے وہاں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ دودھ پینے کے بعد وہ اس کی گود سے نکل گیا۔ اپنے کھلونے اٹھا اٹھا کر اس کے لیپ ٹاپ کے پاس ہی ٹیبل پر رکھنے لگا۔ ایک گاڑی اسے بھی دے دی۔ جو کہ فارس نے لے کر رکھ دی۔ کی پیڈ پر تیزی سے کچھ لکھتے وہ گاہے بگاہے اس پر بھی نظر دوڑا لیتا۔

ریان اب کافی ٹیبل کے نیچے گھسنا چاہ رہا تھا۔ شاید وہاں کچھ گر گیا تھا۔ فارس نے بازو سے پکڑ کر اسے باہر نکالا اور پھر رک سا گیا۔ ریان کا بازو اس کے ہاتھ میں تھا۔ جنت نے محسوس کیا، وہ کچھ دیکھ رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحوں میں وہ سیدھی ہوئی تھی۔ ذرا سا آگے ہو کر غور کرنا چاہا۔

فارس اب اس کی شرٹ اتار رہا تھا۔ جنت کے تاثرات میں پریشانی اتر آئی۔ ریان کی پشت پر ٹیبل جیسے نشان تھے جو اب کافی جگے ہو چکے تھے۔ وہی نشان اب فارس دیکھ رہا تھا۔ اس کے بازو پر، گردن کے نیچے، اور پیشانی پر جگہ جگہ مندمل ہوتے زخموں کے کئی نشان تھے۔

اس نے فارس کے تاثرات بڑھنے کی کوشش کی۔ وہ ریان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اب وہ اس سے پوچھتا بھی چاہتا کہ یہ جو نہیں کیسے آئی تھیں۔ تو وہ بتا نہیں سکتا تھا۔

معصومیت سے اسے دیکھتے۔ ریان پھر سے کافی ٹیبل کے نیچے جانے لگا۔ فارس نے پکڑ کر بٹھا

دیا۔ شرٹ پہنانے کے بعد اس نے ملازم لڑکے سے کہا وہ اسے لے جائے۔

اس کے کھلونے، فیڈر اور جو چیزیں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ اس نے اٹھانے کا کہا۔

جنت اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ نگاہیں فارس کے چہرے پر جمی رہیں۔ ملازم لڑکا وہاں سے جا چکا تھا۔ ریان بھی اب وہاں نہیں تھا۔ نہ کوئی ڈسٹربنس تھی۔ نہ کوئی شور یا بے توجہی۔ لیکن فارس اب کام نہیں کر پار رہا تھا۔ چند ایک صفحات پر سائن کرتے۔ لیپ ٹاپ پر کچھ لکھتے۔ وہ پیشانی حسرت پر جھمکے ہو گیا۔ صوفے پر اپنی گردن گزائے۔ دائیں بائیں اپنے بازو پھیلائے وہ آنکھیں موند چکا تھا۔

جنت اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نرمی اور محبت سی نظر آ رہی تھی۔

اب تک اس کا یہی خیال تھا وہ محض اپنی ماں کے لیے ریان کو واپس لایا ہے۔ مگر آج اس کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ جس طرح اس نے ریان کو بٹھنے دیا تھا اور جس طرح سے شرٹ اتار کر اس کے زخم کا معائنہ کیا تھا تو۔ اب اسے ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ریان کا چچا ہی تھا جو اسے واپس لے آیا تھا۔

☆☆☆

سامنے تو ہو تو کدھر دیکھوں
تو ہی محسوس ہو جدھر دیکھوں
جانے کیوں تجھ سے جی نہیں بھرتا
جس قدر چاہوں، جس قدر دیکھوں
تو ہی کافی ہے عمر بھر کے لیے
اور تجھ سانس عمر بھر دیکھوں
جھیل جیسی ہیں وہ کنول آنکھیں
ان میں ایک روز ذوب کر دیکھوں
ایک ہی شخص ہے بہت ناصر
کیوں کوئی اور ہم سفر دیکھوں
(ناصر زیدی)

جنت اسے ڈھونڈتی ہوئی باہر آئی تو فارس

اسے پول میں سوئمنگ کرتا ہوا دکھائی دیا۔
"سنو" رینگ کے پاس آ کر آواز دی۔
وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتا کنارے پر آ گیا۔
"آنٹی نے مجھے بتایا ہے ہم کوئٹہ جا رہے ہیں؟" اس کے لہجہ اور اہماز میں ایکساٹمنٹ نظر آ رہی تھی۔

"ہاں!" وہ کنارے پر کہنیاں نکائے بولا۔
"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں!!" جنت کی اب سمجھ میں آیا وہ اس کی ڈاکٹر سے پریکٹس میں سفر کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔
"ابھی کنفرم نہیں ہوا۔" کنارے سے ہٹ کر وہ ڈکی لگا تا دور ہو گیا۔
"کنفرم نہیں ہوا تو کرلو۔" وہ حفاظتی رینگ پر ہاتھ بٹما کر بولی۔

"کیوں؟"
"تم بھول بھی گئے؟"
وہ آنکھوں میں ماتمی کا تاثر لیے اسے دیکھنے لگا۔

"وہاں میرے ماما کا گھر ہے!" بہت مایوس ہو کر اسے بات یاد دلائی۔ آخر وہ کیسے بھول گیا۔؟؟
"اوہ ہاں۔ کروڑوں کی زمین۔"

جنت نے لب بھجج لیے۔ "اب جب میں کچھ الٹا سیدھا نہیں سوچ رہی تو تم بھی مجھے الٹا سیدھا سوچنے پر مجبور مت کرو۔"
وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"تو کب تک جانا ہے!" اس کا بس چلتا تو ابھی اڑ کر پہنچ جاتی۔
"کل کا ارادہ ہے۔"

وہ جیسے بس یہی جواب سننے آئی تھی۔ "یس"
ہاتھ جوڑ کر خوشی خوشی قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

حصہ نے کمال منزل کے دروازے کھلوادے تھے۔ آج صبح سے ہی وہ یہاں تھی۔ شام تک دوسری سب نہیں بھی یہاں انکشی ہونے والی تھیں۔ نشیہ

کی وفات کے بعد سے یہ ایک معمول سا تھا کہ تمام بہنیں ایک اینڈ پراکٹس ہوتی تھیں۔ گھر کی صفائی بھی کرتیں۔ صدق خیرات۔ اور اللہ کے نام پر دعوت بھی۔ ماں باپ کے اجر کے لیے۔

ان کی اپنی ملازمہ اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی تو انہوں نے سیکینہ کو بلوا کر گھر کی صفائی شروع کروادی تھی۔ امی کے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اپنی گھرائی میں جھاڑ پونچھ کر داری تھیں۔

"بس۔ کیا کہیں۔ بیٹیوں کا عم اللہ سوہتا کسی کو نہ دے" الماری سے ان کی تصویر نکال کر دیکھتے۔ اس پر ہاتھ پھیرتے۔ نم آنکھوں کے کنارے صاف کرتے وہ اس ایک جملے کو سنتے لمحے بھر کے لیے رک گئی تھیں۔ مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"بھئی کبھار تو مجھے لگتا ہے سارا قصور میرا ہی ہے۔" کھڑکی کے پٹ صاف کرتے سیکینہ دل گرفتگی کے عالم میں بولتی ہوئی سیدھی ہوئی۔ "نہ میں بڑی بی بی کو جنت کے بارے میں بتاتی۔ نہ وہ اس طرح ہر بات دل پر لیتیں۔ پر کیا کرتی۔ خودی تو پوچھتی تھیں۔"

حفصہ کی آنکھوں میں ایک دم سے تحیر اتر اٹھا۔ حیرت۔ صدمہ۔ نفسہ جنت کا نام تک نہیں لیتی تھیں۔ پوچھنا تو دور کی بات تھی۔

"تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ اس کے پاس آئیں۔

سیکینہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر حفصہ کو دیکھا۔ "بی بی جی۔ وہ جب برحان صاحب کی شادی ہوئی تھی تو دوسری۔ تو اس کے بعد۔ وہ مجھ سے پوچھتی تھیں۔"

حفصہ کا دل ایک دم سے۔ زوروں سے دھڑکا تھا۔ "کس کے بارے میں پوچھتی تھیں؟"

"جنت بی بی کے بارے میں جی۔ کہ گھر کے حالات کیسے ہیں۔ شوہر کیسا ہے۔ کیا چل رہا ہے۔ وہ پہلے گھر آئی تھی نہ یہاں۔ پر وہ نہیں لیتی تھیں۔ پھر اس نے آمای چھوڑ دیا۔" سیکینہ اپنے تئیں انہیں یاد کروا

رہی تھی۔

"تم سے۔ تم سے وہ جنت کا حال احوال پوچھتی تھیں۔"

"جی بی بی جی۔ اور میں سب سچ سچ بتاتی رہی۔ بھول گئی۔ بیٹیاں تو ایسی باتیں چھپاتی ہیں کہ ماؤں کو تکلیف نہ ہو۔ پر مجھے لگتا تھا۔ انہیں دکھ نہیں ہوتا ہوگا۔ اب بتائیں کون نہیں جانتا، وہ چھوٹی سے کتنی نفرت کرتی تھیں۔ پر۔ دل کا حال تو اللہ جانے۔ وہ جس دن ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے میں نے انہیں بتایا کہ گھر میں جھگڑا ہوا ہے۔ جنت بی بی گھر میں چھپ چھپ کر روئی رہیں۔ اور برحان بابو تو انہیں منہ بھی نہیں لگاتے۔ بات بھی نہیں کرتے۔ کہنے لگیں حفصہ آئے تو بات نہ کرتی ہوں، اسے گھر لے آئے۔ بس جی۔"

حفصہ کا دل ایک دم سے گہرے پاتال میں جا گرا۔

"امی نے یہ کہا تھا؟" الفاظ کچھ صدمے سے ٹوٹ کر لکے۔ سیکینہ نے سر ہلایا۔ "قسم لے لو جی۔ آواز مانوکان میں کھڑی ہے۔"

وہ صدمے سے اپنی جگہ پتھر ہو گئیں۔ ذہن میں ایک منظر ابھرا۔ پھر لفظ۔ آواز۔ نام۔ سینے پر ہاتھ رکھے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ جو بات وہ نیکمر نظر انداز کر چکی تھیں وہ ایک دم سے ذہن میں تازہ ہو گئی تھی۔

(آخری قسط - خندہ مادہ ان شاء اللہ)

سورج کی شمشیر

مائل - - - - - سحر
میک اپ - - - - - روزی میاں
ٹینس گولڈن - - - - - سحر

ہمارا مسئلہ کچھ اور ٹھہرا

تمہارا مسئلہ کچھ دن کی چاہت اور فداقت ہے
ہمارا مشورہ یہ ہے

کسی کے ساتھ بھی رہ لو

تعلق کی نئی دنیا بسا نہیں تو یوں بھی طاق
ہو تم تو

محبت کی اداکاری بھی تم پر ختم ہے منہ صاحب

جو ماضی بیت جاتا ہے

وہ پھر لوٹا نہیں کرتا

ہمارے ساتھ ہر اک بار پھر اصرار سا کیسا

تعلق کو بنانا اور تعلق توڑ لینا تو تمہارا اک

پرانا مشغلہ ٹھہرا

مگر ہم اس طرح کے کھیل کھیلا ہی نہیں کیتے

سو بہتر ہے

ہمارا راستہ چھوڑو، نیا رشتہ بناؤ اور کسی

کے ساتھ بھی رہ لو

خالد معین

جو ہواک بارود ہر بار ہوا ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے ہیار ہوا ایسا نہیں ہوتا

ہر اک کشتی کا اپنا تجربہ ہوتا ہے دیا میں

سفر میں روز ہی منجد ہار ہوا ایسا نہیں ہوتا

کہانی میں تو کرداروں کو جو پالے بنا دیجیے

حقیقت میں بھی کہانی کا رہا ہوا ایسا نہیں ہوتا

کہیں تو کوئی ہو گا جس کو اپنی بھی ضرورت ہو

ہر اک بازی میں دل کی ہار ہو ایسا نہیں ہوتا

سکھا دیتی ہیں محو کریں بھی راہ گیر دل کو

کوئی راستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

مدا فاضلی



کشتی چلارہا ہے مگر کس ادا کے ساتھ
 ہم بھی نہ ڈوب جائیں کہیں ناخدا کے ساتھ
 باتوں باتوں میں پھرنے کا اشارہ کر کے
 خود بھی رویا وہ بہت ہم سے کنارہ کر کے
 دل کی طلب پڑی ہے تو آیا ہے یاد اب
 وہ تو چلا گیا تھا کسی دل ربا کے ساتھ
 جب سے چلی ہے آدم ویزداں کی داستان
 ہر باؤف سا کاربط ہے اک بے وفائے کے ساتھ
 مہمان میزباں ہی کو بہک کے لے اڑا
 خوشبوئے گل بھی گھوم رہی ہے صبا کے ساتھ
 بڑھتا نماز میں بھی ہوں پر اتفاق سے
 اٹھتا ہوں نف رات کو دل کی صدا کے ساتھ
 ایک ہی شہر میں رہنا ہے مگر ملنا نہیں
 دیکھتے ہیں یہ اذیت بھی گواہ کر کے
 اعتبار ساجد -
 عبدالحمد عدم

معیار حماقت

لندن کے لواح میں ایک نوجوان جوڑا کار میں تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ ایک چیف جسٹس آف پیس نے انہیں روک لیا اور موقع پر ہی ایک سو پونڈ کا جرمانہ کر دیا۔

نوجوان بولا۔ ”جناب والا! ہم تو آپ کے پاس ہی آ رہے تھے تاکہ آپ ہماری شادی کا فریضہ انجام دے دیں۔“

”پھر تو جرمانہ دو سو پونڈ کا۔“ جج صاحب نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
”تم تو اس سے بھی زیادہ احمق ہو، جتنا میں نے پہلے سمجھا تھا۔“

اس سادگی پہ

ایک گھرانہ جو تنگ مکان میں رہتا تھا۔ ایک کشادہ مکان میں منتقل ہو گیا۔ ایک شخص نے اس مکان میں آنے والے بچے سے دریافت کیا۔
”تمہیں یہ مکان کیسا لگتا ہے؟“

بچے بتایا۔ ”مجھے یہ مکان بہت پسند ہے، میرا اپنا کمرہ ہے اور میری دونوں بہنوں کے بھی الگ الگ کمرے ہیں۔“

بچے نے یہ کہہ کر تھوڑا سا توقف کیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”مگر بے چاری ماما! انہیں اب بھی ڈیڑی کے کمرے میں سونا پڑتا ہے۔“

مشغلہ

ایک معروف ترین اسٹیٹ ایجنٹ ایک جوڑے کو اتوار کا پورا دن کرائے کے مکان دکھاتا ہوا

پچیس ویں مکان پر پہنچا۔ ”یہ بیڈ روم ہے، یہ بچن، یہ ڈرائنگ روم، یہ ڈائننگ روم، یہ ایچ ہانڈ روم، یہ بی بی وی لاکس اور یہ ہالی روم ہے۔ آپ کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی ہالی ہوگی۔“ اسٹیٹ ایجنٹ تسکین سی صورت بنا کر بولا۔

”ہاں، ہاں..... کیوں نہیں۔“ خاتون نے جواب دیا۔ ”اتوار کے دن کرائے کے مکان دیکھنا۔“

ووٹ

ایک بزرگ پولنگ بوتھ سے باہر نکل کر پولنگ ایجنٹ سے پوچھنے لگے۔

”کیا میری بیوی بھی اپنا ووٹ ڈال گئی ہے۔“
اس نے لسٹ دیکھ کر بتایا، ابھی کچھ دیر پہلے ہی ووٹ ڈال کر گئی ہیں؟“

بزرگ افسوس کرنے لگے کہ ”کاش آج مل جاتی۔“

پولنگ ایجنٹ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آپ ساتھ نہیں رہتے؟“
بزرگ نے کہا۔ ”میں اسے فوت ہوئے گیارہ سال ہو چکے ہیں لیکن الیکشن کے دن ووٹ ضرور ڈالتی ہے۔“

روتے ہیں چھم چھم نین

مجھے پونی ورشی میں ایک لڑکی بہت پسند آئی مگر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن ایک دوست نے کہا کہ سوروپے کے نوٹ پر اپنا فون نمبر لکھ کر اسے دے دو۔

میں نے ایسا ہی کیا اور اس سے کہا۔ ”یہ آپ کا نوٹ گر گیا ہے۔“ اس نے خاموشی سے نوٹ لے لیا

بیوی بچوں کے ساتھ اس کے گھر مہمان ہوں گے۔“
سب رشتہ داروں نے خاموشی سے چائے پی لی
اور چینی کے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔

ایر کئین میں جا کر وہاں برگر کھالیا۔ اب برگر والا
روز مجھے سچ کر کے پوچھتا ہے۔ ”برگر کیسا تھا پھر کب
آؤ گی لینے۔“

لنچ

ایک جگہ ایک ہندو، ایک سکھ اور ایک سردار
مزدوری کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے لنچ
بکس کھولے تو ہندو بولا۔ اگر کل میری بیوی نے پھر
لنچ میں آلو میٹر بنائے تو میں خودکشی کر لوں گا۔“
سکھ بولا ”اگر کل پھر میری بیوی نے لنچ میں
اٹھ بے پکائے تو میں خودکشی کر لوں گا۔“
”سردار جی بولے اگر کل میری بیوی نے لنچ
میں وال دی تو میں خودکشی کر لوں گا۔“
اگلے روز تینوں نے اپنے اپنے لنچ بکس کھولے
تو پھر وہی سب کچھ تھا۔ تینوں نے سمندر میں چھلانگ
لگا کر خودکشی کر لی۔

آخری رسومات کے وقت ہندو کی بیوی بولی۔
”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انیس آلو میٹر سے نفرت ہے تو
میں آلو میٹر بھی نہ پکائی۔“
سکھ کی بیوی بولی ”اگر مجھے معلوم ہوتا انیس
اٹھ بے سے اتنی نفرت ہے تو میں اٹھ اٹھ پکائی۔“
سردار جی کی بیوی بولی ”میری تو کچھ سمجھ میں
نہیں آ رہا۔ وہ تو اپنا لنچ خود بنایا کرتے تھے۔“

شکایت

ایک صاحب کے گھر کچھ رشتہ دار ملنے آئے
بیوی نے کچن میں صاحب کو بلایا اور بتایا کہ گھر میں
چینی ختم ہو گئی ہے۔

”انا صاحب نے بیوی سے کہا۔“ پتی دودھ
ہمیشہ کی طرح کم اور پانی زیادہ ڈال کر چائے بناؤ،
باقی میں سنبھال لوں گا۔

بیوی نے مہمانوں کو چائے پیش کی تو ان
صاحب نے کہا۔ ”اس میں سے ایک کپ میں چینی
نہیں ہے وہ جس کے حصے میں آنے کا ہم سب کل

یہ عالم شوق

بچے کی پیدائش کے بعد ڈیوری روم سے نکلنے
کے ایک گھنٹے بعد زچہ کو ہوش آیا۔ بدن میں طاقت
بالکل ختم ہو گئی تھی۔ کروٹ لینا تو دور ملنے میں بھی بے
پناہ دقت ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے داہنے
ہاتھ کو حرکت دی۔ کچھ ٹٹولا، ہاتھ کو کچھ محسوس نہیں ہوا
پھر بائیں ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی، کچھ ہاتھ
نہیں لگا۔ بے چین ہوئی۔ دور کھڑی نرس کو اشارے
سے بلایا..... ہونٹ ملنے پر کچھ الفاظ نہیں نکل سکے۔

نرس نے زچہ کی گھبراہٹ محسوس کر لی۔ اس کی
آنکھیں بھی نم ہو گئیں، آخر وہ بھی ماں تھی اور ماں کی
تڑپ کو کیسے نہ سمجھ پائی۔ دوڑ کر انکیو بیئر روم سے
لوڑا سیدہ کو لا کر ماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔
”میں سمجھ سکتی ہوں بہن! الو جی بھر کے دیکھ لو۔“
زچہ اپنی تمام تر ہمت چٹا کر بولی۔ ”میرا
(موبائل کہاں ہے میں یہ پوچھ رہی تھی۔“

رد عمل

ایک صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا۔
”اگر آپ نئی کار خرید لیں تو آپ کی بیوی کا کیا
رد عمل ہو گا؟“

”بس یہی کہ ”کیا آپ کو سگنل نظر نہیں آ رہا؟“
”ارے سارے، بریک آؤٹ لگا کر ہیں۔“
”موز کاتے ہوئے رفتار کم کریں۔“

”یہ آج آپ اندھوں کی طرح گاڑی کیوں
چلا رہے ہیں؟“
”وہ دیکھیں سامنے سے بس آ رہی ہے۔“
دو غیرہ وغیرہ

☆☆

شکوہ اللہ جل جلالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،
”اے میں میں جنت کے مالوں کے لیے نکاح میں
کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔“
فوائد مسائل :-

۱۔ دوطرفہ فائدہ میں دوستانہ تعلقات ہوں تو ان میں
قائم رکھنے اور مقبول کرنے کے لیے ایک دوسرے
سے رشتہ لینا دینا چاہیے۔
۲۔ کسی موافقہ و عہد کے ایک دوسرے کی طرف بیان
کر دینے۔ نکاح کا جائز تعلق قائم کر لینا بہتر
ہے تاہم اس میں نکاح کی دیگر شرائط یعنی
عہد کے سرپرست کی اجازت ، حق ہر
ایجاب و قبول اور گواہوں کی موجودگی وغیرہ
کا پایا جانا ضروری ہے۔

فکر کریں

ایک شخص نے ابو عثمان سے دریافت کیا۔
”کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کی وجہ سے بغیر
میں میری زبان سے اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے؟“
انہوں نے فرمایا۔
”تم خدا کا شکر کو اگر ذکر تمہارے ایک عضو کو بھول
نے اپنے کام میں مصروف رکھا ہے۔ اس معاملے میں بھی
شیطان فریب کاری کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ”جب تیرا
دل ذکر الہی میں مصروف نہیں ہے تو ایسا ذکر بھی
بے ادبی ہے۔“
شیطان کماں فریب کا جواب دینے والے
تین قسم کے لوگ ہیں۔
ایک وہ جو کہتے ہیں ”تو نے ٹھیک کہا۔ اب

میں دل کو بھی حاضر کرتا ہوں۔“
دوسرا عالم نفس وہ ہے جو کہتا ہے ”تو نے ٹھیک
کہا۔ جب دل حاضر نہیں ہے تو زبان بلا فائدے
کیا نازلہ۔ اور وہ ذکر تھوڑا کرنا خوش ہوتا ہے
اس نے شیطان کا کہا مانا۔“
تیسرا شخص کہتا ہے ”اگرچہ میرا دل حاضر نہیں ،
تب بھی زبان کو ذکر میں مصروف رکھنا خاموش رہنے
سے بہتر ہے۔“
اکثر پہلی قسم کے لوگ ہیں۔

میں کیوں نہیں پڑھ سکتا ،

آج کل لوگ ہیں بہت ہی سستی میں باقی ہیں
مگر پلٹے دھڑلے میں یہ بات نہ سنی۔ فقط بڑے
بڑے کھانوں میں ہوا کرتی تھیں کیونکہ ہاتھ سے لکھے
ہائے کے باعث بہت زیادہ ہوتی تھیں ایک
بادشاہ کے پاس چھٹکتا ہوا پڑی تھیں جن میں لکھا
تھے ملاوٹ جگہ جگہ نو چھوٹی کے لیے تصویریں بھی بنی
تھیں۔
ایک دن ملک کتابیں دیکھ رہی تھی اور اس کے
چاند چھوٹے بیٹے بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا۔
”ای جان! یہ کتابیں بھی دیکھاؤ؟“
ماں نے کہا میں دیکھا میں تو تھیں بیٹے صرف
تصویروں کو دیکھ کر خوشی کے ساتھ صدق پلٹے رہے
مگر چھوٹے لڑکے نے کہا۔
”ان میں کیا لکھا ہے؟“
ملک نے کہا ”جیسا اُلکس ہوئی چیزیں صرف
علم والے ہی پڑھ سکتے ہیں اور علم محنت سے آتا ہے“
ملک نے کہا ”جب تم پڑھ لو گے جو کتاب چاہو
جسے میں خوشی سے نہیں دے دیا کروں گی؟“

حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس گئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے ایک تکبیر رکھ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔

”اسے عبد اللہ رضی اللہ عنہ اے کیلے ہے؟“
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس مسلمان کے پاس اس کا مسلمان بھائی آتا ہے وہ اس کے اکرام و تعظیم کے لیے ایک تکبیر رکھ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکفیرت فرمادیتے ہیں؟
(اخرجہ الطبرانی)

لوگوں سے میل جول رکھنا،

منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا مانا آدمی تھا جس نے حکمت اور دانائی کی باتیں بہتیں موصافہ کتابیں لکھی تھیں۔

آخر کار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میرا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت بڑا اور جہے۔
اس زمانے کے پیغمبر پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔

”اس سے کہہ دو تو نے دہشتہ زمین پر اپنی شہرت کو بادی ہے۔ میں تیری کسی بات کو قبول نہیں کرتا۔“

اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا۔ اس خیال سے توبہ کی اور ایک انگ کوٹنے میں جا بیٹھا۔

اب اللہ تعالیٰ مجھ سے خوش ہو گیا۔
پھر فرمایا: ”میں اس سے رخصت ہوں۔“
وہ غلوت غلطی سے باہر آیا اور ناداروں میں جانا اور میل جول کرنا اور لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست اور کھانا پینا شروع کر دیا۔
اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔
”اب میں تجھ سے خوش ہوں اور تو نے مجھے پالیا ہے۔“

شہزادہ نے محنت کرنی شروع کر دی۔
تھوڑی ہی مدت میں وہ کتابیں پڑھتا اور خط لکھنے لگا۔ جس پر ماں نے اپنا سارا کتب خانہ اسی جھوٹے لڑکے کو ضائع دیا۔
یہ شہزادہ الفروذا اعظم تھا جو انگریزوں میں ایک مشہور عالم بادشاہ مکرزرا ہے۔

صبر
صبر کرنے اور صبر کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے
بے دل پر صبر کرنے کا ہر صبر کا دم مار کر چٹ سا رہ
لینا اہل الذکر جب کہ دودھو کرنا عالم متناکرانگیوں
میں آنسوؤں کی قلت ہو جانے کے بعد خاموشی اختیار
کر لینا مومن الذکر کے ذمے میں آتا ہے۔ صبر
کوئی کوئی کر لے صبر ہر ایک کو آجاتا ہے۔

قلامی کار شہ

قدت اللہ شہاب کہتے ہیں۔
”میں مصر میں تھا اور دیکھ کے لیے درخواست لکھی
تو ایک مصری انجمن نے مجھ سے پوچھا۔
”آپ پاکستانی ہو کر انگریزی میں درخواست
کیوں لکھتے ہو؟“

اس نے میری جواب طلبی کی۔ میں نے معذرت
کی کہ مجھے عربی نہیں آتی اس لیے درخواست انگریزی
میں لکھنا پڑی۔“

”آپ کی زبان کیا ہے؟“

”اردو“ میں نے جواب دیا۔
”پھر انگریزی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟“
”میرے قریبی رشتہ ہیں۔“
”اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں
یہ لکھ کر انگریزی کے ساتھ قلم غلامی کا
رشتہ ہے۔“

(شہاب نامہ)

محمان کا اکرام،

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ

نکال دینا

فانکھیل کراچی نمرہ ماقب گرین سٹی

اپنے خلاف شہر کے اندھے رجحان میں
دل کر بہت ملال مجھے دیکھ کر ہوا
یہ ہم بھی جانتے ہیں جدائی کے موڑ پر
اس دل کا جو بھی مال مجھے دیکھ کر ہوا

آڑے اعلان آگئے دہرہ
نکلتا میں داستان لہجوں کی
تیر کیسے نہ وہ دل میں آتے
جس کو چھوڑے کمان لہجوں کی

نوبہ کراچی

بھسکی رات ڈھل گئی محسن
اب تو دل سے کہو سنبھل جائے

بشری محسن کراچی

مجھے میری عمر کا خسارہ پڑھتے ہیں
یعنی کہ لوگ مجھے تمہارا پوچھتے ہیں

سحر کراچی

محنت کے سفر میں شرط یہ ہے
مکمل یہ بھنسنے ہوئے نہ پائے

ارم کمال کراچی

تم با فتنے اگر نہ عبادت کے واسطے
بیمار تم کو داس دوا بھی نہ آئے گی

نادرہ یاسر کراچی

دل سے تعلق کے بارے میں کبھی فرصت سے سوچ کرنا
الہجہ بڑا ہے یہ مسئلہ کتنے سال کا

ناہیدہ اسماعیل کراچی

تیں گھر حب دیر سے آتا ہوں تو بانی نہیں دیتی
پھر کبھی کبھی کے سارا سمندر کھول دیتی ہے

طوبی اظہر کراچی

تیرا آنا تو خواب تھا لیکن
ہم چراغوں کے ساتھ چلتے رہے
کیا بتائیں کہ اب کے سادوں میں
ہم تجھے کتنا یاد کرتے رہے

مساءہ سلیم کراچی

جب گئے مذاہب و دوام تھے وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے

سعدیہ لاہور

بے کپی ہی نہیں آداسی مجھے
تیرے یادوں کا ساتھ دیتی ہے

نشاہ لاہور

اس کے سبب جھوٹ چ سہی محسن
شرط اتنی ہے کہ وہ بولے تو سہی

ماہرندیم لاہور

کسی سے تیرے آنے کی سرگوشی کو سنتے ہی
میں نے کتنے پھول پھینے ادا اپنی شاخ میں رکھے

ندیم لاہور

تیرے وعدوں پر کہاں تک مراد فریب کھائے
کوئی ایسا کہ بہانہ مری آکس نوٹ کھائے

اقرا حیدرآباد

وہ بھول ہی تھا کہ ہر دوسرے تم گر کا
ہم اپنے آپ سے زیادہ خیال رکھتے تھے
اسی لیے میں حیرا شہر چھوڑ آیا ہوں
وہاں کے لوگ دلوں میں طالع رکھتے تھے

نفسہ یوسف کراچی

اگر ہے موت میں کچھ لطف تو بس اتنا ہے
کہ اس کے بعد خدا کا سراغ پائیں گے ہم

سحر احمد کراچی
 حقوڑا حقوڑا جھوٹ ملے اپنی پتی باتوں میں
 دردِ جھوٹے لوگوں میں تو کیسے غم گزارے گا
 شہر کے جہان ہے پر آئینے کے کمرے میں جاتا
 اپنا چہرہ دیکھ کے بچہ کو ہر کوئی پتھر مارے گا
 صائمہ احمد راولپنڈی
 تم ترکِ تعلقات کا ذکر کہیں نہیں کرنا
 میں لوگوں سے کہہ دوں گا نصرت نہیں ملتی
 سعیدہ اکلام مانسہرہ
 محبت میں کو کہتے ہیں قلیل اک ذات بگڑے بھی
 کریں جو میدان کے سامنے ذاتیں نہیں ہوتیں
 عنہ شعیب کراچی
 کوئی بھی پہل نہ کرے کی مثال بیٹھا تھا
 اپنا پرستے تھے وہ دلِ انعامت نہ ہوتی
 مایہ نغیس اسلام آباد
 آنی ہیں بدلتے ہوئے موسم کی ہوا میں
 دیتا ہے کوئی طرِ گزشتہ کو صدف میں
 گھٹ آئے ہیں گھرے اگلے دن جانمیں دوست
 کس دلیں سے ملے دوست اچھے دُشمن کی پیش
 ہیں کتول ماضی
 کہاں جاؤ گے مجھے جھوٹے میں یہ پوچھ رہے تھک گیا
 وہ جواب مجھ کو نہ دے گا، وہ تو خرد سرا پا سوال تھا
 وہ ملا تو صدف کے بعد بھی میرے لب پہ کوئی لہر تھا
 اسے میری چپ سے لہا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا
 نادیہ یاسر گجرات
 نہ پوچھا آج شب بھر کس قدم ہے آگاہ
 کہیں کہیں کوئی ستارے اندر کچھ بھی نہیں
 نظر دکھائی ہیں سینے نشانی میں جس کی
 وہ اک شکستہ کنارہ ہے یاد کچھ بھی نہیں
 نمرہ عاقب تریپتی
 دل نے اک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
 تو نے اک بات کہی، لاکھ فسانے نکلے
 میں نے اجداد سے بے واسطہ دکھائی ہیں
 وہ تو غریبوں میں بھی آہٹ کے پہلے نکلے

ملنی کونڈلی
 میں پہن رہا تو امدادِ فطرت نہیں
 وہ بھی سنا ہے اس نے جو میں نے کہا ہیں
 ماہ تور کراچی
 خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
 جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے برقع پر
 طائر، حرم گوجر
 رخصت ہوا وہ تو میں نے دیکھا
 بھول اتنے بھی خوش نما ہیں ہوتے
 لوبہ کونڈلی کرک
 تم اس شہر سے جانے لگو تو میرا آنکھیں بھی لیتے جانا
 کوئی سفر میں ساتھ رہے تو رستہ جلدی کٹ جائے
 طیب خان کراچی
 ہم سے بھی پوچھ لو، شب غم کس طرح کٹی
 تم نے تو کہہ دیا کہ ہمیں نیت آگئی
 لادیب کونڈلی
 میں نے جا بجا زخم بھر جائیں
 زخم ہی زخم بھر گئے، بھر میں
 پہلے اترا میں دل کے دریا میں
 پھر سمندر اتر گئے مجھ میں
 اقرا امین کراچی
 ہر دردِ محبت سے الگ تباہی غم ہستی
 کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تری آنی
 یہ بزمِ محبت ہے اس بزمِ محبت میں
 دلہن کی بھی شیدا، فرزانے بھی شیدا
 مددہ بول ملتان
 کوئی آیت ایسی مل جائے
 میں وہ کہ روزِ توحہ مل جائے
 مدیحہ نورین ملک گجرات
 تسبیح کے دالوں میں سداوند کی سورت
 ہونٹوں پہ میرے حرفِ مسلسل بے کرم ہو

رَدِّ

4۔ اپنی کوئی خوبی یا خامی؟

بات پر منہ پھول جاتا ہے۔ سبھی زیادہ عزت افزائی جب ماما سے یا کسی سے سبھی زیادہ عزت افزائی ہو جاتی ہے تو تمہارے دل میں کہ اب زیادہ نہیں بولوں گی (وہ الگ بات ہے کہ بہت جلد بھول جاتی ہوں)

5۔ شعاع کی پسندیدہ تحریر؟

شعبه شعاع نومبر 2022 216

1۔ شعاع سے تعلق کیسے بنتا؟

میزک کی چھٹیوں میں پرانے رسالے پڑھے
جن میں فریدہ اشفاق، سائرہ رضا، ثروت نذیر، نگہت
عبداللہ، ثمرہ بخاری، آسیہ رزاقی (ہا.....) فرحت
اشتیاق، نمرہ احمد، عمیرہ احمد اور بھی کئی پرانی رائیٹرز
سے مل کر اچھا لگا۔ اب بھی ہر مہینے رسالے کو پورا
چاٹ لیتی ہوں۔

2۔ دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟

میری صبح کالج کے وقت سات بجے ہوتی ہے۔
 میں سینکڑا ایئر شیٹیں بناتی ہوں۔ بارہ بجے کالج سے
 آتی، نماز پڑھی، کالج کا کام کیا اور فری ہو کر شام کے
 وقت چائے پیتے۔ اتنے ساتھ رسالوں کو بھی انجوائے
 کرتی ہوں۔

الحمد للہ نمازیں ساری پڑھتی ہوں۔ اور بس
باقی پورا دن اپنے بہن بھائیوں سے لوگ جموٹک چلتی
رہتی ہے جو کہ زندگی کا ایک حصہ ہے۔

3۔ افسانوی دنیا کیسی لگتی ہے؟

افسانوی دنیا ہی تو میری موٹ فیورٹ ہے۔

کا "دل پھولوں کی ہستی" اور باقی بھی بہت سی رائٹرز کی تحاریر دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں۔

6۔ بارش کیسی لگتی ہے؟

مجھے بارش بہت پسند ہے۔ سادوں کی برسات تو بہت لمبائی ہے۔ لیکن جب بارش کے بعد جس ہو جاتا ہے وہ مجھے بالکل نہیں پسند۔ جب بھی بارش ہوتی ہے تو میں پکڑے، چپس اور چائے لازمی پیتی ہوں۔ اور ماما کے ہاتھ کے میٹھے مال پورے بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ مجھے بارش میں نہانے سے زیادہ بارش کو دیکھنا پسند ہے۔

7۔ اقتباس پسند یہ؟

"اپنی اہمیت جتانے کے لیے کسی سے دور ہونا ضروری ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ وہ آپ کے بغیر جینا ہی سکے۔"

8۔ پسندیدہ شعر؟

شعر تو بہت سارے ہیں ہاں البتہ ایک نظم پیش کر رہی ہوں۔

میرے وہم سے میرے گمان تک

یہ مرحلہ وفا کا تھا

میری طلب سے میرے نصیب تک

یہ معاملہ خدا کا تھا

جو ہم محسوس کرتے ہیں

اگر تم تک پہنچ جاتے

تو بس سمجھ لیتا

بیان جذبات کی خوشبو ہے

جنہیں ہم کہہ نہیں سکتے

مگر تم جو دو اجازت

تو چہرہ لفظوں میں کہہ ڈالیں کہ

تم بن مروت ہو سکتے ہیں

مگر تم بن جی نہیں سکتے

اس کارجنوں میں.....

بشریٰ رضوان..... چوک شاہدرہ بہاولپور

س: شعاع کتب پڑھنا شروع کیا؟

ج: میرے بابا مجھے کتابی کٹرا کہا کرتے تھے جہاں تک ڈائجسٹ کی بات ہے کم عمری میں پڑھنا شروع کیا جب میں ساتویں کی طالبہ تھی۔ تب سے آج تک شعاع، خواتین، کرن اور بھی کافی پڑھے ہیں جو بھی مل جائے کیونکہ سب وقتوں سے آتے تھے تو آرام سے پڑھ لیتی تھی کیونکہ بابا اس فیلڈ سے تعلق رکھتے تھے تو کبھی مشکل نہیں ہوتی کہ منگوانا ہے یا کسی کی منت کرنی پڑے لا کر دو۔

پھر میری بہن کی دوست شرمین بھی بھیجا کرتی تھی ڈائجسٹ تو میں پڑھ لیتی تھی، لوگوں کی باتیں بھی سنیں کہ ڈائجسٹ پڑھنا اچھا نہیں ہوتا وغیرہ۔ اس طرح کی تنقید بھی سننے کو ملی مگر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ کبھی بابا نے منع کیا۔ انسان خود اچھا ہو تو سب اچھا ہوتا ہے۔ سبق اور نصیحت آموز کہانیاں ہوتی ہیں انسان کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

س: دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟ کیا معمولات ہیں؟

ج: ویسے تو الحمد للہ میں تہجد پڑھنے کی عادی ہوں۔ دن کا آغاز فجر سے ہوتا ہے نماز کے بعد قرآن کی تلاوت چاہے ایک رکوع یا آدھا۔ دو آیت ہو لازمی پڑھنے کا معمول ہے۔ یہ عادت بچپن سے ہی ہے میں نویں میں تھی۔ تب قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پڑھی پھر اس کے ساتھ عالمہ کا کورس، دسویں کے امتحان کے بعد شروع کیا تھا۔ رات کسی کام یا مہمانوں کی وجہ سے دیر سے سو جاؤں مگر صبح آنکھ اپنے وقت پر ہی کھلتی ہے۔ بچپن سے سحر خیز ہوں۔ پرندوں کی آواز، ٹھنڈی ہوا سورج کی پہلی کرن بہت سکون دیتی ہے۔ میں اور میرے بابا کتنی سردی ہو یا گرمی ہر چیز کا لطف لیتے تھے۔ وہ ذکر اذکار بھی کرتے تھے۔ اللہ کی حمد بیان کرتے تھے۔ اب ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ناشتا اور دوپہر کا کھانا میرا کام ہے۔ ناشتا بنا کر دوپہر کا کھانا بنانا، اقرائے ذمے گھر کی صفائی،

شعاع نومبر 2022 217

ڈائجسٹ ان کا موسٹ فیورٹ تھا۔

س: آپ کی خوبیاں؟

ج: بہت حساس ہوں، کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ چاہے اپنے ہوں یا غیر، خوش اخلاق ہوں، ہر رشتہ نگار ہو کر بھائی ہوں ہر بات برداشت کر جاتی ہوں اللہ نے صبر بھی دیا ہے۔ میں اپنے معمولات اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں، بے شک وہ بہتر اجر دینے والا ہے اور میں نے دیکھا ہے۔ اللہ کے حوالے کر دو وہ ضرور سنتا اور دکھاتا ہے۔

س: آپ کی خامیاں؟

ج: سب سے بڑی خامی یہ کہ اگر کسی کی بات بری لگ جائے دل کو تو قطع تعلق کر لیتی ہوں برداشت کروں تو بڑی بڑی باتیں سہہ جاتی ہوں۔ اگر دل کسی بات پر دکھ جائے تو چھوٹی سی تنقید یا بات ہی کافی ہے۔ لڑنے یا بولنے سے بہتر ہے انسان خاموشی سے الگ ہو جائے دوسروں کی حق تلفی برداشت نہیں ہوتی۔ اپنی ذات کے لیے بھی کسی سے بدتمیزی نہیں کرتی میں۔ سب کو یہ ہی عادت بری لگتی ہے کہ قطع تعلق کرنے سے پہلے انسان بتا دے کون سی بات بری لگی ہے اس طرح چپ مت رہا کرو۔

س: پسندیدہ شعر؟

”ہمیشہ ہی نہیں رہتے سبھی چہرے نقابوں میں
سب ہی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر“

س: پسندیدہ کتاب؟

ج: قرآن کریم، احادیث کا مطالعہ، قرآن مجید ہم سے کیا کہتا ہے یہ سمجھنے کے لیے اس کا ترجمہ اور تفسیر کی ہے۔ ویسے بے شمار ناؤز، کہانیاں بچوں کی بڑوں کی پڑھ چکی ہوں، نمل، حیر کامل، جنت کے پتے، عالم، شام رنگ سیاہ، شہزاد، یار و لدار، عسریہ راجہ گدھ، طاہر لاہوتی موسٹ فیورٹ ہیں۔

☆☆

برتن دھونے، سعدیہ کے ذمے شام کی روٹی بنانا، دودھ، سالن گرم کرنا اور سب کو کھانا دینا۔ برتن دھونا تھا۔ اب جب ان کی شادی ہو گئی ملتان، تو سارے کام میرے ذمے ہیں۔ امی ہیلپ کر دیتی ہیں تھوڑی، امی کو دل کا مسئلہ ہے تو ان سے نہیں کرواتے ہم کام مگر سعدیہ اور اقرا کی شادی کے بعد وہ کر رہی دیتی ہیں، پہلے ہم بہن بھائی پڑھنے جاتے تھے بابا کام پر تو صرف امی گھر میں ہوتی تھیں۔

س: سالگرہ مناتی ہیں؟

ج: جی ہاں مناتی ہوں گھر میں سب کی ہی منائی جاتی ہے۔ اگست میں سعدیہ اور بشر کی۔ نومبر میں اقرا اور سنی کی۔ جون میں سہج کی اور 19 مارچ کو میری سالگرہ کا دن ہے۔ 20 جون امی بابا کی ویڈیو ایوورسری ہوتی ہے تو مناتے ہیں، آج کے مصروف دور میں یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں، جن میں انسان وقت نکال کر اپنوں کے ساتھ مل کر بیٹھتا ہے ورنہ آج کل رابطے سوائے موبائل ہوتے ہی نہیں پھر برتھ ڈے پر دوستیں بھی آتی ہیں۔ شہرین کا خاص طور پر شکر یہ ادا کرتی ہوں۔ اس کو میری برتھ ڈے یاد رہتی ہے جبکہ میں اس کی سالگرہ کا دن ہمیشہ کی طرح بھول جاتی ہوں۔ یادگار سالگرہ ایک وہ بھی جب کلثوم اسماعیل اور کرن نسیم نے آکر اچانک سر پرانز دیا تھا۔ اللہ ان دونوں کو اپنے گھر میں خوشیاں نصیب کرے۔ زندگی صحت اور کامیابی عطا کرے۔ اس کے بعد جو یہ گزری ہے 19 مارچ بابا کے ساتھ لاسٹ سالگرہ منائی تھی 8 اپریل کو ان کی ڈیڑھ تھہ ہوئی ہے اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔

س: پسندیدہ اشعار؟

ج: مجھے غزل یا اشعار پسند ہیں۔ شاعروں میں علامہ اقبال، غالب، احمد فراز، وحی شاہ، پروین شاکر۔ جون ایلیا پسند ہیں۔ مجھے ان کی شاعری ابھی لگتی ہے میرے بابا کو بھی شاعری پسند تھی بہت اور اردو

دستک دنگ دنگه

شاہین رشید



”کیا حال ہیں؟“
”الحمد للہ۔“

”ریکارڈنگ تو کافی عرصہ چلی..... اور ظاہر ہے کہ فیملی تو ڈسٹرب ہوئی ہی ہے۔ آپ یقین کریں کہ جو عیدیں گزری ہیں، ان میں میں اپنے گھر نہیں جا سکا۔ اور گھر والوں کو پراپر ٹائم نہیں دے سکا۔“
”جیگم تو ناراض ہوئی ہوں گی؟“

”جی نہیں بالکل نہیں..... کیوں کہ میری جیگم کو معلوم ہیں اس فیلڈ کی نزاکتیں اور زندگی تب ہی اچھی گزرتی ہے جب آپ ایک دوسرے پر اعتبار کریں۔ اسے معلوم ہے کہ میرا کام مشکل ہے۔“

”بالکل میں نے دیکھا ہے کہ آپ کے زیادہ تر ڈرامے ”اے آر وائی“ سے نشر ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”وہ بالکل سی“ کی کامیابی پر مبارک باد قبول کریں امید تھی کہ اتنا زیادہ ہٹ ہوگا یہ ڈرامہ؟“
”مبارک باد کا شکر..... امید پر ہی سارے کام ہوتے ہیں اور جب مجھے یہ کردار آفر ہوا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے کردار سے لوگ محبت کریں گے۔ دو ہی تو کردار ہوتے ہیں جنہیں لوگ پسند کرتے ہیں یا ٹھیکو یا پھر پوزیٹو..... تو وہاں سے لوگوں نے نفرت کی اور ذہن سے محبت۔“
”کتنا عرصہ چلی ریکارڈنگ اور فیملی ڈسٹرب ہوئی؟“

ماہنامہ شعل نور نمبر 219 2022

شکر ہے کہ سب کو میری پرکار منس پسند آئی اور سلسلہ چل پڑا۔

”آپ نے بی بی اے کیا ہے۔ اس فیلڈ میں آنے پر گھر والوں نے کچھ کہا؟“

”میں الحمد للہ..... گھر والوں نے بہت سپورٹ کیا اور اب بھی کرتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں کب کہاں جنم لیا وغیرہ وغیرہ.....؟“

”جی..... بالکل میرا پورا نام تو سعد علی قریشی

ہے اور چونکہ پیار کرنے والے بہت ہیں تو سب اپنے حساب سے میرا نام لیتے ہیں جسے ہم پیار کا نام دیتے ہیں۔ تو زیادہ تر لوگ مجھے ”سعد“ کہتے ہیں اور اپنی ڈیٹ آف برتھ ضرور بتاؤں گا۔ میں 9 اکتوبر

1991ء میں پیدا ہوا اس لحاظ سے میرا ستارہ لبر ہے اور میری مادری زبان ہراییکی ہے۔“

”سرائیکی آپ کی اردو تو بہت صاف ہے؟“

”جی..... ساری تعلیم اور بول چال چونکہ اردو میں ہی ہوئی ہے تو اس لیے میری اردو صاف ہے۔“

”اور بہن بھائی کتنے ہیں آپ کے؟ اور اپنی کون سی بات اچھی لگتی ہے۔ اور کون سی بری؟ اور شادی ہوئی؟“

”ہم چار بھائی ہیں اور میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اپنی ایک عادت بری لگتی ہے کہ میں اپنے لباس کا خیال نہیں رکھتا۔ دوسری ٹائپ میں آپ مجھے

تھوڑا الٹک ٹائپ بندہ کہہ سکتی ہیں۔ اور الحمد للہ شادی شدہ ہوں۔“

”اس فیلڈ میں آپ کس کے فین ہیں۔ جبکہ آپ کے فین تو بہت ہوں گے؟“

”مجھے نور حسن، یمنی زیدی اور ماہرہ خان بہت پسند ہیں۔“

”بہت شکر..... ان شاء اللہ جلد آپ کا تفصیلی

انٹرویو بھی کروں گی۔

☆☆

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ درحقیقت اے آر وائی کا کاسٹینٹ بہترین ہوتا ہے۔ میرا پہلا ڈرامہ

”پکار“ اگرچہ ”جو“ کا تھا مگر اتفاق ہے کہ میں نے زیادہ ڈرامہ سیریل اے آر وائی سے ہی کیے اور پکار

سے پہلے بھی ایک سیریل ہوا تھا ”تیری میری جوڑی“ جو ”زنی زندگی“ سے ہوا تھا۔“

”شہرت کس نے دی؟ مطلب کس ڈرامہ نے دی؟“

”مجھے ہر سیریل نے شہرت دی۔ لیکن چونکہ ”پکار“ تیری میری جوڑی“ پہلے پہلے ڈرامے تھے تو

انہوں نے مجھے پہچان دی اور جس پہچان سے آپ کا کام چلے اے آر وائی میرے خیال سے شہرت کہا جاتا ہے۔“

”خدا اور محبت کا تجربہ کیسا رہا تھا؟“

”وہ 2011ء اور 2017ء میں ہوا تھا۔ اچھا رہا تھا مگر اس وقت میں اتنا زیادہ پیو نہیں تھا۔“

”اب تک کتنے ڈرامہ سیریل کر چکے ہیں۔ سب سے بہترین کس کو کہیں گے؟“

”میرے لیے سب ہی بہترین رہے۔“

”اولاد کی طرح؟“

”ہاں ہاں..... جی جی..... میں اپنے کسی بھی ڈرامے کو کمزور یا برا نہیں کہہ سکتا..... اور جب ڈرامہ

آن ایئر ہوتا ہے تو سب کی رائے اور ریٹنگ سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتنا پسند کیا جا رہا ہے۔“

”ریٹنگ صحیح ہوتی ہے؟“

”اندازہ ہو جاتا ہے کہ ریٹنگ صحیح ہے یا غلط۔ لوگوں کی فیڈ بیک بتا دیتی ہے کہ سیریل مقبول ہو رہا ہے یا نہیں۔“

”وہ پاگل سی“ میں آپ کو بہت زیادہ سیلف میڈ دکھایا گیا ہے۔ اصل میں بھی ایسے ہی ہیں؟“

”بالکل جی..... بالکل میں ایسا ہی ہوں۔“

”لی وی پی آء کیسے ہوئی؟“

”ٹیلنٹ ہسٹ کے ذریعے آمد ہوئی، پھر اللہ کا

حضرت حوا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کیا کہ میرے خواب میں کوئی آیا اور اس نے اس طرح کی باتیں کہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ شیطان تھا۔ تم اس سے بچ کر رہنا۔ یہ ہمارا دشمن ہے جس نے ہمیں جنت سے نکلوا یا تھا۔ پھر حضرت حوا کے پاس شیطان دوبارہ آیا اور اس نے اسی بات کا اعادہ کیا۔ حضرت حوا نے ہائی بھری۔ لہذا جب وضع حمل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے سلامتی کے ساتھ بچے کو پیٹ سے نکال دیا تو حضرت حوا نے وعدے کے مطابق بچے کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔

سہی سے مروی ہے کہ حضرت حوا کا ایک بیٹا ہوا۔ ان کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ اس نام عبدی رکھو ورنہ میں اس کو قتل کر دوں گا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا۔ ”میں نے تمہاری بات مانی تھی جس کے نتیجے میں مجھے جنت سے بے دخل کر دیا گیا۔“ بحث و تکرار کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام نے شیطان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور بچے کا نام عبد الرحمن رکھا۔ پس ابلیس لعین نے اس بچے کو قاتل کر کے قتل کر دیا۔

پھر جب دوسرا بچہ پیدا ہوا تو شیطان نے پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ مگر حضرت آدم نے اس مرتبہ جی شیطان مردود کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور نو مولود کا نام صالح رکھا۔ شیطان نے اس بچے کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد جب تیسرا بچہ پیدا ہوا تو شیطان نے کہا۔

”تم صرف اس صورت میں اپنے بچے مجھ سے

آدم علیہ السلام کے بیٹوں کے نام

- 1- قین 2- ہاتل 3- شیث 4- لباد 5- باخ 6- اٹلی 7- توبہ 8- ہان 9- شوبہ 10- حیان 11- فرائیں 12- ہذر 13- سکود 14- سندل 15- باریق

آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے نام

- 1- لہما 2- لیوذا 3- اشوت 4- حوزہ
- حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت حوا سے حضرت آدم علیہ السلام کے جواد لاد ہوتی تو انہیں اللہ تعالیٰ کا عہد قرار دیا جاتا، اور ان کے نام عبد اللہ، عبید اللہ وغیرہ رکھے جاتے لیکن ان کی بہت جلد وفات ہو جاتی۔ ابلیس لعین ان دونوں کے پاس آیا اور کہا کہ اگر تم ان بچوں کے نام اس کے علاوہ رکھو جو کہ اب رکھتے ہو تو یہ زعمہ رہیں گے اس کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آدم و حوا نے عبدالحارث رکھا۔

حضرت حوا جب پہلے بیٹے کے ساتھ حاملہ ہوئیں اور انہوں نے بوجہ تحسوس کیا۔ ابلیس لعین ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”اے حوا تمہارے پیٹ میں کیا ہے؟“

انہوں نے کہا ”مجھے کیا معلوم کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے نکلے گا؟ تاک سے یا کان سے؟“

انہوں نے کہا ”میں نہیں جانتی۔“ ابلیس لعین نے کہا۔ ”اگر صحیح سلامت نکل آیا تو کیا تم میری بات مانو گی اور جو میں کہوں گا اس پر عمل کروں گا۔“ حوا نے حامی بھری۔ ابلیس نے کہا کہ اس نام عبدالحارث رکھنا (ابلیس لعین کا اصل نام حارث تھا)۔

بجائے ہو کہ آئندہ ہونیوالے نبی کا نام عبدالحارث ہو (ابلیس کا پہلا نام حارث تھا) ابلیس تو مردود ہونے کے بعد نام دیا گیا۔

یہ تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت آدم و حوا کی بعض اولاد کی وفات ان سے پہلے ہو چکی تھی اور اس باب میں اس کے علاوہ بھی متعدد روایات حسن کی تردید کر رہی ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ زمین پر سب سے پہلی وفات آدم علیہ السلام کی ہوئی۔

حضرت آدم علیہ السلام کا جانشین

حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سو میں سال ہونے کے بعد حضرت حوا کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور قاتل و ہاتل کے واقعہ کے پچاس برس بعد کا واقعہ ہے۔ اہل تورات کہتے ہیں کہ یہ بیٹا تنہا پیدا ہوا اور شیث کے معنی ان کے ہاں بہتہ اللہ اور شیث ہاتل کے بدل کے طور پر تھے جیسے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ حوا کے لطن سے شیث بائی لڑکا اور غرور نامی لڑکی پیدا ہوئی۔ اس لڑکے کی پیدائش پر حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا تھا کہ یہ اللہ کا عطیہ (بہتہ اللہ) ہے جو ہاتل کا بدل ہے۔ اس لفظ کو عربی میں شیث، سریانی میں — اور عبرانی میں شاث کہتے ہیں۔ ان ہی کو آدم علیہ السلام کا جانشین بنایا گیا۔ ان کی پیدائش کے وقت حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سو میں برس تھی۔

محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے شیث کو بلایا اور اس سے عبد لیا اور دن رات کی گھڑیاں اور اوقات سکھائے اور ہر ساعت میں کسی نہ کسی مخلوق کا عبادت کرنا بتلایا۔ یعنی ہر گھڑی

کوئی نہ کوئی مخلوق عبادت الہی میں مصروف ہوتی ہے اور فرمایا۔ ”کہ ابے میرے عزیز بیٹے اعتقرب زمین میں طوقان آئے گا اور وہ سات سال ٹھہرے گا اور ان

کو وصیت لکھوائی۔ پس حضرت شیث علیہ السلام اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے ولی اور جانشین ہوئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد ساری حکومت و بادشاہت ان ہی کے لیے ہو گئی۔

اس وقت تمام بنی آدم حضرت شیث علیہ السلام کی ہی اولاد ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ شیث کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمام نسل فنا اور ختم ہو گئی اور ان میں سے کوئی باقی نہ رہا صرف شیث کی نسل چلی لہذا اب تمام لوگ شیث کی ہی اولاد سے ہیں۔

آدم علیہ السلام کی عمر

حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق اہل علم کے درمیان معمولی اختلاف ہے اور اس مسئلے میں جو احادیث ملتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں اپنی طرف سے روح پھونکی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے سجدہ کیا۔ آدم علیہ السلام بیٹھ گئے۔ ان کو چھینک آئی۔ انہوں نے الحمد للہ کہا۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: ”(تیرا رب تجھ پر رحم کرے۔“ اور یہ بھی فرمایا ”کہ فرشتوں کی اس جماعت کے پاس جاؤ اور انہیں السلام علیکم کہو۔“ پس وہ فرشتوں میں آئے اور انہیں سلام کیا انہوں نے جواب میں علیکم السلام ورحمۃ اللہ کہا۔

پھر آدم علیہ السلام اپنے رب کی جانب لوٹ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تیرا اور تیری اولاد کا آپس میں ملنے وقت کا سلام ہو گا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے دو مٹھیاں بھریں اور فرمایا کہ ان میں سے ایک کو اختیار کر لے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو اختیار کیا (چپ) اور اس کے تو دو ٹکڑے ہیں بائیں ہاتھ میں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے وہ مٹھی کھولی تو اس میں آدم علیہ السلام کی

تمام اولاد کی صورت تھی اور ہر آدمی کے پاس اس کی مدت عمر بھی لکھی ہوئی تھی اور آدم کی عمر ایک ہزار سال درج تھی۔ ان میں ایک جماعت انتہائی نورانی صورت تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا۔
 ”اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں جن پر نور چھایا ہوا ہے۔“

فرمایا: ”یہ نبیوں اور رسولوں کی جماعت ہے جو میرے بندوں کی طرف بھیجے جائیں گے اس جماعت میں ایک صاحب نورانیت میں کچھ زیادہ نمایاں تھے مگر ان کی عمر صرف چالیس سال لکھی ہوئی تھی۔“

آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے میرے رب! یہ کون سا نبی؟

فرمایا: ”یہ تمہارا بیٹا داؤد ہے۔“

عرض کیا۔ ”اس کی عمر صرف چالیس سال۔“

فرمایا: ”یہی اس کی تقدیر میں لکھا ہے۔“

آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ ”اے میرے رب! میری عمر میں سے ساٹھ سال کم کر کے انہیں دے دیجئے۔“

رسول ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں ٹھکانا عطا فرمایا پھر زمین کی طرف اتار اور عرصہ دراز گزر جانے کے بعد جب ملک الموت ان (آدم) کی روح قبض کرنے آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے ملک الموت! کیا تم میرے پاس قبل از وقت (جلدی) نہیں آگئے؟“

ملک الموت نے کہا۔ ”میں نے ایسا نہیں کیا۔“

آدم نے کہا۔ ”کیا ابھی میری عمر میں ساٹھ سال باقی نہیں ہیں؟“

ملک الموت نے کہا۔ ”آپ کی عمر میں کچھ باقی نہیں ہے کیونکہ آپ نے اپنے رب سے درخواست کی تھی کہ میری عمر میں سے ساٹھ سال کم کر کے میرے بیٹے داؤد کو دے دیے جائیں۔“

آدم علیہ السلام نے کہا۔ ”میں نے ایسا نہیں کہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”آدم علیہ السلام بھول گئے اور ان کی اولاد بھی اسی طرح بھول جاتی

ہے۔ آدم علیہ السلام نے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی اسی طرح انکار کرتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لکھی ہوئی کتاب رکھے گا اور گواہوں کے ساتھ فیصلے فرمائے۔“

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی وفات سے قبل گیارہ دن تک بیمار رہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے شیث علیہ السلام کو اپنا وصی بنایا اور ان کے لیے ایک وصیت نامہ لکھوایا اور وہ کتاب جس میں وصیت لکھی گئی تھی۔ وہ اپنے شیث کے سپرد کی اور اسے قاتل اور اس کی اولاد سے چھپا کر رکھنے کا حکم دیا کیونکہ قاتل نے حسد کی وجہ سے قاتل کو قتل کر دیا تھا۔ پس شیث اور ان کی اولاد نے اس علم کو جو ان کے پاس تھا قاتل اور اس کی اولاد سے چھپا کر رکھا اور یوں قاتل اور اس کی اولاد اس سے محروم رہے۔

اہل تورات کا یہ دعویٰ ہے کہ آدم علیہ السلام کی عمر نو سو تیس سال تھی اور ابن عباس کی روایت کے مطابق ان کی عمر نو سو پچیس سال تھی۔

آدم کی تجہیز تکفین

ابن اسحاق سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام وصیت نامہ لکھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے) ان کی وفات پر رشتہ دار جمع ہوئے اور آباء اجداد کی وصیتوں کی مخالفت کا ارادہ کیا مگر جب یہ خبر برہنہ ہوئی تو یہ سب سمجھا کر اس ارادے کو ترک کر دینے کو کہا مگر انہوں نے کچھ نہ سنا اور سرکشی دکھائی اور قاتل کی اولاد کے پاس پہنچ گئے اور جب ان کی ایجاد کردہ چیزوں کو دیکھا تو حیرت زدہ ہو گئے گانے بجانے کے آلات نے انہیں بہت متاثر کیا اور انہوں نے قاتل کی اولاد میں سے ان عورتوں سے موافقت کر لی جو ان کی طرف مائل ہو رہی تھیں اور پھر وہ ان کے ساتھ چلی گئیں یہاں تک کہ سرکشی اور نافرمانی میں مشغول ہو گئے۔ شراب نوشی اور بدکاری کھل کر سامنے آ گئی۔

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

بٹر چکن بریانی

پسے لٹا کر اور لال مرچ ڈال کر بھونیں اور ڈھک کر دس منٹ پکالیں۔ اب اس میں ایک چائے کا چمچ گرم مسالا، قصوری میتھی اور نمک شامل کر کے دو سے تین منٹ پکائیں۔ پھر اس میں تیار چکن، کریم اور شہد ڈال کر کس کر لیں۔ اس کے بعد آدھے چاول اور چکن شامل کر کے، ایک کھانے کا چمچ ہر ادھیا، پودینے کے پتے، باقی گرم مسالا اور آدمی ملی پیاز ڈالیں۔ اب اس میں باقی چاول، ہر ادھیا، اور ک اور ملی پیاز شامل کریں۔ پھر اس میں مٹی اور کیوڑا ڈال کر ڈھکیں اور اسے دھیمی آگ پر چند رو منٹ پکالیں۔ آخر میں بٹر چکن بریانی کو سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

فرائیڈ چکن

اجزاء:
چکن
لال مرچ
گرم مسالا
انڈا
کارن فلور
کھانے کا لال رنگ
لیموں کا رس
تیل
نمک
ہر ادھیا
ہری مرچیں
لہسن
ادریک
ترکیب: سل یا گرائنڈر میں ہر ادھیا، ہری مرچیں، لہسن، ادرک، مسالا حسب ضرورت پانی ڈال

اجزاء:
سندوری چکن
اچھے ہوئے چاول
تیل
نمک
کٹی ہوئی مرچیں
کٹی ادرک
جاوتری
خمبولی لاہجی
پیاز
ادریک لہسن
لٹا کر

اجزاء:
ایک چائے کا چمچ
ذیرہ چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
دو کھانے کے چمچ
ایک کھانے کا چمچ
دو کھانے کے چمچ
آٹھ سے نو عدد
ایک کپ
نہ سے چار کھانے کے چمچ
حسب پسند
ترکیب: سندوری چکن تیار کر لیں۔ تیل اور نمک گرم کر کے ہری مرچیں اور ادرک ڈال کر ہلکا سا تیل لیں۔ پھر اس میں پسپی جاوتری، ہری لاہجی اور پیاز شامل کر کے ہلکا سا فرائی کریں۔ اس کے بعد ادرک لہسن،

جتنی بہتہ شعلیٰ نومبر 2022

کر چیں لیں۔ بغیر مڈی چکن میں نمک، پسا ہوئی لال
مرچ، گرم مسالا اور لیموں کا رس شامل کر کے دو گھنٹے
میری نیٹ کریں۔ اس کے بعد کھانے کا لال رنگ،
اٹا اور کارن فلوئڈ ڈال کر گرم تیل میں ڈیپ فرائی
کر لیں۔ آخر میں ڈرائی فریڈ چکن کو گرم گرم سرد
کریں۔

دہی بوٹی

اجزاء:

گائے کا گوشت
لال مرچ
پیاز
ہری مرچیں
ادرک لہسن
دہی
نمک
تیل

ترکیب: بڑے پیالے میں گوشت، پیسی ہری
مرچیں، ادرک لہسن، پیاز، لال مرچ اور نمک ڈال کر
کس کر کے دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اس میں
دہی شامل کر کے اچھی طرح ملا کر ایک گھنٹے کے لیے
رکھ دیں۔

کسی برتن میں تیل گرم کر کے گوشت ڈال کر
درمیانی آنچ پر ڈھک کر بیس منٹ پکائیں۔ مسالا
خشک ہو جائے تو بھون کر چوبے سے اتار لیں۔

ٹماٹر پالک

اجزاء:

چکن
ٹماٹر
گرم مسالا
پیاز
نمک
دہی

آدھا کلو
تین عدد
آدھا چائے کا چمچ
ایک عدد
حسب ذائقہ
آدھا کپ

لہسن ادرک

پالک

ہلدی

لال مرچ

ایک چائے کا چمچ

آدھا کپ

چوتھائی چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ترکیب: ساس چین میں تیل گرم کر کے پیاز
فرائی کریں۔ سنہری ہو جائے تو چکن شامل کر کے اتنی
دیر بھونیں کہ پانی خشک ہو جائے۔ دہی، لہسن ادرک،
ہلدی، لال مرچ، گرم مسالا ایک کپ پانی اور نمک
شامل کر کے ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔
گوشت گل جائے تو پالک شامل کر دیں۔ دس منٹ
دم پر رکھ دیں۔ پالک اور چکن یک جان ہو جائیں تو
چوبے سے اتار لیں۔

ایک رسک فیرنی

اجزاء:

دودھ
لے چاول
چکنی
الابچی
ایک رسک
بادام
جامدی کا ورق

دیر ۱۰ کلو
آدھا کپ
آدھا کپ
چار عدد
پانچ عدد
دو کھانے کے چمچ
گارش کے لیے

ترکیب: ساس چین میں دودھ اٹالیں پھر
چاول، ایک رسک اور آدھا کپ دودھ ڈال کر بیس
اس کے بعد اس کچھر کو باقی اچھے ہوئے دودھ میں
شامل کر کے گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اب اس میں
چکنی اور پیسی الابچی ڈال کر کس کریں۔ فیرنی کو
سردیگ ڈش میں نکال کر کٹے ہوئے بادام اور چامدی
کے ورق کے ساتھ گارش کر دیں۔

☆☆

گرفتار نظر آتی ہیں۔ ایسی خواتین جانے کے استعمال شدہ فی جیکس کو فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر کے آنکھوں پر دس پندرہ منٹ تک رکھیں سوچی ہوئی پڑ مردہ آنکھوں کو فوری سکون ملے گا اس کے علاوہ ایسے آبی بام اور آبی کریم کا استعمال بھی موثر و مفید ثابت ہو سکتا ہے جس کے اجزاء تریبی میں وٹامن E شامل ہو۔

پاؤں کو توجہ دیں

نیم گرم پانی میں نمک، ڈیٹول اور شیپو ملا کر جس منٹ تک پیروں کو اس میں ڈبوئے رکھیں۔ اس کے بعد پیروں کے ناخنوں پر صابن لگا کر نیل برش سے انہیں صاف کریں اور ایڑیوں پر فٹ اسکرپیر یا جھانوا رکھ کر نرم ہو جانے والی مردہ کھال کو رگڑ کر صاف کریں۔ اس کے بعد کسی اچھی سی مساج کریم سے پیروں کا اچھی طرح مساج کریں اور دس منٹ تک پیروں کو پرسکون حالت میں رکھنے کے بعد بنا چیل پہنے گھر کے اندر ہی فرش پر چیل قدمی کریں، یہ پیروں کے پٹھوں کو سکون بخشنے والی ایک بہترین ورزش ہے۔

بہتے میں 1-2 مرتبہ اس پر ضرور عمل کریں۔
صحت بخش غذاؤں اور مائعات (مشروبات) کو اپنی روٹین کا حصہ بنائیں۔ پھلوں و سبز یوں گرین ٹی، دودھ، سی، سوپ اور چینی کا شمار ان صحت بخش مائع غذاؤں میں کیا جاتا ہے جن کی نظام ہاضمہ میں انجذاب کی صلاحیت بہت تیز ہوتی ہے۔ اسی لیے ٹھوس غذا کی نسبت مائع غذا استعمال کرنے والی خواتین کی جلد زیادہ روشن اور تروتازہ محسوس ہوتی ہے۔

ورزش بھی ضروری ہے

جلد توانا اور صحت مندر رکھنے کے لیے چیل قدمی اور ایکسرسائز کو اپنے یومیہ معمول کا لازمی حصہ بنالیں۔

فیس ماسک

جلد کو خوب صورت بنانے کے لیے آپ اپنے کچن میں موجود اجزاء سے بہترین فیس ماسک بنا سکتی ہیں۔ اگر آپ خشک جلد کی مالک ہیں تو دہی میں شہد اور چند قطرے روغن بادام ملا کر۔ جس منٹ کے لیے چہرے پر لگائیں اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں۔ سورج سے چھلکی ہوئی جلد کے لیے گھماڑ کے رس کو ٹھنڈا کر کے چہرے پر لگائیں۔ اس کے علاوہ گائے ا بکری کے کئے دودھ کو ٹھنڈا کر کے چہرے پر لگانے سے بھی بہت سکون ملتا ہے اور جلد کی تروتازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ چکنی جلد کی حامل خواتین، انڈے کی سفیدی میں لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں اور پندرہ بیس منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں۔ ٹارل جلد کی حامل خواتین بچتے کے پیسٹ میں شہد ملا کر چہرے پر لگائیں۔ مکمل مہاسوں کی پریشانی کا شکار خواتین ایلو ویرا کے پیسٹ میں گھیرے کا رس ملا کر چہرے پر فیس پیک لگائیں یا درمیں کسی بھی قسم کا ہرمل یا فروٹ فیس پیک براہ راست چہرے پر لگانے سے مکمل اسے اپنے پیروں یا ہاتھوں کی سخت جلد پر تھوڑی مقدار میں لگا کر چیک کریں تاکہ اگر کسی بھی غذائی جز سے آپ کی جلد حساسیت (الرجی) کا شکار ہو تو مذکورہ اشیاء سے تیار فیس پیک چہرے پر لگانے سے مکمل ہی آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے تاکہ آپ کسی بھی بڑے نقصان سے محفوظ رہ سکیں۔

آنکھیں

کھانا پکاتے ہوئے، دیر تک بڑھائی کرتے ہوئے میک اپ کے بے تحاشا استعمال کی وجہ سے رات دیر سے سونے کی وجہ سے اور بے خوابی کی شکار خواتین بھی سہلی ہوئی پڑ مردہ آنکھوں کی پریشانی میں